قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
ستمبر 2016، قیمت 15₹
ماهنامه
اُردو دُنیَا
دهلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:18، شمارہ:9، ستمبر 2016

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

اردو کی خوب صورتی اس کے رسم الخط میں ہے: مہندر پرتاپ چاند درخشاں تاجور 8

اردو کے شبد بہت کومل لگتے ہیں: سنگوک ہونگ حقانی القاسمی 11

زبان و تعلیم

خصوصی ضروریات والے بچے کی تعلیم میں ICT کا کردار نوشاد حسین 13

ادبی مباحث

مصور سبزواری کی شاعری میں امیجری عابد حسین حیدری 16

کرشن چندر کا تصورِ اتحاد عبدالرشید خان 18

اختر حسین رائے پوری ترقی پسند تنقید کے پیش رو مخمور صدری 21

بیسویں صدی میں صنعتی ارتقا اور سماجی و خاندانی نظامِ حیات غلام صمدانی 25

منٹو کے افسانوں میں کشمیریت خورشید احمد 29

ولی الحق انصاری کی غزل میں تلمیحات ریحان حسن 32

بلراج کومل اور رسالہ 'شاہراہ' نوشاد منظر 36

عدم گونڈوی: باغیانہ مزاج کا شاعر سنتوش کمار 40

ہم نے جنھیں بھلا دیا

نواب محبت خاں محبت سلیم عنایتی 42

سلسلۂ صحافت

قاضی عدیل عباسی کی صحافت محمد وصی اللہ حسینی 44

موبائل اور ایس ایم ایس صحافت تنزیل اطہر 46

تہذیب و ثقافت

دکنی کلچر اور قومی یک جہتی سید فضل اللہ مکرم 48

کوکن کے اردو لوک گیت محمد دانش غنی 50

صحت

باہر کے کھانوں سے بچیے شمس الاسلام فاروقی 53

سائنس/ماحولیات

آلودگی کنٹرول میں خواتین کا کردار شمیم احمد صدیقی 55

فلم

رشی کیش مکھرجی انیس امروہوی 58

ہندوستانی سنیما اور اردو ناول احمد خان 62

کوئز

ادبی کوئز محمد عرفان 66

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 68

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 80

ہماری بات

ہندوستانی تہذیب کا حسن تکثیریت اور تنوع میں ہے۔ ہندوستان ایک کثیر تہذیبی لسانی ملک ہے۔ ہندوستان کی خوبی یہ ہے کہ یہ ملک کبھی بھی یک لسانی نہیں رہا۔ یہاں ملک کے طول وعرض میں مختلف بولیاں اور زبانیں رائج ہیں۔ ان میں سے بہت سی زبانوں کا اپنا علمی و ادبی سرمایہ بھی ہے۔ یہ تمام زبانیں ہندوستان کی نوع بہ نوع تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ رسم الخط کے اختلاف کے باوجود ان تمام زبانوں میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے ہندوستانی روح۔ لسانی سطح پر یہ تنوع ایک ایسی شناخت ہے جس کی وجہ سے پوری دنیا میں ہندوستان کو اہمیت حاصل ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اسی خوب صورت تنوع کو لایعنی تنازعے کی بنیاد بنا دیا ہے۔ زبانوں کے مابین اختلاف کا مطلب قطعی یہ نہیں ہوتا کہ یہ زبانیں ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ زبانیں تو صرف ذریعہ اظہار ہوتی ہیں اور اظہار میں اختلاف کو جنگ وجدل کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس کو شاعری کی زبان میں یوں سمجھا جاسکتا ہے:

گلہائے رنگارنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اِس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

ہندوستان میں زبانوں کے مابین جو اختلاف ہے وہ زینت چمن کی نوعیت کا ہی ہے۔ ہندوستان کی تمام زبانوں کی لفظیات پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان زبانوں میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوع لسانیات کا ہے اور لسانیات کے ماہرین ہی ہندوستانی زبانوں کے مابین مشترکات کی صحیح طور پر نشان دہی کر سکتے ہیں۔ تاہم اتنی بات تو کہی ہی جاسکتی ہے کہ مراٹھی ہو یا پنجابی، تلگو ہو یا کنڑ یا کوئی اور زبان، ماہرین لسانیات نے کچھ ایسے مشترک الفاظ تلاش کیے ہیں جو عوامی ربط وضبط کی وجہ سے ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہنچے ہیں اور متعلقہ علاقے کی زبان کا حصہ بھی بنے ہیں۔ اردو کے بارے میں بھی یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس زبان نے سنسکرت، ہندی اور دوسری زبانوں کے بہت سے الفاظ اپنے دامن میں سمو لیے ہیں جس کی وجہ سے اس زبان کا ذخیرۂ الفاظ بھی بڑھا ہے اور اس کے حسن میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اردو نے کبھی بھی اس معاملے میں کسی تامل یا تذبذب سے کام نہیں لیا بلکہ جس زبان میں اسے اچھے الفاظ ملے تو اسے اپنا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ اردو کی یہی کشادہ نظری ہے جس کی وجہ سے اس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جارہا ہے اور اس کی مقبولیت اور محبوبیت بھی بڑھ رہی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں اس انجذابی روش کا بھی عمل دخل کم نہیں ہے۔

گذشتہ دنوں قومی اردو کونسل کے زیراہتمام اردو، عربی وفارسی زبانوں کے فروغ کے امکانات کے حوالے سے ایک مذاکرہ منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں بھی زیادہ تر مقررین نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اردو ایک عالمی اور آفاقی زبان بن گئی ہے اور اس کی شیرینی اور مٹھاس سے پوری دنیا متاثر ہے۔ اس موقعے پر اردو کے فروغ کے حوالے سے نئی امکانی صورتوں پر بھی گفتگو کی گئی اور یہ واضح کیا گیا کہ وہی زبانیں فروغ پاتی ہیں جن کا علمی اور فکری سرمایہ عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور جس کے ذخیرۂ الفاظ میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جس کی رسائی عوام اور بازار تک زیادہ ہوتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو کا جو علمی سرمایہ ہے وہ قابل قدر ہے اور اس میں روز بروز اضافہ بھی ہورہا ہے اور یہ زبان الیکٹرانک میڈیا کی وساطت سے اب عوامی ذہن وشعور کا بھی حصہ بنتی جارہی ہے۔ پھر بھی فروغ اردو کی مزید امکانی صورتوں پر غور وفکر ضروری ہے تاکہ اردو زبان سے زیادہ سے زیادہ لوگ جڑ سکیں۔

ہندوستان میں بہت سی زبانوں کی اکادمیاں اور ادارے قائم ہیں جو اپنی اپنی سطح پر متعلقہ زبانوں کے فروغ کے لیے کوشاں بھی ہیں۔ قومی اردو کونسل بھی اردو زبان کے فروغ کے لیے فعال اور مستعد ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ بیشتر علاقائی زبانوں کے اداروں کے مقابلے میں زیادہ متحرک ہے اور یہ ہمارے لیے باعث فخر وانبساط ہے کہ قومی اردو کونسل کی حسنِ کارکردگی پر خود مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل عزت مآب پرکاش جاوڈیکر نے راجیہ سبھا میں مہر ثبت کردی ہے۔ یہ ایک ایسا اعتراف ہے جس سے محبانِ اردو کو یقیناً خوشی ہوگی کہ اردو کے تعلق سے حکومت ہند نہ صرف سنجیدہ ہے بلکہ اس کے فروغ کے لیے قائم کونسل کی کارکردگی کو تحسین وستائش کی نظر سے بھی دیکھ رہی ہے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

خطوط

اگست 2016 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ معصوم شرقی کا احمد سعید ملیح آبادی سے لیا گیا انٹرویو ان کی حق گوئی، بے باکی اور حالات سے سمجھوتہ نہ کرنے کی ایک اچھی مثال ہے۔ یہی ایک اچھے صحافی کا اصولِ زندگی ہونا چاہیے۔ آج سے سو سال قبل لاہور میں صحافت کا پیشہ اختیار کرتے وقت پنڈت میلارام وفا نے کہا تھا کہ ''ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھ کر ضمیر کی آواز کے خلاف عمل کرنا بردہ فروشی جیسے ذلیل پیشے سے بھی زیادہ مذموم ہے'' اسی مفہوم کو احمد سعید نے انٹرویو کے آخری سوال کے جواب میں کہا ہے ''نئی نسل کے صحافیوں سے بس اتنا ہی کہنا ہے کہ اپنے ضمیر کے خلاف کبھی قلم نہ اٹھانا۔ قلم تمھارے ہاتھ میں حق وصداقت کی امانت ہے اور تمھارے اپنے نفس کی عزت، دیانت دارانہ صحافت سے مشروط ہے۔''

سلیم محی الدین کا مضمون 'اردو کی ابتدائی نشو ونما میں ترکوں کا حصہ' اردو کی ادبی تاریخ پہ مبنی ہے۔ یہ ایک حقیقت بھی ہے اور قانونِ قدرت بھی کہ جب دو قومیں اور تہذیبیں آپس میں ملتی ہیں تو ایک مخلوط زبان اور ایک مخلوط النسل وجود میں آتی ہے۔

شبنم حمید نے اپنے مضمون میں ادبی صحافت کی تاریخ کو دہرانے کی اچھی کوشش کی ہے۔ اقبال النسانے اپنے مضمون 'کنڑا اور اردو کا ادبی رشتہ' میں اِس بات کا انکشاف کیا ہے کہ 1940 سے قبل کنڑا ادب کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ممتاز افسانہ نگار ممتاز شیریں نے سری نواس کے دو افسانوں 'وہ عورت' اور 'دہی والی' کا اردو ترجمہ پیش کرنے کی پہل کی ہے۔ اسی طرح 1950 میں راگھویندر راؤ جذب عالمپوری نے اردو زبان و ادب کی تاریخ 'اردو ساہتیہ چرتر' کے نام سے کنڑا میں ترجمہ کیا ہے۔ تب سے آج تک یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔

یوسف رامپوری عربی زبان پہ عبور رکھتے ہیں۔ انھوں نے 'زہیر بن ابی سلمٰی کو دورِ جاہلی کا روشن خیال قصیدہ گو شاعر' درج کیا ہے۔ ساتھ ہی اپنے مضمون کی شروعات ان الفاظ میں کی ہے ''دورِ جاہلی میں عربی شاعری

کو جو عروج و کمال حاصل ہوا، وہ کسی اور دور میں نہیں ہوسکا۔ بعد کے ادوار کے شعرا تو مختلف النوع وسائل کی دستیابی کے باوجود اس دور کے شعرا سے آگے نہ بڑھ سکے۔'' مزید ان کے قصائد کی خوبیوں کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ ''عوام و خواص سب پر اپنی سحرانگیزی کا سکہ کچھ یوں جمایا کہ انھیں روئے زمین پر سب سے مقدس مقام خانہ کعبہ میں آویزاں ہونے کا شرف حاصل ہوگیا۔'' جو لوگ علم و ادب میں اتنے ترقی یافتہ تھے تو انھیں دورِ جاہلیت سے تعبیر کرنا کیا ہماری جاہلیت نہیں؟

اس شمارے کا اہم مضمون عمیر منظر کا 'ماہنامہ معارف کے سو برس' ہے۔ سو سال کے شماروں کو کھنگالنا کوئی معمولی بات نہیں۔ نئے تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے 'معارف' ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ایک بات حیران کردینے والی ہے کہ اپنی سو سالہ زندگی میں اس کے صرف تین خصوصی شمارے شائع ہوئے: (1) سید سلیمان ندوی (2) مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (3) مولانا شبلی۔

اس شمارے کا سب سے اچھا اور تحقیقی مضمون ڈاکٹر شمس بدایونی کا 'دیوانِ غالب کی پہلی اشاعت' ہے۔ تحقیقی میدان میں وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے غالب کی ابتدائی بیاض کا ذکر کیا ہے جو 11 جون 1816 تک تیار ہوچکی تھی۔ کالی داس گپتا رضا نے تاریخی ترتیب سے جو 'دیوانِ غالب کامل' مرتب کیا اُس میں 2975 اشعار درج ہیں جو غالب نے 1808 سے 1833 تک کہے تھے۔ لیکن دیوان متداول صرف 1093 اشعار پر مشتمل ہے۔

باقی حضرات کی طرح رضا صاحب نے بھی لکھا ہے کہ 1833 تک دیوان متداول کے اشعار 1070 تھے بعد میں 25 اشعار کا اضافہ ہوا جو 27 شعروں سے لیے گئے تھے، یعنی تعداد اشعار 1095 ہوئی۔

اِس شمارے کے باقی عنوانات صحت، کوئز، کتابوں کی دنیا، عالمی اردو نامہ نہایت معلوماتی ہیں۔

❖ **ڈاکٹر ٹی آر رینا:** F-237، سنگھ نگر، باڑی کالونی، جموں

اگست کا 'اردو دنیا' ملا۔ یہ مخملیں شمارہ علم و ادب کی ایک نئی دنیا میں لے گیا۔ اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر میں نے تقریباً سارا شمارہ پڑھ ڈالا۔ 'خبرنامہ' کالم کے صفحہ 91 پر فروغ انسانی وسائل کے نئے وزیر پرکاش جاوڈیکر کی دو مختلف تقریبات میں کی گئی تقاریر سے اندازہ ہوا کہ جاوڈیکر صاحب سلجھے ہوئے ذہن کے انسان ہیں اور ان تعلیمی قدروں کو فروغ دینا ان کا مقصد ہے جنھیں اپنا کر اساتذہ تعلیمی نظام کو واقعی بہتر بنا سکتے ہیں۔ جاوڈیکر صاحب نے پال دیوگاؤں سے متعلق اپنا جو تجربہ بیان کیا کہ کس طرح انھوں نے اساتذہ کو اپنے اعتماد میں لے کر انھیں فعّال و منظم کیا اور سات ماہ کے اندر طلبا کی کامیابی کا تناسب 28 سے 82 فی صد تک جا پہنچا۔ دوسری رپورٹ میں جاوڈیکر صاحب کا یہ قول اچھا لگا کہ تعلیم انسان کی تخلیقِ نو کے لیے لازمی ہے۔

جاوڈیکر صاحب کی ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مثبت ذہن کے آدمی ہیں۔ اگر کونسل ان کی رہبری میں ان کے اسی جذبے اور بصیرت سے فروغِ اردو کی اسکیم میں کچھ توانائی پیدا کر پائے تو اردو زبان کے لیے یہ اُن کی بڑی دین ہوگی۔ منصوبہ بند ترقی کا ہدف صحیح لیڈرشپ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے اداریہ 'ہماری بات' کے تیسرے بند میں ہندوستان میں اردو کی دستوری اور قانونی حیثیت کی صحیح پوزیشن کو واضح کرنے

خطوط

کے لیے ایک پالیسی اقدام کی جانب اشارہ کیا ہے۔ جاوڈیکر صاحب اس میں سنجیدہ دلچسپی لیں تو کونسل فروغ اردو کی ٹھوس کوششوں کو آگے بڑھا پائے گی۔ لیکن اس کے لیے بڑا جمگھٹا لگانے کی ضرورت بھی نہیں۔ کم تعداد میں سنجیدہ لوگ اکٹھا کیے جائیں تو ایک لائحہ عمل مرتب کرسکتے ہیں۔ بھیڑ لگانا کام کرنے کی ضمانت نہیں۔ بلکہ اکثر حالات میں بات سیاسی رخ اختیار کرلیتی ہے۔ عبیدالرحمٰن نے اپنے مضمون 'نوآبادیاتی ہندوستان: فکریات و تعلیمی تجربہ' میں جو بات لکھی ہے وہ بھی درپردہ اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: ''سیاسی بالادستی اور اقتصادی غلبے کی اساس پر تعمیر ہونے والی تہذیبی و معاشرتی فکریات و حرکیات تادیر قائم نہیں رہ سکتی۔ باطنی طور پر ایسی قوتیں پروان چڑھتی رہتی ہیں جو کسی نہ کسی زاویے سے اس فکریات و حرکیات سے متصادم ہوتی ہیں''۔ چونکہ اس شمارے کے مذکورہ رشحات یا خبریں ایک الگ فکری رَو میں دکھائی دیتی ہیں اس لیے انہیں یکسو ہوجانا چاہیے۔ اس زاویے سے یہ شمارہ الگ اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔ روزانہ اردو صحافت کے آخری مغل احمد سعید ملیح آبادی صاحب سے لیا گیا انٹرویو خوب ہے۔

دیگر مشمولات میں فوزیہ خانم کا مضمون 'اردو کی نظمیہ شاعری میں حب الوطنی اور آزادی' رسمی نوعیت کا عمدہ مضمون ہے۔ لیکن سکّہ بند موضوعات میں بھی توسیع کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ شمس بدایونی کا مقالہ 'دیوانِ غالب کی پہلی اشاعت' سلیم محی الدین، شاکر علی صدیقی کا 'میر کا تنقیدی شعور' اچھے تحقیقی مضامین ہیں جو تجدیدِ علم کرتے نظر آرہے ہیں۔ اِن کے برعکس اکرم وارث کا مضمون 'مابعد نوآبادیاتی مطالعہ' مصنف کے نئے تنقیدی سروکار میں دلچسپی کا اچھا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ شکیل بدایونی پر انیس امروہوی اور مشیر احمد کے مضامین دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ صدر عالم گوہر نے شکیل بدایونی سے متعلق کچھ اہم باتیں قلمبند کی ہیں۔ گوہر صاحب نے سنگیت اور شکیل صاحب کے گیتوں کی سنگت کے حوالے سے کئی یادوں کو سمیٹا ہے۔ لیکن 'چودھویں کا چاند' کے گیت 'چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو' کا ثانی مصرع انھوں نے یوں لکھا ہے: 'جو کچھ بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہو' جبکہ یہ مصرع یوں گایا گیا ہے 'جو بھی ہو تم خدا کی قسم لاجواب ہو'۔ لیکن گوہر صاحب نے راجندر کرشن کی صحیح خوبیوں کو شناخت نہیں کیا۔ وہ خودساز (ہارمونیم) نواز بھی تھے۔ اور اُن کا دائرہ کار زیادہ وسیع تھا۔

شبنم حمید نے اپنے مضمون میں اردو کی ادبی صحافت کا ایک محدود جائزہ پیش کیا ہے۔ عمیر منظر نے ماہنامہ 'معارف' کی اشاعت کی ایک صدی کا ہمہ گیر جائزہ لیا ہے۔ محمد ساجد حسین کا 'معاصر اردو تھیٹر' عنوان کے تحت لکھا گیا مقالہ اردو تھیٹر کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرتا ہے۔

اَن پورنا نندورما کے مضمون کا ترجمہ بانو سرتاج نے 'اکبری لوٹا' عنوان سے پیش کیا ہے جو بہت اچھا ہے۔ اس میں نورجہاں اور جہانگیر کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جہانگیر نے نورجہاں سے پوچھا کہ کچھ دیر پہلے تو تمھارے پاس دو کبوتر تھے، اب ایک ہی ہے۔ ایک کبوتر اُڑا کیسے دیا؟۔ نورجہاں نے معصومیت سے دوسرا کبوتر اُڑا کر بتایا 'ایسے' اس واقعہ کو میں نے اپنے ایک شعر میں منظوم کیا تھا جو یوں ہے:

بتایا اُس نے کہ پہلا پرندہ ایسے اڑا
اڑایا ہاتھ سے تھا دوسرا کبوتر جب

غرض اس شمارے کے سبھی مشمولات معیاری اور دلچسپ ہیں اور مطالعے کی اشتہا کو بڑھاتے ہیں۔

❖ **ف س اعجاز**: 25-B، زکریا اسٹریٹ، کولکاتہ

اگست شمارے کے تمام مضامین انتہائی اہم اور قابلِ تعریف ہیں۔ چاہے وہ ادارے کی طرف سے لکھا گیا مضمون 'نگہ بلند... پرکاش جاوڈیکر' کے تعلق سے ہو یا پھر 'گوشۂ شکیل' کے نام سے مخصوص مضامین۔ لیکن ہم یہاں مبارکباد دینا چاہیں گے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب کو جن کا قلم ہر شمارے میں قاری کو کسی نہ کسی بات کی طرف ضرور متوجہ کرتا ہے۔ اس بار انھوں نے 'اپنی بات' کے ذریعے اردو دنیا والوں کو فکری صلاحیتوں کی ترغیب اور اس پر مضمون نگاری کی دعوت عام دی ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے کیوں کہ وقت کا تقاضا ہے کہ وہ تمام خیالات وافکار جو عموماً شخصیات یا ایسے مضامین پر ہوتے جواب فرسودہ ہوچکے ہیں اس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور ایسے کئی مضامین کی نشان دہی کی جاسکتی ہے جو ترمیم وحذف واضافہ کے ساتھ اپنا بنالیا جاتا ہے ورنہ اس کی حیثیت کاپی پیسٹ سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ لیکن جب خیالات نئے ہوں گے اور اس کے اندر فکرانگیزی ہوگی تو یہ قاری کی دلچسپی کو دوگنا کردے گی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب لکھتے ہیں ''اردو قارئین کے روبرو ایسی تحریریں پیش کی جائیں جو فکرانگیز اور مفید ہوں۔ لایعنی مباحث میں قارئین کو نہ الجھایا جائے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقیات، سماجیات اور جدید دور کے دیگر موضوعات کے حوالے سے مضامین کی شمولیت ہو۔ اشخاص کے بجائے افکار پر زیادہ توجہ مرکوز کی جائے۔'' اب بات کرلی جائے کچھ ان مضامین کی جو اس شمارے کی زینت ہیں معصوم شرقی صاحب کا احمد سعید صاحب سے لیا گیا انٹرویو 'صحافت... 'خوب ہے لیکن پیڈ نیوز کے متعلق احمد سعید صاحب کی یہ بات ''اردو پریس میں 'پیڈ نیوز' کا چلن زیادہ نہیں ہے'' سے ہمیں اختلاف ہے کیوں کہ اب ہمارے اردو اخبارات معاش کی فکر میں زیادہ سے زیادہ 'زرد' صحافت کی طرف مائل ہورہے ہیں اور اردو اخبارات بازی لے جانے کے چکر میں صحافت کے نام پر بٹہ لگا رہے ہیں۔ شمس بدایونی صاحب کا مضمون 'دیوان غالب کی پہلی اشاعت' غالبیات کی تفہیم میں مددگار اور مفید اضافہ ہے انھوں نے مضمون کو استدلالی روپ دے کر قاری کے ذہنی افکار کو شک وتردد سے بالا کردیا ہے۔ سلیم محی الدین کا مضمون 'اردو کی ابتدائی نشو ونما میں ترکوں کا حصہ' پڑھ کر اچھا لگا۔ اردو دنیا نے شکیل کے یوم پیدائش کی مناسبت سے اس شمارے میں گوشہ شائع کرکے انھیں اچھا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ عمیر منظر صاحب نے ماہنامہ 'معارف' کی بھرپور اہمیت و تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب ہیں۔ محمد نہال افروز کا مضمون 'ہندی فکشن میں مسلم...' قابل صد ستائش ہے اس طرح کے مضامین کم ہی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ شاہ نواز فیاض کا مضمون 'سیدہ جعفر کی تنقید نگاری' سے ہمیں ان کے بارے میں مفید معلومات ہوئیں کہ کس طرح سیدہ جعفر نے ادب کی ہر صنف میں اپنی خدمات انجام دیں۔

❖ **اسعداللہ**: ماس میڈیا، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی

اگست ماہ کے شمارے میں تمام مشمولات، بالخصوص شکیل بدایونی کے گوشے پر مبنی مضامین معیاری ہیں۔ ان کی نغمہ نگاری پر مبنی مشیر احمد صاحب کے مقالے میں پرانی ہندی فلم 'صاحب، بی بی اور غلام' کے نام میں 'بی بی' کی بجائے 'بیوی' لفظ تحریر کرنا غلطی ہے اور اسی کا اعادہ اس سے قبل جناب صدر عالم گوہر کے بلند پایہ مضمون میں بھی صفحہ 39 پر ہوا ہے۔ اردو کی نظمیہ شاعری میں حب الوطنی اور آزادی پر مبنی فوزیہ خانم کے جاندار مضمون میں موضوع کے ساتھ کاملاً انصاف کیا گیا ہے۔

انیس صاحب نے اپنے شاندار مقالے میں 'دنیا بھر میں سب سے زیادہ مقبول' (ص 37، دوئم کالم) جس جاوداں نغمے 'جب پیار کیا تو ڈرنا کیا...(آگے کے لفظ۔'' پیار کیا، کوئی چوری نہیں کی...'') کی بابت مفید معلومات فراہم کی ہے، وہ ان جیسے عالم ہی کا حصہ ممکن ہوسکتا تھا۔ اس نغمے کا محرک مشرقی اترپردیش کے قومی (لوک) گیت کے اس بول کو گردانا گیا ہے۔ ''پریم کیا، کیا چوری کری ہے؟''

جناب ایم رفیق کے مضمون 'بڑے غلام علی خاں' کے بموجب اسی فلم کے ہدایت کار کے۔ آصف صاحب

سے اس وقت کے سب سے بڑے کلاسیکل گلوکار استاد بڑے غلام علی خاں نے نغمہ گانے کے لیے ان کی از حد منتوں کے بعد 25 ہزار روپے لیے تھے۔ انھوں نے سرعت سے یہ کہا تھا کہ ''میں تو اس سے بھی بڑی رقم سوچ کر آیا تھا۔'' یہ کہہ کر آدھی رقم پیشگی دے ڈالی تھی۔ چند حوالوں میں اس خاکسار نے 40 ہزار روپے کی مانگ کرنے کی بات بھی پڑھی ہوئی ہے۔ اب یہ عین ممکن ہے کہ استادِ گلوکاری نے دو گیتوں کا اتنا معاوضہ لیا ہو، کیونکہ فلم میں انھوں نے یہ دو گیت گائے تھے:۔ 1 ''پریم جوگن بن کے...'' 2 ''شبھ دن آیو راج دلارا...''۔ اس وقت موسیقار نوشاد بھی وہاں موجود تھے۔ علاوہ ازیں مستزاد دوئم بات متنازع فیہ یہ ہے کہ اسی دور میں ایک گلوکار کو زیادہ سے زیادہ ایک نغمے کے فقط 5-6 سو روپے ہی ملا کرتے تھے، جبکہ ایم رفیق صاحب نے اپنے شاندار مقالے میں ''زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار روپئے دیے جاتے تھے'' (ص 59) کی بات درج کی ہے۔ اب حقیقت جاننے کے متلاشی قارئین کی نظر میں دونوں ہی باتیں درخورِ تحقیق ٹھہرتی ہیں۔

❖ **کرشن بھاوک** : گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، پٹیالہ پنجاب

✍ جولائی کے شمارے کے اداریے میں آپ نے بدلتے ہوئے لسانی وسماجی تناظر میں اردو کے رسائل کی ذمے داریوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پچھلے شمارے میں بھی آپ نے اردو رسائل کے مشمولات میں تبدیلی کی ضرورت پر زور دیا تھا اور ان میں اردو دنیا کی طرح ادب کے ساتھ ساتھ سماجیات کو بھی شامل کرنے کا بیش قیمت مشورہ دیا ہے۔ آپ نے صحیح فرمایا ہے کہ ادبی رسائل کو صرف ادب نہیں پیش کرنا چاہیے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سماج اور ثقافت میں رونما ہونے والے واقعات اور فینامینن کی بھی ترجمانی کرنی چاہیے کیونکہ ادب زندگی اور سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور سماج سے کٹ کر ادب زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو رسائل کے لیے ایک غیر تحریری اصول یہ مرتب کرلیا گیا ہے کہ اس میں صرف ادب ہونا چاہیے اور ادب کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ سماج اور سیاست میں رونما ہونے والی انقلابی تبدیلیوں اور اہم واقعات کو ادبی رسائل میں جگہ دینا گناہ تصور کیا جاتا ہے جو رسائل ادب کے ساتھ تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی مسائل پر مواد پیش کرتے ہیں انھیں نیم ادبی کہہ کر چھوٹا بنادیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے اردو کا ادیب وشاعر معاشرے اور ملک میں ہونے والے واقعات سے خود کو الگ تھلگ رکھتا ہے۔ کچھ ہی رسائل جیسے نیا ورق (ساجد رشید) اور ذہن جدید وغیرہ سماجی اور سیاسی مسائل پر کھل کر بات کرتے تھے۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادبی رسائل ادب کے ساتھ فیشن فلم اور سیاست پر بھی مواد پیش کرتے ہیں۔ اردو میں یہ تصور محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو کے ادبی رسائل کو صرف ادیب وشاعر ہی پڑھتے ہیں۔ اس پر شکایت ہے کہ اردو والے اردو رسالے خرید کر نہیں پڑھتے۔ بدلتے ہوئے وقت کا تقاضا ہے کہ اردو رسائل کو سماجی اور سیاسی سروکار سے جوڑا جائے تاکہ یہ صحیح معنوں میں ادب اور سماج کا آئینہ بن سکیں۔ اردو دنیا نے اس سمت قدم بڑھایا ہے اور اس کا مثبت نتیجہ بھی سامنے آیا ہے کہ لاکھوں اردو قارئین اردو دنیا کا مطالعہ کرتے ہیں۔

❖ **سہیل ارشد**: مدیر سہ جاپانی ادب، رانی گنج، مغربی بنگال

✍ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ ملا۔ حسب عادت ڈاک چھانٹ کر آپ کے پرچے کے ورق ورق پر سرسری نظر ڈالی۔ شمارہ دیدہ زیب ہے۔ اپنی خاص دلچسپی کے پیش نظر ڈاکٹر سلیم محی الدین کے وقیع مقالے اردو کی ابتدائی نشوونما میں ترکوں کا حصہ پڑھا لیکن حق ادا نہ ہوا کہ بھاگا دوڑی کے بجائے فرصت میں اطمینان سے پڑھنے کے لیے اٹھا رکھا۔ میں رسالے کی وصولی کی رسید لکھنے بیٹھا تھا۔ اس کی وجہ وہی طبیعت اور اس کے علاوہ نجی اور مجلسی مصروفیات میں مطالعے کا وقت نکالنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس بار تو پورا رسالہ میرے پسندیدہ موضوعات سے بھرپور ہے۔ میری خاص دلچسپی کے لیے معصوم شرقی کا جناب احمد سعید ملیح آبادی سے انٹرویو موجود ہے کہ کولکاتا دو بار گیا تو ان سے ملاقات رہی۔ اردو صحافت کا مزاج... واہ!! گوشہ شکیل بدایونی! دل چاہتا تھا سب سے پہلے وہی پڑھوں۔ اس میں برطانوی اردو قلمکار خدیجہ زبیر کے والد کی شخصیت پر مسرور حیدری کا مضمون پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ یہ پرچہ خدیجہ بہن کو بھیج دوں گا۔ رسالے کی ترتیب ورق ورق گل وگلشن کا رنگ لیے ہے۔ میں کیسے داد دیے بغیر رہ سکتا تھا۔

❖ **مقصود شیخ**: برمنگھم

✍ 'اردو دنیا' جولائی کا شمارہ بروقت ہمدست ہوا۔ رسالہ ہر ماہ وقت پر یعنی پہلی تاریخ کو مل جاتا ہے۔ بہت خوشی ہوتی ہے ہماری بات میں مدیر صاحب نے سچ کہا ہے کہ ہمیں ادبی اقدار ونظریات پر بھی از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جو باتیں ادب میں پیش کی گئی ہیں اس کا اعادہ نہ ہو بلکہ ان کو پڑھ کر نئی ادبی قدریں تلاش کرنا ضروری ہے۔ مزید انھوں نے کہا کہ زبان کی وسعت وفروغ کے لیے اور زبان کی سطح پر اردو میں زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے یقیناً زبان کی سطح پر کام کرنے سے ہی زبان کو فروغ ہوگا۔ نذیر فتح پوری کا انٹرویو ادبی معلومات سے پُر ہے۔ ریاست کیرلہ میں اردو نصاب کا خاکہ اسکولوں کے حوالے سے نصاب پر کم بلکہ کیرلہ میں اردو کی حالت وموقف پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ خواجہ عبدالمنتقم نے غالب کے کلام میں حقوق انسانی کی نشاندہی اشعار کے حوالے سے کی جو اردو ادب میں نئی بات ہے۔ شاید کسی نے اب تک نہیں کی ہے۔ انسانی حقوق کی پاسداری اور ترجمانی غالب نے بھی کی ہے۔ بہت خوب صورت ہے۔ اس شمارے کے باقی مشمولات ادبی بصیرت اور ادبی معلومات سے مزین ہیں۔

❖ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: سابق پرنسپل، گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد، ریاست تلنگانہ

✍ 'اردو دنیا' جولائی 2016 کا شمارہ موصول ہوا۔ محترم سید یحییٰ نشیط کی تحریر بعنوان 'دوارکا پرشاد افق کی تقدیسی شاعری' قابل ستائش ہے۔ افق کی اردو زبان سے دوستی گنگا جمنی تہذیب کی میراث ہے۔ اسے پڑھ کر فرحت وشادمانی محسوس ہوئی۔ رسالے کے سارے مضامین عمدہ و دیدہ زیب ہیں۔ 'اردو شاعری میں گوتم بدھ' محمد یحییٰ جمیل کا مقالہ لائق صد ستائش ہے۔

❖ **سرور سعید**: لکچرر، رحمانیہ جونیئر کالج، اچل پورسٹی، امراؤتی

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' ماہ جون 2016 کا شمارہ اہم مضامین سے مرصع ہے۔ جریدہ 'اردو دنیا' میں سماجی علوم پر بے حد فکر انگیز مضامین شائع ہو رہے ہیں اور اسی وجہ سے اردو میں اس کمی کو پورا کررہا ہے۔ تازہ شمارے میں دیگر مضامین کے علاوہ محترم اطہر رضا بلگرامی کا مضمون 'ہندوستان میں غربت و افلاس کا تصور' بہت پسند آیا۔ اس مضمون اور اس کے طرزِ نگارش نے اردو میں اقتصادیات کو ایک وقار بخشا ہے۔

❖ **اقبال مجید اللہ** : پلاٹ نمبر 69، یوسف کالونی، پربھنی

■

انٹرویو

اردو کی خوب صورتی اس کے رسم الخط میں ہے

مہندر پرتاپ چاند

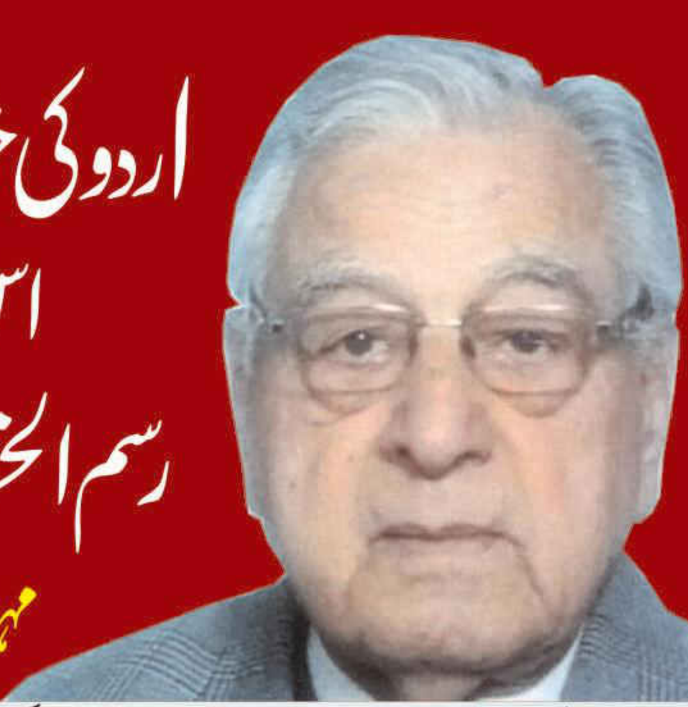

درخشاں تاجور

اردو زبان کسی ایک خاص فرقے یا طبقے کی زبان نہیں۔ اس کے زلف و گیسو سنوارنے میں ہر مذہب و ملّت کے لوگوں نے اپنی گراں قدر قربانیاں پیش کی ہیں۔ اگر اس زبان کے ناز بردار غیر مسلم شعرا و ادبا کی ایک فہرست مرتب کی جائے توکئی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی۔ اس زبان کے فروغ میں مسلمانوں کے دوش بدوش دوسرے مذاہب کے پیروکاروں نے حصہ لے کر اسے سیکولر سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اردو کے ایسے ہی غیر مسلم عاشقوں کی فہرست میں ایک نام جو گذشتہ نصف صدی سے آسمانِ ادب پر مہر درخشاں کی طرح روشن ہے مہندر پرتاپ چاندؔ کا ہے۔ وہ صاحب اسلوب نثر نگار بھی ہیں اور صاحب طرز شاعر بھی۔انہوں نے محقق و نقاد کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان بنائی ہے اور فن شاعری میں بھی اپنی صلاحیتوں کے غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں۔

چاند صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہ صرف اعلیٰ پائے کے شاعر اور ادیب ہیں بلکہ وہ بہترین انسان بھی ہیں۔محبت، عاجزی اور انکساری کے پیکر چاند صاحب کی یہ خوبیاں ان کے کلام میں جابہ جا اجاگر بھی ہوئی ہیں۔دنیائے شعرو ادب کی اس مایۂ ناز شخصیت سے اردو دنیا کے قارئین کو متعارف کرانے کے لیے میں نے ان سے کچھ باتیں کی ہیں جو پیش خدمت ہیں۔

درخشاں تاجور: چاند صاحب آپ شعروشاعری بھی کرتے ہیں۔آپ نے ادبی وتنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ آپ کے متعدد شعری مجموعے منظرعام پر آچکے ہیں۔ آپ کےتنقیدی وتحقیقی مضامین پر مشتمل کتابیں بھی شائع ہوچکی ہیں۔آپ نے سفر نامے بھی تحریر کیے۔ لائبریری سائنس کی کتاب بھی آپ نے لکھی۔آپ کی تیار کردہ کتاب 1986 میں شامل نصاب بھی ہوئی اور ہریانہ کے ساتویں جماعت کے طالب علموں کو یہ پڑھائی جاتی ہے۔آپ نے اپنی پوری زندگی شعروادب کے لیے وقف کردی ہے۔میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ نے اپنی قلمی زندگی کی ابتدا کب اور کیسے کی؟

مہندر پرتاب چاند: 1948 میں جب میری عمر تیرہ سال کی تھی اور میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اس وقت میرے ایک دوست اور ہم جماعت مہیش کے والد کا کسی دوسرے مقام پر تبادلہ ہوگیا۔دوست کے اچانک بچھڑ جانے پر میں نے دواشعار کہے تھے۔یہی میری پہلی تخلیق تھی جو اس وقت کے اردو کے مقبول اخبار ہند سماچار (جالندھر)میں شائع ہوئی تھی اس اخبار کے ایڈیٹر نے میری اس تخلیق کو نہ صرف نمایاں طور پر شائع کیا بلکہ اس اخبار کے سنڈے ایڈیشن کو چھ مہینے تک ڈاک سے میرے اسکول کے پتے پر بھیج کر میری حوصلہ افزائی بھی کی۔

د ت: چاند صاحب آپ کئی زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں۔میں آپ سے یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کی پسندیدہ زبان کون سی ہے؟

مہندر پرتاب چاند: یوں تو میں ہندی، اردو، انگریزی، پنجابی، فارسی اور سرائیکی سبھی زبانیں جانتا ہوں اوران زبانوں میں لکھتا بھی ہوں لیکن مجھے اردو زبان کی شیرینی اور حلاوت نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس زبان سے والہانہ عشق کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس زبان سے متعلق غلط فہمیوں کے بادل چھٹیں اور زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھیں، سمجھیں اور محظوظ ہوں۔ میں جب کوروکشیتر یونیورسٹی میں لائبریرین تھا اور لائبریری سائنس کے طالب علموں کو پڑھاتا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس یونیورسٹی میں اردو و فارسی کی درس وتدریس کا کوئی نظم نہیں ہے۔میں نے اس سلسلے میں بڑی تگ ودو کی اور اس یونیورسٹی میں اردو اور فارسی کا شعبہ قائم کرایا، جہاں میں نے 26 سال تک درس وتدریس کے فرائض انجام دیے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ میری زندگی کے حسین دن تھے۔مجھے اردو پڑھا کر بڑی طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔

د ت: چاند صاحب آپ شعروشاعری بھی کرتے ہیں میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ کے اشعار میں جگہ جگہ غمِ حیات کی ترجمانی ہوئی ہے۔بعض اشعار میں آپ نے دل کے درد کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔یہ کس چیز کا ردعمل ہے؟

مہندر پرتاب چاند: اگر دیکھا جائے تو زندگی کے ساتھ غم بھی ہماری زندگی کا حصہ رہے ہیں۔میری زندگی میں بھی خوشیوں کے ساتھ ساتھ غم بھی آئے۔والدین کا سایہ اٹھا۔ڈھلتی عمر میں بیوی داغ مفارقت دے گئی اور میرا سب سے بڑا غم تھا میرے بڑے بیٹے وویک کی 33 برس کی عمر میں ایکسیڈنٹ سے ہوئی ناگہانی موت، جس نے میری روح تک کو زخمی کردیا۔ یہ جاں کاہ حادثہ اس

وقت ہوا جب میں اپنے چھوٹے بیٹے منوج کے پاس جو امریکہ میں ایک معروف کمپنی کا وائس پریسیڈنٹ ہے، نیو جرسی گیا ہوا تھا۔ مجھے یہ قلق ہمیشہ پریشان کرتا رہا کہ میں آخری وقت میں اپنے چہیتے بیٹے کا دیدار بھی نہ کرسکا۔ میرے اکثر اشعار میں میرے اس غم کی ترجمانی ہوئی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس کرب کو لفظوں میں کس طور بیاں کیجیے
اک طرفہ قیامت ہے اپنوں کا جدا ہونا

کن خطاؤں کی سزا تھی یہ وہی جانے مگر
میں سکونِ دل کی خاطر عمر بھر روتا رہا
دے گیا وہ زندگی بھر کی جدائی کا جو داغ
چاندؔ میں اشکوں کی شبنم سے اسے دھوتا رہا

برسوں کی محنت سے ہم نے رنگ محل تعمیر کیا
وقت کے ظالم ہاتھوں نے پل بھر میں اسے مسمار کیا
روح پہ چھالے، ذہن تپیدہ جسم پہ زخموں کی پوشاک
تم کیا جانو؟ آگ کا دریا ہم نے کیسے پار کیا

لیکن وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے میں نے اس حادثے کو مشیت ایزدی سمجھ کر صبر کیا۔ اپنے غم کو حوصلے کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے خدا کی بخشی ہوئی ہزارہا نعمتوں کا شکر بھی ادا کیا اور یہ بھی کہا کہ:

جو چھین لیا تونے گلہ اس کا ہو کیوں کر
بخشا ہے جو تونے وہ کہیں اس سے سوا ہے

د ت: چاند صاحب آپ نے تقسیم کا کرب بھی جھیلا ہے۔ آپ اس حادثے کے عینی شاہد رہے ہیں۔ اس حادثے نے آپ کو کتنا متاثر کیا ہے۔ کیا اس سے جڑی کچھ یادیں آپ ہمارے قارئین کو بتانا چاہیں گے؟

مہندر پرتاب چاند: میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کا قیام سیاسی لیڈروں کی ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ تھا جس کا خمیازہ دونوں ملکوں کے عوام نے بھگتا اور ابھی تک بھگت رہے ہیں۔ ملک کی تقسیم ہوئی تو میری عمر اس وقت بارہ سال کی تھی۔ ہم لوگ اپنی جائے پیدائش چھوڑ کر ضلع فیروز پور (پنجاب) کے زیرہ میں منتقل ہو گئے۔ دوست و احباب کا اچانک بچھڑ جانا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اسے میں نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ ہجرت کے سفر کے دوران میں نے انسانیت سوز واقعات دیکھے بھی اور پڑھے بھی۔ ایک ایسا ہی واقعہ میں نے اپنے اسکول میں آنے والے ایک رسالے میں پڑھا تھا جسے میں آج تک بھول نہ سکا۔ یہ واقعہ ثاقب زیروی صاحب نے لکھا تھا

سوانحی کوائف

نام و تخلص: مہندر پرتاپ چاند، **یوم ولادت:** یکم اگست 1935

تعلیم: ایم اے (اردو) ایم اے (لائبریری سائنس)

ملازمت: ریٹائرڈ یونیورسٹی لائبریرین و ٹیچر انچارج شعبۂ اردو و فارسی کوروکشیتر یونیورسٹی، کوروکشیتر (ہریانہ) اس دوران تین سال تک لائبریری سائنس کے طلباء اور 26 برس تک اردو کے طلباء کو تعلیم دی۔

تصانیف: (شعری مجموعے): حرف راز 1974، زخم آرزوؤں کے 1982 (دیوناگری رسم الخط میں)، حرف آشنا 1990، آزارِ غم عشق 2001، جاتے ہوئے لمحوں 2013، (تحقیقی تنقیدی وشخصی مضامین کے مجموعے): اجالوں کے سفیر 2010، نشاط قلم 2012 (تحقیقی پروجیکٹ): اردو زبان وادب کے فروغ میں ہریانہ کا حصہ (سفرنامے): مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا (ہندی و اردو میں) A BOND OF LOVE (MY PASSAGE TO PAKISTAN)
(درسی کتب): اردو کی ساتویں کتاب (صوبہ ہریانہ کے اسکولوں میں، ساتویں جماعت کے طلباء کے نصاب میں 1986 سے شامل، لائبریری سائنس کی کتاب (انگریزی میں) COLON CLASSIFICATION - ITS STRUCTURE AND WORKIG (A PROGRAMMED TEXT)1978, 1986
لائبریری سائنس کی کتاب (ہندی میں)
द्विबिन्दु वर्गीकरण इसकी संरचना तथा कार्यान्वयन एक परियोजित पाठ्य २००४

انعام واعزاز: سید مظفر حسین برنی ایوارڈ (ہریانہ اردو اکادمی) 1995، نسیم لیہ ایوارڈ (انٹرنیشنل بزم علم وفن لیہ پاکستان) 2004، 2010، 'مہتاب سخن' خطاب (نورنگ ادبی ادارہ لدھیانہ پنجاب) 2006، خواجہ الطاف حسین حالی ایوارڈ (ہریانہ وقف بورڈ) 2006، بھارت ایکسی لینس ایوارڈ (فرینڈشپ فورم آف انڈیا، نئی دہلی) 2009، ابر سیمابی ایوارڈ (ساہتیہ سبھا رجسٹرڈ کیتھل) 2010، اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ (لکھنؤ) 2014، 'اختر اورینوی ایوارڈ' بہار اردو اکادمی (پٹنہ) 2014، 'حافظ محمود شیرانی ایوارڈ' بھاشا وبھاگ پنجاب 2014

مستقل پتہ: 1420، سیکٹر-9 اربن اسٹیٹ انبالہ شہر 134004 (ہریانہ)

کہ وہ جب اپنے ایک دوست سردار گورمکھ سنگھ جی کے یہاں زیرہ (ضلع فیروز پور۔پنجاب) میں بلوائیوں کے ڈر سے چھپے ہوئے تھے تو بلوائیوں نے ان کے گھر پر دھاوا بولا۔ انھوں نے اپنے دوست ثاقب زیروی کو اپنی بیمار بیوی کے ساتھ بستر میں سلا کر اوپر سے کمبل ڈھانک دیا جو ان کی اہلیہ نے سردی لگ جانے کی ڈر سے اوڑھ

> "مجھے اردو زبان کی شیرینی اور حلاوت نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس زبان سے والہانہ عشق کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس زبان سے متعلق غلط فہمیوں کے بادل چھٹیں اور زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھیں، سمجھیں اور محظوظ ہوں۔"

رکھا تھا حملہ آور جب ان کی بیوی کے کمرے میں آئے تو گورمکھ سنگھ جی نے ان سے کہا کہ یہاں میری بیمار بیوی لیٹی ہے۔ اس طرح انھوں نے ان درندوں سے اپنے مسلمان دوست کی جان بچائی۔ بعد میں حالات سازگار ہوئے تو ثاقب زیروی ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد میں بذاتِ خود جا کر گورمکھ جی سے ملا اور ان کی عظمت کو سلام کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے نیک نفس لوگوں کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے اور انسانیت زندہ ہے اسی طرح ہم لوگوں نے جب ہجرت کی تو وہاں بھی بہت سے فرشتہ صفت مسلمانوں نے غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھا خاص طور پر ایک نیک سیرت مسلمان تھانیدار نے جس طرح ہم لوگوں کی وہاں سے نکلنے میں مدد کی وہ یادیں آج بھی میرے ذہن و دل میں محفوظ ہیں اور آج بھی ان کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ ایسا وقت دوبارہ کسی پر نہ پڑے۔

د ت: چاند صاحب راولپنڈی سے نکلنے والے ایک ماہنامے 'چہارسو' (ستمبر-اکتوبر 2013) نے آپ پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے۔ آپ کے فن و شخصیت پر جن لوگوں نے قلم اٹھایا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ آپ ایک حساس اور خوش فکر شاعر اور ذہین و بالغ نظر نقاد تو ہیں ہی، جو خوبی آپ کو اپنے ہم عصروں میں ممیز و ممتاز کرتی ہے وہ آپ کی منکسر المزاجی ہے اس وجہ سے اس نمبر میں بودھراج

ظفر نے آپ کو 'خلوص و وفا کا دیوتا' کہا ہے تو تنویر شاہد زئی نے آپ کو 'محبتوں کا سفیر' کہا ہے، میں نے خود یہ محسوس کیا ہے کہ خوش گفتاری، سادگی اور شیریں بیانی آپ کی شخصیت کی نمایاں خوبیاں ہیں اس سلسلے میں آپ کی رائے:

مہندر پرتاب چاند: میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگوں کی اعلیٰ ظرفی اور محبت ہے۔ میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ ہاں یہ کوشش ضرور کرتا ہوں کہ کسی کے ساتھ دغا اور فریب نہ کروں کسی کا استحصال نہ کروں جہاں تک شیریں بیانی کی بات ہے تو میں جس زبان کا شیدائی ہوں وہ زبان ہی شیریں ہے شاید یہ اسی زبان کا اثر ہو۔

د ت: چاند صاحب آپ نے انگلینڈ، امریکہ، کینیڈا، رومانیہ، سنگاپور، ایتھوپیا، تھائی لینڈ اور پاکستان وغیرہ کے دورے کیے ہیں میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ان میں سے کون سی جگہ آپ کو سب سے زیادہ پسند آئی؟

مہندر پرتاب چاند: یوں تو میں نے مختلف ممالک کے دورے کیے ہیں اور ان یادوں کو قلم بند بھی کیا ہے لیکن مجھے اپنا ملک سب سے زیادہ پسند ہے یہاں کی قدریں مجھے عزیز ہیں۔ میں نے لندن اور امریکہ کے قیام کے دوران محسوس کیا کہ یہاں کے لوگ شیریں بیان بھی ہیں، سلیقہ شعار بھی ہیں اور کئی معنی میں ہم سے آگے بھی ہیں لیکن میرے وطن میں سماجی زندگی کا جو حسن ہے اور لوگوں کے دلوں میں جو خلوص و محبت کے چراغ روشن ہیں اس کی مثال دنیا کے کسی حصے میں نہیں ملے گی۔ یہ بات میں نے اپنی ایک نظم 'اجنبی ہوائیں' میں کہنے کی کوشش کی ہے۔ نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

بجا یہ ان کا سلیقہ، بجا یہ ان کا شعار
مگر دلوں میں کہیں بھی یہاں وہ بات نہیں
نہ وہ خلوص نہ وہ دوستی نہ اپنا پن
یہ دن وہ دن نہیں، یہ رات بھی وہ رات نہیں
مرے وطن کی طرح کی یہ کائنات نہیں

پرائے دیس کی ان اجنبی ہواؤں میں
عجب طرح کی مجھے ہو رہی ہے آج گھٹن
دیار غیر میں اے چاند ! جی نہیں لگتا
کوئی بھی رنگ ہو اپنا وطن ہے اپنا وطن
کوئی بھی ڈھنگ ہو اپنا وطن ہے اپنا وطن

د ت: آپ نے اپنے مجموعۂ مضامین 'اجالوں کے سفیر' میں ایک مضمون 'بچوں کا ادب ایک مختصر جائزہ' تحریر کیا ہے جس میں آپ نے یہ لکھا ہے کہ بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے اردو کے رسائل معاون و مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس سمت جو قدم اٹھائے جا رہے ہیں کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

مہندر پرتاب چاند: میں سمجھتا ہوں کہ آج انسان بہت مصروف ہو گیا ہے۔ ماؤں کو فرصت نہیں کہ بچوں کو کہانیاں سنا کر ان کی ذہنی تربیت کر سکیں۔ پہلے مشترکہ خاندان میں دادیاں اور نانیاں اخلاقی کہانیاں سنا کر بچوں

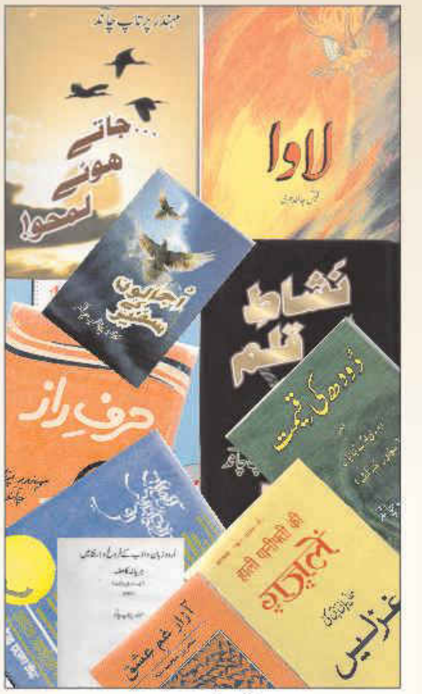

کی ذہنی تربیت کرتی تھیں لیکن اب حالات مختلف ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے انھیں اعلیٰ اوصاف سے مزین کرنے کے لیے بچوں کے ادب کی ضرورت اور اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ بڑے بڑے شعرا و ادبا و مفکرین نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ میر تقی میر، اقبال، پریم چند، جواہر لال نہرو، ذاکر حسین، اکبرالٰہ آبادی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام تک نے اس موضوع پر قلم اٹھا کر بچوں کی اخلاقی اور سماجی تربیت کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے اردو میں بچوں کے لیے ان گنت رسالے نکلتے تھے جن میں نمائندہ طور پر پھول (لاہور) کھلونا، پیام تعلیم (دہلی) نور (رامپور) قہقہہ (پٹنہ) اور نونہال (ممبئی) کا نام لیا جا سکتا ہے اب ایسے رسالوں کی تعداد کافی کم ہو گئی ہے لیکن اب اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور بچوں کے لیے رسالے نکل بھی رہے ہیں جن میں نمایاں طور پر قومی اردو کونسل (نئی دہلی) کے رسالے 'بچوں کی دنیا' اور دہلی اردو اکادمی کے ماہنامے 'امنگ' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ رسالے بچوں کی ذہنی آسودگی کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ ابھی اس سلسلے میں اور قدم اٹھانے کی ضرورت ہے ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ بچوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جائے جس سے استفادہ کر کے بچے اعلیٰ انسانی قدروں کے حامل بنیں ان میں حب الوطنی اور رواداری کے جذبات پروان چڑھیں اور وہ ذمے دار شہری بن کر ملک کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کریں۔

د ت: بعض لوگ کہتے ہیں کہ اردو کا رسم الخط تبدیل ہونا چاہیے اس طرح یہ زبان زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے گی۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہیں؟

مہندر پرتاب چاند: میں سمجھتا ہوں کہ اردو کی خوبصورتی اس کے رسم الخط میں ہے کبھی کوئی بنگالی، تمل یا تیلگو سے یہ نہیں کہتا کہ اپنا رسم الخط چھوڑ دو۔ پھر اردو سے یہ امید کیوں کی جاتی ہے کہ وہ دیوناگری رسم الخط اپنائے جبکہ ہندی زبان میں اردو اور فارسی کی بہت سی آوازیں موجود ہی نہیں ہیں۔ اس لیے یہ بحث فضول ہے کہ اردو کو اپنا رسم الخط تبدیل کرنا چاہیے۔ اردو اپنے موجودہ رسم الخط میں زیادہ بہتر طریقے سے پھل پھول سکتی ہے۔

دت: آپ کی نظر میں اردو کی موجودہ صورتِ حال اور اس کا مستقبل؟

مہندر پرتاب چاند: مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اتنی میٹھی اور شیریں زبان سیاست کا شکار ہو گئی اور اس پر مذہب کا ٹھپّہ بھی لگا دیا گیا۔ اسکولوں سے یہ زبان غائب کر دی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پوری نسل اردو زبان سے ناآشنا ہو گئی۔ مشاعرے جو اردو کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ان کا معیار بھی پہلے کے مقابلے بہت گر گیا۔ کل ملا کر صورتِ حال بڑی خوش کن تو نہیں ہے لیکن مایوسی کی ضرورت نہیں بلکہ اس سلسلے میں عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس زبان کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے سرکار کے ساتھ ساتھ اردو والوں کو بھی فعال ہونا ہوگا۔ سرکار کو بھی اس کا رشتہ روزی روٹی سے جوڑنا ہوگا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس زبان کو سیکھیں اور سکھائیں اور سب سے بڑی بات اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کرنا ہوگا کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ آخر میں گوپال متل کے لفظوں میں یہی کہنا چاہوں گا کہ

ہم بھی اردو پہ ناز کرتے ہیں
یہ ہماری زبان ہے پیارے

■

Dr. Darakhshan Tajwar
'Kainaat', B-34, Tiwaripur Aawas,
Vikas Colony, Gorakhpur - 273001 (UP)
Mob.:9415854301
Mohinder Pratap Chand
1420 Sector 8, Urban Estate, Ambala Shahar - 134003 (Haryana)
Mob.:9416155918

حقانی القاسمی

اردو کے شبد بہت کومل لگتے ہیں

سنگوک ہونگ

محترمہ سنگوک ہونگ کا تعلق ہندی-اردو زبان، ادب اور تاریخ کی تدریس سے ہے۔ انھیں ہندی-اردو کی تدریس میں وسیع تر تجربہ ہے۔ لسانیات ان کا خاص میدان ہے۔ SIPHUR (Summer Internsive Program for Hindi and Urdu) اور HUTEP (Hindi Urdu Tearcher Education Program) کی ڈائرکٹر بھی رہ چکی ہیں۔ غیر ملکی زبانوں کی تعلیم و تدریس کے مختلف اداروں سے ان کی وابستگی رہی ہے۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے ہندی ادب میں ایم اے اور Wisconsin University Madison سے جنوب ایشیائی مطالعات میں بھی ایم اے کیا ہے اور وسکانسن یونیورسٹی سے ہی لینگویجز اینڈ کلچر آف ایشیا میں پی ایچ ڈی کی ہے۔ ان کی تصنیفات میں Everyday Hindi، کوریا کی لوک کتھائیں، The Role of Heritage Students in Incorporating Culture into Language Teaching اہم ہیں۔ انھیں مختلف ایوارڈز سے بھی سرفراز کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی آف مینوسوٹا کے کالج آف لبرل آرٹ سے ان کی وابستگی ہے۔ ان سے درج ذیل پتے پر رابطہ کیا جاسکتا ہے:

Sungok Hong, Ph.D
Asian Languages & Literatures, College of Liberal Arts
220 Folwell Hall, 9 Pleasant Street S.E, Minneapolis, MN 55455
Email.: shong@umn.edu

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کے چیمبر میں جیسے ہی میں داخل ہوا ایک خاتون اردو میں محوِ گفتگو تھیں۔ بغل کی نشست پر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر اور معروف نقاد پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی بھی ہمہ تن گوش تھے۔ وہ خاتون جس لہجے میں بات کررہی تھیں وہ کچھ اجنبی اور نامانوس سا لگ رہا تھا مگر سماعتوں میں رس گھول رہا تھا۔ میں بہت دیر تک ان کی گفتگو سے محظوظ ہوتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ شعوری طور پر اردو اور ہندی الفاظ کے استعمال پر زور دے رہی تھیں۔ وہ 'ٹیچر' کے بجائے 'معلم' اور 'رائٹر' کی جگہ 'لیکھک' بول رہی تھیں۔ مجھے ان کا یہ انداز بہت پسند آیا کہ وہ اردو و ہندی میں کسی اور زبان کے تداخل سے اجتناب کررہی تھیں۔ محترمہ بہت دیر تک اردو کے مسائل، موضوعات اور ہندی-اردو کے رشتے، اردو-ہندی کے تخلیق کاروں کے حوالے سے گفتگو کرتی رہیں۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ان کا دائرہ صرف اردو اور ہندی کی تدریس تک محدود نہیں ہے بلکہ اردو اور ہندی کے عصری، ادبی منظرنامے سے بھی تھوڑی بہت آگہی ہے۔ انھیں پریم چند، قرۃ العین حیدر، مہادیوی ورما، اگیے، نرالا، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، کرشن چندر کے بارے میں بھی معلومات تھی۔

جب وہ گفتگو سے فارغ ہوئیں تو ان کے بارے میں مزید جاننے کا تجسس ہوا کہ یہ خاتون جو نامانوس اور اجنبی لہجے میں اردو بول رہی تھیں ان کا تعلق کہاں سے ہے؟ یہ چہرے مہرے سے ہندوستان یا پاکستان کی نہیں لگ رہی تھیں۔ پہلی نظر میں مجھے محسوس ہوا کہ ان کا تعلق یقیناً چین سے ہوگا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ نارتھ کوریا کی رہنے والی ہیں اور انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے ہندی ایڈوانس کا کورس کیا ہے، ہندی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے اور لسانیات یعنی بھاشا وگیان میں پی ایچ ڈی بھی ہیں۔ انھوں نے اردو میں سرٹی فکیٹ کورس بھی کیا ہے اور اب یونیورسٹی آف مینوسوٹا کے ایشین لنگویجز اور لٹریچرز ڈپارٹمنٹ میں ہندی اور اردو پڑھاتی ہیں۔ مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کہ یہ خاتون جو بہت ہی اچھی طرح اردو اور ہندی میں کمیونیکیٹ کررہی تھیں۔ اردو نہ تو ان کی مادری زبان ہے اور نہ ہی ان کے کلچر سے اس زبان کا کوئی گہرا رشتہ ہے۔ اردو ان کی اکتسابی اور ترسیلی زبان ہے۔ انھوں نے بڑی محنت سے یہ دونوں جنوبی ایشیائی زبانیں سیکھی ہیں اور اسی لیے ان دونوں زبانوں سے انھیں گہرا لگاؤ بھی ہے۔ انھیں انگریزی، چینی اور دیگر زبانوں پر عبور ہے۔ لیکن اردو اور ہندی جیسی زبانوں سے ان کا اب صرف تدریسی رشتہ نہیں ہے بلکہ عشق اور جنون کا رشتہ قائم ہوچکا ہے۔

محترمہ سنگوک ہونگ سے جب امین اللہ صاحب کی موجودگی میں انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوا تو انھوں نے اردو و ہندی کے حوالے سے بہت سی ایسی باتیں کہیں جسے سن کر مجھے تھوڑی سی جرأت بھی ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اردو سے مجھے بہت لگاؤ ہے۔ جبکہ ہندی سے میرا بنیادی تعلق ہے۔ دونوں زبانوں کے درمیان میں توازن رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ دونوں زبانوں میں امتیاز کے بجائے امتزاج کی ضرورت زیادہ ہے۔ اردو اور ہندی کے درمیان پرانے زمانے میں جو ڈائیورجینس Divergence تھا وہ اب رفتہ رفتہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کنورجینس Convergence میں بدلتا جارہا ہے۔ یہ دونوں زبانوں کے تعلق سے خوش آئند بات ہے۔ ایک ہی لسانی خاندان سے تعلق رکھنے والی ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی گرامر، صرف و نحو اور ساخت میں جو مماثلت ہے اس کی وجہ سے مجھے یہ دونوں زبانیں ایک جیسی لگتی ہیں۔ ویسے بھی یہ زبان پہلے ہندوی اور ہندی کہلاتی تھی پھر ریختہ کہلانے لگی جس کا مطلب گری پڑی شکستہ چیزیں ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو رسم الخط بہت مشکل ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندی رسم الخط زیادہ آسان ہے۔ انھوں نے دورانِ گفتگو یہ بھی کہا کہ امریکہ میں اردو کا مستقبل زیادہ بہتر نہیں ہے۔ وہاں اردو مر رہی ہے۔ میں ان کی اس رائے سے اتفاق نہ کرسکا کیونکہ میرے سامنے امریکہ میں اردو کی صورتِ حال کا پورا منظرنامہ تھا۔ کئی مضامین میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ امریکہ میں اردو کی صورت حال بہتر ہے۔ تارکینِ وطن کے علاوہ وہاں کے مقامی افراد بھی اردو زبان وادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور نائن الیون 9/11 کے بعد تو اردو اور مشرق وسطیٰ کی زبانوں کی ضرورت کا احساس وہاں کی حکومت اور ایجنسیوں کو بھی ہے۔ فیڈرل ایجنسیز میں مشرقِ وسطیٰ اور جنوب ایشیائی زبانوں کے

جاننے والوں اور ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت بڑھی ہے۔ اس تناظر میں مجھے یہ بات بڑی عجیب سی لگی کہ دہشت گردی سے جہاں انسانی جانوں کا زیاں ہو رہا ہے وہیں زبانوں کو نئی زندگی مل رہی ہے۔ جان اور زبان کی موت وحیات کی یہ منطق میری فہم سے بالاتر ہے۔ جان سے زبان زیادہ قیمتی نہیں ہوسکتی۔ اس پر بنی نوع انسانی کا ایمان ہے۔ زبانیں مرتی رہی ہیں، مرتی رہیں گی مگر انسانی جاں کا زیاں؟ یہ کائناتِ انسانی کا بڑا مسئلہ ہے۔ زبان اور انسانی جان کے تحفظ کے حوالے سے ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

محترمہ سنگوک ہونگ نے میری کچھ باتوں سے اتفاق کیا کہ فیڈرل ایجنسیوں یعنی سی آئی اے اور ایف بی آئی میں اردو تو نہیں عربی والوں کی زیادہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ ان کا اصرار اس بات پر بھی تھا کہ صرف امریکہ نہیں ہندوستان میں بھی اردو مرتی جارہی ہے اسے زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں کے مسلمان بچے جو وہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ہیں۔ اس دوران انھوں نے ایک بات بہت ہی اچھی کہی کہ تدریس کے دوران مجھے تجربہ ہوا کہ زیادہ تر بچے تصنع زدہ، پرتکلف زبان کے بجائے سادہ اور آسان زبان استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے ہندی اور اردو کے بہت سے بچوں سے پوچھا کہ تمھیں پُستک اور کتاب میں کون سا لفظ بہتر لگتا ہے۔ تو زیادہ تر بچوں نے 'کتاب' کو ترجیح دی۔ اسی طرح 'دھنیہ واد' کے بجائے 'شکریہ' کہنا پسند کرتے ہیں۔ 'پرسن' کے بجائے 'خوشی' بولنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندی میں زیادہ تر لوگ اردو کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ عام لوگوں کی زبان اردو اور ہندی کی سرحدوں کو توڑتی ہے۔ سنسکرت زدہ شُدھ ہندی بولنا زیادہ تر لوگوں کو پسند نہیں ہے۔ محترمہ نے یہ بھی بتایا کہ اردو کے شبد مجھے بہت کومل لگتے ہیں۔ اردو میں بڑی شیرینی اور مٹھاس ہے۔ اسی لیے میں اردو کے زیادہ الفاظ استعمال کرتی ہوں۔ اس میں ایک طرح کی داخلی موسیقیت کا احساس سطح اور ذوق کے مطابق اردو اور ہندی تدریس کا انتظام ہے۔ کچھ لوگ ہندی-اردو رسم الخط کو سیکھنا چاہتے ہیں اور کچھ لوگ صرف بولنے کی حد تک اس زبان سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی میں ان بچوں کی تعلیم اور تدریس کا اچھا انتظام ہے۔ محترمہ سنگوک ہونگ نے یہ بھی بتایا کہ امریکہ میں پہلے اردو سیکھنے والوں کو پاکستان بھیجا جاتا تھا مگر اب اردو سیکھنے والے بچے لکھنؤ آتے ہیں اور ہندی کے لیے انھوں نے راجستھان کا انتخاب کیا ہے۔ جو بچے اردو یا ہندی میں کچھ اور آگے بڑھنا چاہتے ہیں انھیں ہندوستان بھیجا جاتا ہے تاکہ اس زبان سے متعلق جتنا کچھ مواد یا سرمایہ ہے اس سے وہ اچھی طرح واقف ہوسکیں۔ محترمہ سنگوک ہونگ کو صرف فکشن نہیں بلکہ شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ شاعروں میں غالب، سودا اور درد بہت پسند ہیں۔ فیض احمد فیض سے بھی گہرا شغف ہے۔

محترمہ سے گفتگو کرکے اندازہ ہوا کہ اردو کا دائرہ صرف برصغیر یا ایشیا تک محدود نہیں ہے بلکہ امریکہ اور

کالج آف لبرل آرٹس یونی ورسٹی آف مینی سوٹا میں ہندی اردو کی طالبات

تصاویر: بشکریہ ویب سائٹ یونی ورسٹی آف مینی سوٹا

ایملی سونٹیگ

اینجلیل راس

راحمہ راشد

ایلا ریپ

اسکولوں میں اردو نہیں پڑھائی جاتی، اسی لیے ہم ہندی پڑھنے پر مجبور ہیں اور یہاں آکر اردو سیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم اور تدریس کے حوالے سے بھی بہت اچھی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں بنیادی سطح کی اردو اور ہندی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کا مقصد ان طلبا کو مختلف قوموں کی تاریخ، طرزِ حیات اور تہذیبوں سے آشنا کرنا ہے، خاص طور پر ایشیائی زبانوں کی تعلیم وتدریس کا مقصد یہ ہے کہ وہ جنوبی ایشیا کے سماجی و ثقافتی پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے اسکولوں میں ہندی اور اردو پڑھنے والوں میں سے بیشتر کا تعلق ہندوستان یا پاکستان سے ہے۔ پاکستانی بچے تو اردو پڑھتے ہیں لیکن ہندوستان کے مسلمان بچے ہندی ہی کو ترجیح دیتے ہیں اور امریکہ کے مقامی بچے بھی ہندی میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان لوگوں میں ایک طرح کا لسانی تعصب بھی ہے جسے ہم ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لوگ اردو کو مسلم تشخص سے جوڑ کر دیکھتے ہوتا ہے۔ انسانی طرزِ حیات کے آہنگ سے یہ زبان زیادہ قریب بھی لگتی ہے۔ محترمہ نے یہ بھی بتایا کہ ان کی یونیورسٹی میں غیر ملکی فارن لینگویج کے طور پر اردو اور ہندی سکھائی جاتی ہے اور یونیورسٹی ضابطے کے مطابق بچوں کو دو سال کی ودیشی بھاشا سیکھنا پڑتی ہے اس میں بچوں کو حروفِ تہجی کے علاوہ روزمرہ کے الفاظ اور محاورے بھی سکھائے جاتے ہیں۔ Everyday Urdu, Everday Hindi جیسی کتابیں نصاب میں شامل ہیں اور ان کے لیے الگ سے ایک نصاب تیار کیا گیا ہے تاکہ ہندی اور اردو کی بنیادوں سے واقف ہوسکیں۔ ہمارے یہاں ابتدائی اردو-ہندی تدریس کا بھی انتظام ہے اور ایڈوانس اردو-ہندی کا کورس بھی ہے اور ہم Conversational ہندی-اردو بھی سکھاتے ہیں تاکہ بچے اردو اور ہندی میں اپنے جذبات، خیالات کا اظہار کرسکیں۔ اردو اور ہندی پڑھنے والے بچوں کا تعلق زیادہ تر سول انجینئرنگ، اربن اسٹڈیز، گلوبل اسٹڈیز، سائیکولوجی اور پوسٹ سیکنڈری انرولمنٹس آپشنس (PSEO) سے ہے۔ اسی لیے انھی کی یورپی ممالک میں بھی اردو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ یہ ایسی زبان ہے جو نامانوس اور اجنبی علاقوں میں بھی اپنی جڑیں مضبوط کرلیتی ہے اور اتنی شیریں ہے کہ جو بھی اس زبان کے قریب آتا ہے وہ اس زبان کی زلفوں کا اسیر ہوجاتا ہے۔ امریکہ-برطانیہ میں کئی ایسے انگریز ہیں جنھیں انگریزی زبان وادب پر مکمل عبور ہے لیکن وہ بھی اردو کو اپنی شناخت کا حوالہ یا پہچان کا عنوان بنانا چاہتے ہیں، یہ اردو کے لیے بہت اعزاز کی بات ہے۔

خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ وہی 'ریختہ' جو گری پڑی اور شکستہ چیزوں کے معنی میں استعمال ہوتا تھا، اب عالمی سطح پر رفعت کا ایک نشان بن چکا ہے اور اردو زبان جسے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے 'زبانوں کا تاج محل' کہا ہے اسے اب پوری دنیا رشک کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔

■

Haqqani Al-QasmiC/o Mr. Abid Anwar
D-64, Flat No. 10, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Cell.:9891726444
Email.: haqqanialqasmi@gmail.com

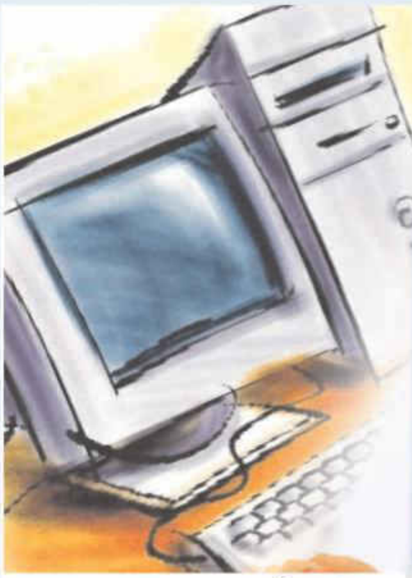

نوشاد حسین

خصوصی ضروریات والے بچے [CWSN] اور ان کی تعلیم میں ICT کا کردار

CWSNکا مفہوم : ایسے بچے جن کی تدریسی اکتسابی ضروریات عام بچوں سے مختلف ہوں، خصوصی ضروریات والے بچے کہلاتے ہیں۔ ایسے بچے تعلیم کی رسائی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ عام طور پر خصوصی ضروریات میں اکتسابی معذوری، ترسیلی بے ضابطی، جذباتی اور کرداری بے ضابطی، جسمانی معذوری اور ترقیاتی بے ضابطی شامل کی جاتی ہیں۔ اس طرح کی خصوصی ضروریات والے بچوں کو اضافی تعلیمی خدمات جیسے مختلف طریقہ تدریس، ٹکنالوجی کا استعمال، مخصوص تعلیمی جہت (Area) کے انتخاب اور مختلف وسائل سے مزین کمرہ جماعت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسے طلبا کے لیے خصوصی کمرہ جماعت یا خصوصی اسکول کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔

اعداد و شمار : ادارہ برائے سماجی و دیہی تحقیق (Social & Rural Research Institute 2014) کے مطابق ہندوستان میں 13-6 سال کی عمر کے تقریباً 21.39لاکھ (یعنی 1.05%) بچوں کی تشخیص CWSN کے طور پر کی گئی ہے۔ ان کی ایک کثیر تعداد 28.23 % (یعنی 5.94لاکھ) ترکِ مدرسہ (Drop outs) میں شامل ہے۔ جوکہ قومی شرح 2.97% سے کافی زیادہ ہے۔ اس رپورٹ میں معذوری کے مختلف شعبوں کی شرح کا خلاصہ کیا گیا ہے۔ ان میں ہڈیوں کی معذوری والے 25.12%، بصری معذور 19.59%، لسانی معذور 16.95%اور ذہنی معذور 14.57%ہیں۔ اور 11.81%ایسے بچے ہیں جوایک سے زیادہ معذوری کے درجے میں شامل کیے گئے ہیں۔

قوانین: حکومت ہند نے وقتاً فوقتاً CWSN کے لیے قوانین بنائے ہیں۔ جن مین سے نمایاں یہ ہیں۔

(1) (1992) Rehabiliation Council of India Act اس کے تحت کہا گیا ہے کہ خصوصی ضروریات والے بچوں کی تدریس تربیت یافتہ معلم سے کروائی جائے۔

(2) Persons with Disabilities Act (1995) اس کے مطابق CWSN کو 18 سال کی عمر تک مناسب ماحول میں مفت تعلیم کی رسائی کی جائے۔

(3) National Trust Act (1999) اس کے تحت شدید معذور بچوں کو خدمات اور امداد فراہم کرنے کی بات کہی گئی ہے۔

(4) The 86th Constitutinal Amendment (2007) اس قانون کے مطابق 14 سال کی عمر تک کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنے کی بات کہی گئی ہے۔

ان تمام قوانین کی مدد سے معذور بچوں کی تعلیم میں شمولیت کے لیے وسیع قومی ایکشن پلان بنانے میں سہولت فراہم ہوئی ہے۔

SSA کے تحت CWSN پر ترجیحات کے دائرے۔

SSA نے CWSN کے لیے 8 نکات پر ترجیحات پیش کی ہیں جو اس طرح ہیں:

(i) CWSN کی شناخت کے لیے سروے
(ii) CWSN کا تخمینہ
(iii) امدادی آلات فراہم کرنا
(iv) NGOاور سرکاری اسکیموں سے ربط قائم کرنا
(v) رکاوٹوں سے آزاد رسائی کرنا
(vi) اساتذہ کی تربیت کرنا
(vii) رسورس ٹیچروں کی تقرری
(viii) درسیات/درسی کتب/TLM کا تعین

CWSN کی درجہ بندی:

مختلف صلاحیت (Different Ability) کی بنا پر CWSN کی 6اقسام ہوتی ہیں، مختلف صلاحیت سے مراد ''عام شخص کے مقابلے کسی شخص کی صلاحیت میں کمی یا تحدید کی وجہ سے کسی سرگرمی کی انجام دہی میں کمی یا نقص سے ہے۔''

(1) ذہنی صلاحیت میں نقص: ایسے بچے جنھیں روز مرّہ کی ہدایات سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے، جو اپنے ہم عمر بچوں جیسے کام نہیں کر سکتے مثلاً باتیں کرنا، رونا، ہنسنا، خوف، تعجب، اشتعال وغیرہ کے جذبات ظاہر کرنے سے قاصر ہوں، خود کا خیال رکھنے والے کام جیسے دانتوں کی صفائی، کپڑے پہننا، نہانا، کھانا، پینا، خود کی صحت اور صفائی کے کام، گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا، اور سماجی مہارتوں میں پیچھے رہ جانا وغیرہ۔

(2) بصری صلاحیت میں نقص: بصری سرگرمیوں والے کام کرنے کی صلاحیت میں کمی ظاہر کرنے والے بچے اس زمرے میں شامل کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک یا دونوں آنکھوں سے روشنی کا ادراک نہ کر پانا، مختلف رنگوں کی شناخت نہ کر پانا، ہاتھ کی انگلیوں کی گنتی نہ کر پانا وغیرہ۔

(3) سمعی صلاحیت میں نقص: ایک یا دونوں کان سے سننے میں کسی قسم کی دشواری یا سماعت میں نقص والے بچے اس زمرے میں شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ بات چیت اور ماحولیاتی آوازیں بھی سننے سے قاصر رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسے بچے سوالات کے غیر موزوں جوابات دیتے ہیں۔

(4) قوت گویائی میں نقص: ایسے بچے جن کی کہی ہوئی باتوں کو سامعین سمجھ نہیں پاتے ہیں، ان کی قوت گویائی میں نقص کا یہی پیمانہ ہوتا ہے، ایسے بچے یا تو مکمل طور پر بولنے سے قاصر رہتے ہیں یا صرف محدود الفاظ ہی بول پاتے ہیں یا لکنت سے بولتے ہیں۔

(5) جسمانی /حرکی معذور: ایسی سرگرمیاں جس میں بچے خود کے جسم کی یا دیگر اشیاء کی حرکت کرنے میں قاصر ہوں جسمانی معذور بچے کہلاتے ہیں۔ اس میں ہاتھ، پیر کی معذوری، فالج، جسم کی بناوٹ میں نقص، جوڑ میں نقص، پیٹھ یا ریڑھ کی ہڈی میں نقص، بونا پن، گردن چھوٹی ہونا یہ تمام نقائص شامل کیے جاتے ہیں۔

(6) کثیر صلاحیت میں نقص: مذکورہ بالا میں سے دو یا دو سے زیادہ صلاحیتوں میں کمی اس زمرے میں آتی ہیں۔

حکومت کے اقدامات:

CWSN اکتساب میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ کمرہ جماعت کے تعامل کے دوران وہ معلم پر توجہ مرکوز نہیں کر پاتے ہیں یا ان کے اکتساب کی رفتار مختلف ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی سماجی اور جذباتی مہارتیں بھی کمزور ہوتی ہیں۔ انھیں تمام مسائل کے مدِ نظر 29 اکتوبر 2008 کو CBSE اسکولوں میں فرمان دیا گیا کہ CWSN میں سے کسی بھی بچے کو داخلے سے روکا نہ جائے۔ اور ان کے مسائل کو کم کرنے کے لیے انھیں مدد فراہم کی جائے۔ اس کے تحت ایک بالغ کو اس کے ساتھ کمرہ جماعت میں بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔ تاکہ اس بچے کی حوصلہ افزائی ہو سکے، اُس پر انفرادی توجہ دی جا سکے اور اسے دیگر ہم جماعت ساتھیوں کے مساوی سیکھنے اور ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہو سکیں۔

اس کے علاوہ انفرادی تعین قدر کے پروگرام کے ساتھ انھیں شمولیاتی تعلیم فراہم کی جائے، ہر ایک خصوصی ضروریات والے بچے کے لیے خصوصی ہدف طے کیا جائے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک خصوصی معلم کی تقرری کی جائے۔ مزید CWSN پر توجہ نہ دینے یا انھیں اسکول میں داخلہ دینے سے منع کرنے پر اس اسکول کے خلاف سخت قدم اٹھانے، یہاں تک کہ اس کی منظوری رڈ کرنے کا حکم بھی دیا گیا۔

اس طرح کے بچوں کے لیے اسکولوں کو ہدایات بھی فراہم کی گئیں جو اس طرح ہیں:

(i) CWSN کو داخلہ دینے سے منع نہ کیا جائے۔
(ii) اسکول میں ایسے بچوں کے اندراج پر نگرانی رکھی جائے۔
(iii) امدادی آلات اور تربیت یافتہ معلم کی تقرری کے ذریعے مدد فراہم کی جائے۔
(iv) موجودہ بنیادی سہولیات اور تدریسی طریقۂ کار میں ترمیم کر کے ایسے بچوں کی ضروریات کی تکمیل کی جائے۔
(v) تمام اداروں میں ایسے بچوں کے لیے 3% تحفظ 1995 کے PWD Act کے تحت کیا جائے۔
(vi) تمام اسکول کو سنہ 2020 معذوروں کے موافق بنایا جائے۔ تمام تعلیمی اداروں اور دیگر عمارتوں مثلاً قیام گاہ، کتب خانہ، تجربہ گاہ، مطبخ وغیرہ میں ایسے طلبا کی رسائی سہل بنائی جائے۔
(vii) ایسے طلبا کے لیے چارٹ، ماڈل اکتسابی اشیا، درسی کتب اور کمپیوٹر وغیرہ کی دستیابی کو یقینی بنایا جائے۔
(viii) سمعی معذور طلباء کے لیے تمام آلات اور خدمات مہیا کی جائیں۔
(ix) وسائل سے مزین کر کے کمرہ جماعت کی از سرِ نو تشکیل کی جائے۔
(x) ابتدائی اور ثانوی سطح پر باقاعدہ تربیتی پروگرام برائے اساتذہ منعقد کیے جائیں۔

CWSN کی تعلیم میں ICT کا کردار :

خصوصی تعلیمی ضروریات والے طلباء کو اکتسابی تجربہ فراہم کرنے میں اطلاعاتی اور ترسیلی ٹکنالوجی کا تعاون بے مثل اور بیش قیمتی رہا ہے۔ CWSN کی تعلیم میں ICT دو طرح سے کردار ادا کر رہی ہے۔

اول تو CWSN کی شناخت کرنے میں جدید مشینوں اور آلات کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور ان کی معذوری کو نئی ٹکنالوجی کے تعاون سے دور کیا جا رہا ہے۔ اور ان کی سماعت، گویائی، تحریری اور تقریری مہارتوں کا فروغ کرنے میں آئی سی ٹی کی مدد لی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں سماجی تعلقات کی مہارتوں کا فروغ بھی ICT کے ذریعے ہی کیا جا رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ حکومت اور غیر حکومتی اداروں کے ذریعے فراہم کی جانے والی خدمات، امدادی آلات اور دیگر سہولیات کی نگرانی، ان کا تعین قدر اور ان کی اتباع پر مبنی خدمات میں بھی آئی سی ٹی کا تعاون لیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں مدھیہ پردیش کا نام قابلِ ذکر ہے جو اولین صوبہ ہے جہاں ICT کا استعمال CWSN کو فراہم کی جانے والی امداد کے عمل کی نگرانی اور انفرادی اتباعی خدمات کے لیے کر رہا ہے۔ اس کے تحت تمام تشخیص شدہ CWSN کو پہلے رجسٹریشن کروانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان کی طبی جانچ کی صورتِ حال کی معلومات Online Tracking کے ذریعے کی جاتی ہے۔ اور ان کو فراہم کی جانے والی امداد کی انفرادی اتباع کے ذریعے جانچ کی جاتی ہے۔

اس طرح کے تمام CWSN کی معلومات کو آن لائن سبھی کی رسائی کے لیے رکھا جاتا ہے۔ جس میں معذوری کے زمروں اور ضلع وار اندراج کی تعداد، ان کو فراہم کیے گئے آلات کی تعداد، اساتذہ کی تربیت سے متعلق معلومات اور موبائل رسورس پرسن کے ذریعے کیے گئے کام کی تفصیلات فراہم کی جاتی ہیں۔ مدھیہ پردیش میں اس طرح کے ار لاکھ سے زیادہ CWSN کی شناخت کر کے انھیں امداد کے لیے رجسٹرڈ کیا گیا ہے۔ اور CWSN سے متعلق SSA کے زیر اہتمام چلائے جانے والے پروجیکٹ کی نگرانی بھی اسی پورٹل کے ذریعے کی جا رہی ہے۔

مختلف زمروں کے خصوصی ضروریات والے بچوں کے لیے امدادی ٹکنالوجی :

CWSN کے تعلیمی مسائل کے حل کے لیے جدید ہارڈ ویئر اور سافٹ وئیر کی تشکیل امدادی ٹکنالوجی کے دائرے میں آتی ہے۔ اس کے اکثر آلات Microsoft کمپنی بناتی ہے۔ اس کے علاوہ Rehab Tool بھی CWSN کے لیے امدادی اشیاء بناتی ہے۔

Rehab Tool: یہ ایک اطلاعاتی ٹکنالوجی (IT) کی کمپنی ہے جس کی ویب سائٹ rehabtool.com ہے۔

جسمانی معذور بچوں کی تعلیمی ضروریات کے لیے امدادی ٹکنالوجی:

ایسے بچوں کو کمپیوٹر کی رسائی میں سب سے زیادہ دشواری Keyboard اور Mouse کو چلانے میں ہے۔ اگر معذوری شدید نہیں ہے اور ایک ساتھ دو بٹن

دب جانے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ تب پلاسٹک یا دھات کے بنے ہوئے Key Gaurds استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے Keyboard محفوظ رہتا ہے۔

اگر معذوری شدید ہو تو متبادل Keyboard استعمال میں لائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً:

(i) بڑے Keyboards جس میں بٹن کی تعداد کم اور بٹن کا سائز بڑا ہوتا ہے۔

(ii) جب کوئی شخص زیادہ حرکت کرنے سے قاصر ہو تو اس کے لیے چھوٹے Keyboards جس میں بٹن کا سائز چھوٹا اور بٹن پاس پاس ہوتے ہیں، استعمال میں لائے جاسکتے ہیں۔

(iii) اسکرین پر مجازی Keyboard پیش کر کے اسے Mouse کے ذریعے چلایا جاسکتا ہے۔

(iv) آواز سے Command دے کر بھی کمپیوٹر میں Input داخل کیے جاسکتے ہیں۔

Mouse کے متبادل بھی استعمال میں لائے جاسکتے ہیں مثلاً

(الف) **Trackball**: اس میں گیند نما شکل کو حرکت دے کر Cursor کو آگے پیچھے کیا جاسکتا ہے۔

(ب) **Touch Pads**: ایک چکنی سطح جس پر انگلی رکھ کر Cursor یا Pointer کو حرکت دی جاتی ہے۔ لیپ ٹاپ میں اکثر اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

(ج) **Joystick**: اس میں Lever کو حرکت دے کر Cursor کو اسکرین پر حسب ضرورت گھمایا جاسکتا ہے۔

(د) **Touch Screen**: اس کا استعمال بھی Mouse کی طرح کیا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر ذہنی معذور اور آنکھ و ہاتھ کے ارتباط میں ناقص بچوں کے لیے مفید ہے۔

جسمانی معذور کے لیے لکھنے میں سہولت بخش امدادی ٹکنالوجی:

Word Completion Software: یہ کسی لفظ کے مخفف اور ایک یا چند حروف کو Type کرنے پر مکمل لفظ اور جملے کی تشکیل کر دیتا ہے۔

بلند خوانی، مطالعہ اور ڈرائنگ کے لیے امدادی ٹکنالوجی:

(i) بلند خوانی کی مہارت کا فروغ کرنے کے لیے اس کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس میں اسپیکر کے ذریعے output حاصل کیا جاتا ہے، جیسے e-book کو کمپیوٹر خود بہ خود پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔

(ii) **Planning/ Organization Software**: یہ تصورات کو نقوش کی شکل دے کر تصورات کو واضح اور علم کو مستحکم کرتا ہے۔ CD یا انٹرنیٹ پر Multimedia لغات اور قاموس کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔

بصری معذور بچوں کی تعلیمی ضروریات کے لیے امدادی ٹکنالوجی:

☆ تحریری مہارت کا فروغ کرنے کے لیے:

(i) معیاری Keyboards پر Reference Keys بنائی جاتی ہیں، یعنی بٹن میں ایک خاص اُبھار بنایا جاتا ہے جس پر انگلی رکھنے سے اُس بٹن اور آس پاس کے بٹن کی معلومات ہوجاتی ہے۔

(ii) **Braille Display**: یہ بصری معذوروں سے ہونے والی تحریری غلطیوں کی اصلاح کے لیے ہوتا ہے۔

(iii) **Braille Printers**: بریل پرنٹ اور بڑی جسامت کے پرنٹ سے بصری معذوری پر کچھ حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔

☆ بلند خوانی کی مہارت کے فروغ کرنے کے لیے۔

نابینا شخص کے لیے تین قسم کا output دیا جاسکتا ہے۔

(i) سمعی **output**: اس کے تحت خود پڑھنے والی کتابیں، Screen Readers استعمال میں لائے جاتے ہیں جو وقفے کے ساتھ بلند خوانی کرتے ہیں۔

(ii) لمسی **output**: اس کے تحت بریل رسم الخط کے حروف استعمال کیے جاتے ہیں۔

(iii) مخلوط **output**: درج بالا دونوں طریقوں کے امتزاج کو بھی استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

کمزور نظر والے شخص کو دو طرح کی امداد فراہم کی جاسکتی ہے:

(i) Low Vision software for Magnification, Screen and Document Reading

یہ اسکرین اور متن کو بڑا کر کے دکھاتا ہے۔

(ii) Full Colour CCTV System

یہ cctv پر مشتمل طبع شدہ مواد کو پڑھنے، متن اور تصویر کو بڑا کر کے، روشن اور واضح کرتا ہے۔

سمعی معذور بچوں کے لیے امدادی ٹکنالوجی:

(i) Automatic System of Speech Recognition: اس کے تحت TV کی آواز کو ساتھ ساتھ اسکرین پر تحریری الفاظ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا استعمال ٹی وی کی خبروں اور فلموں میں ہونے لگا ہے۔

(ii) Tele Typewriter (TTY) یا Telecommunications Device for the Deaf (TDD): یہ ٹائپ رائٹر کی جسامت کا ہوتا ہے جس پر چھوٹی سی اسکرین پر ٹائپ کیا متن نظر آتا ہے۔

لسانی اور قوت گویائی سے معذور بچوں کے لیے امدادی ٹکنالوجی:

(i) Graphic Database of Picture Communication Symbols:

ایسے بچے جو محدود الفاظ کے ساتھ صرف بنیادی سطح کی ترسیل ہی کر پاتے ہیں انھیں تصویری علامات کے ذریعے Speech سنائی جاتی ہے۔

(ii) اس کے علاوہ لسانی معذور بچوں کے لیے Voice Output communication Aids بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔

ذہنی معذور بچو ں کے لیے امدادی ٹکنالوجی:

(i) کم بٹن والے متبادل Keyboards کا استعمال

(ii) Touch Sensitive Keyboards کا استعمال: یہ پیچیدہ Task کو چھوٹے اور آسان حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

(iii) Facilitated Keyboards: یہ حرف اور Icon کی شناخت میں مدد کرتا ہے۔

(iv) Trackball: ایسے بچے جو Mouse کا استعمال کرنے سے قاصر ہوتے ہیں انھیں Pointer اور Crusor کی حرکت کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اس کے لیے ہاتھ کی زیادہ Refined حرکت کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

(v) Touch Screen: کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ کی اسکرین کی شفاف سطح پر Icon بنے ہوتے ہیں اور ہاتھ کی انگلیوں کو Pointer اور Cursor کی طرح استعمال میں لایا جاتا ہے۔

خلاصہ:

آج پوری دنیا CWSN کو تعلیم کے مجموعی دھارے میں شامل کرنے کے لیے جدو جہد کر رہی ہے اور دوسری جانب ICT نے انسانی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس لیے CWSN کو تعلیم کے مجموعی دھارے میں جوڑنے میں ICT امدادی ٹکنالوجی اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا موزوں استعمال کیا جائے اور اساتذہ کو اس سے متعلق تربیت فراہم کی جائے۔

■

Naushad Hussain, Assistant Professor, College of Teacher Education (MANUU) Bhopal (MP)

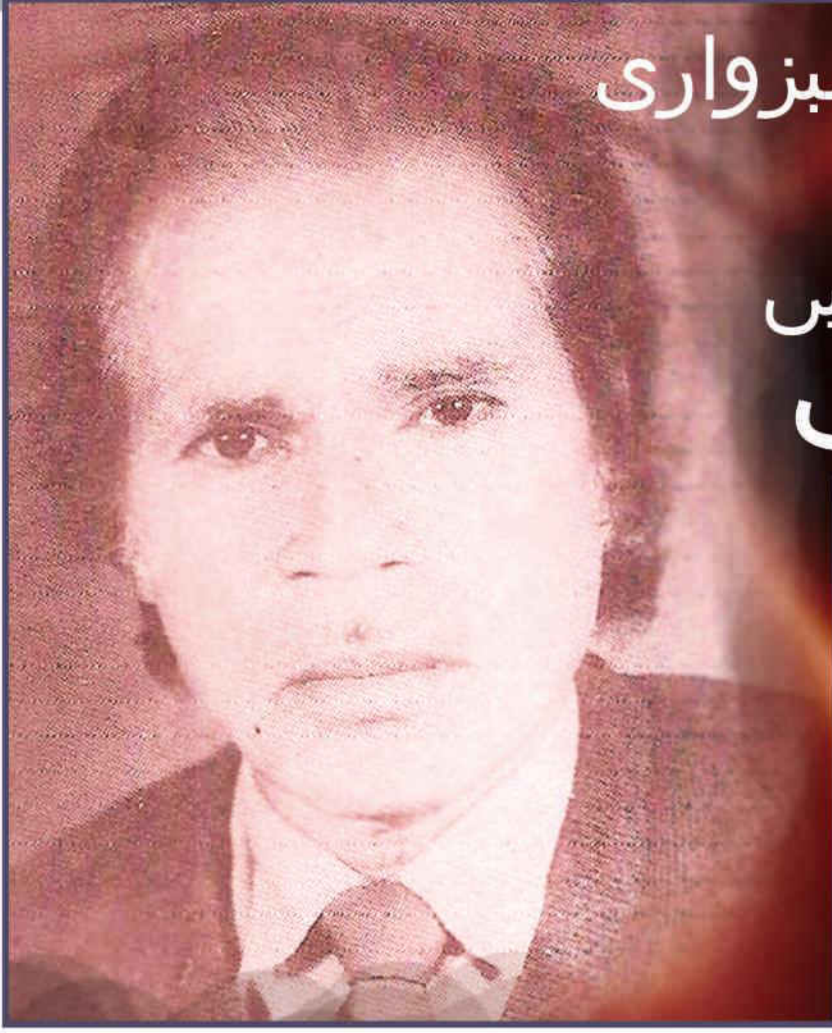

مصور سبزواری کی شاعری میں امیجری

عابد حسین حیدری

1960 کے بعد جب ہمارے جدید شاعروں نے اپنی غزلوں میں جدید حسیّت کے اظہار کے لیے حسن و عشق کی زبان کو خیر باد کہہ کر نئے الفاظ کا سہارا لیا تو عام طور سے پیکریت اور علامت پسندی کی راہ اختیار کی۔ ایسا نہیں ہے کہ جدید شعرا نے روز مرہ کے جن الفاظ کا استعمال کیا ان کا استعمال ہماری کلاسیکی شاعری میں سرے سے ہوا ہی نہیں تھا۔ ہوا تھا لیکن اس کا انداز الگ تھا۔ یہاں تک کہ جدید شعرا کا اسلوب علامتی بن گیا۔ اس علامت نگاری میں پیکر تراشی کا عمل نہایت دلآویز اور خوش آئند طور پر سامنے آتا ہے اور اسی عہد جدید میں مصور سبزواری کی شاعری کے الفاظ کی خوشبو پیکریت کے پھولوں سے نکل کر علامتوں کے گلدستے میں ہوتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے اور ہمارے ذہن وشعور کو روحانی فرحت وانبساط سے ہم کنار کرتی ہے۔ مصور سبزواری کے مجموعہ ہائے کلام 'مانجھی دھیرے چل' برگ آتش سوار، رشتے ٹوٹنے کا موسم، دہلیز پر اترتی شام اور 'دھمال' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی شاعری کے رنگ و آہنگ میں جذبات و احساسات کا وہ حسین منظر دکھائی دیتا ہے جو انھیں اپنے عہد کے دوسرے شعرا سے منفرد بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری دماغ سے زیادہ جذبات کو اور فکر سے زیادہ احساس کو متاثر کرتی ہے۔

مصور سبزواری نے اپنی شاعری میں جو پیکر تراشے ہیں وہ خشک اور بے جان نہیں بلکہ اپنے اندر زندگی کی علامتوں کی بے پناہ خوشبو رکھتے ہیں۔ ان پیکروں کے زاویے الگ الگ ہیں لیکن سب کا اشارہ ایک ہے۔ چاہے وہ موجودہ حیات کا درد و کرب اور اضطراب ہو۔ اسی کرب و اضطراب کو مصور نے مختلف زاویوں سے دیکھنے دکھانے اور سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ بطور مثال ان کے چند علامتی اشعار ملاحظہ فرمائیں:

لہروں کی اجلی ریت پر عکس گناہ تھے
سورج کی آنکھ میں بھی سمندر سیاہ تھے

بجز بکھرتے پروں کے یہاں تو کچھ بھی نہیں
تم اپنے اپنے پرندے پروں سے پہچانو

نہ تھا کوئی نفس جس گھر کے اندر جاگنے والا
وہیں اک عکس تھا منظر بہ منظر جاگنے والا

قدموں کے نیچے اجنبی پانی ہے اب فقط
پتھر سرک گئے جو ہماری پناہ تھے

موجودہ عہد کے انسان کے ذہن وشعور کے اندر شکست و ریخت کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ مصور کی نظر میں موجودہ انسان بھیڑ میں اکیلا تو تھا ہی، لیکن اب اپنے گھر میں بھی بے گھری کا شکار ہے۔ انسانی رشتوں کی نارسائی کا کرب مصور کو اپنی جڑوں کی تلاش پر مجبور کرتا ہے۔ اور یہی تلاش یا احساس ذات کے اندرونی تہہ خانے سے نکل کر سارے ماحول اور معاشرے کو اپنے احاطے میں لے لیتا ہے:

جب کسی کے پلٹ آنے کی توقع ہی نہ ہو
جلتی دہلیز کی ہر آنکھ بچھادی جائے

دہلیز کا بھی آخری پتھر اکھڑ گیا
لوٹے ہو اب مکینو کہ جب گھر اجڑ گیا

درخت چھاؤں زمینوں کی برکتیں بھی گئیں
سروں سے اپنے وہ گرتی ہوئی چھتیں بھی گئیں

بے گھری کے علاوہ مصور سبزواری کی غزلوں میں کربلا کے عظیم سانحے کی بازگشت بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ مصور کی نظر میں موجودہ حیات کربلا کا میدان ہی تو ہے۔ نا انصافی ظلم واستبداد اور جبر اس برق رفتار صدی کی دین ہی تو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصور نے اپنی جڑوں سے ہی وابستہ واقعۂ کربلا سے علامات واستعارات کا سہارا لیا یا یوں کہا جائے کہ موجودہ حیات کے کرب و بلا کے اظہار کے لیے انھوں نے جس کثرت سے مذکورہ بالا علامتوں اور استعاروں کا استعمال کیا دوسرے جدید شعرا کے یہاں اس کی مثالیں کم ملیں گی:

حسینؓ ہی تھا جو پیاسا اٹھا فرات سے وہ
لہولہان سمندر تھا اپنی ذات سے وہ

کہاں گیا جرس کربلا بلا کے مجھے
کہ راستے میں مرا گھر تمام ختم ہوا

درج بالا اشعار میں مصور نے جن علامتوں کا ذکر کیا ہے اس سے واقعۂ کربلا اور اس کے اسباب وعلل کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مصور نے اپنی فنکارانہ مہارت سے جو امیجری پیش کی ہے وہ دوسرے شعرا کے یہاں کم نظر آتی ہے:

سینہ شب میں یہ خنجر بھی اتر جائے گا
صبح کے ساتھ مرا سر بھی اتر جائے گا

تمام عمر میں جیسے لہو لہان رہا
کسی نے خواب میں اک تیر مجھ کو مارا تھا

چلو یہاں سے کہ آسیب شام اتر آیا
ہے وقت قبروں سے لاشوں کے اب نکلنے کا

مصور کی صرف یہ امیجری نہیں ہے بلکہ اس میں معنی کی تہہ داری بھی ہے:

دست اماں نے آخری انگلی بھی چھوڑ دی
اب جھک کے پائے سیل ستم گار تھام لو

اٹھو یہاں سے جادوئی خیمے اکھڑ گئے
مٹھی میں خاک سایۂ اشجار تھام لو

اس ڈر سے اس نے دھوپ میں آنسو سکھا لیے
ان پانیوں میں آگ کے جلنے کا خوف تھا

مصور نے اپنی شاعری میں جو پیکر تراشی کی ہے ان میں خوف کی امیجری قابل توجہ ہے اور خوف کی امیجری ان کی بنیادی شناخت اس لیے بن جاتی ہے کہ وہ ماورائی فضا کے سہارے ایسے خوفناک مناظر دکھاتے ہیں جو قاری کو متحیر کر دیتے ہیں:

سکوت آب سے ڈر کر جو ماری چیخ اس نے
تو اک کٹا ہوا دریا سے سر نکل آیا

صدائیں دیتے ہو کس کو یہاں رہا ہے کون
بس ایک دشت فنا کا اکیلا پن ہوں میں

کسے خبر تھی کہ یہ حادثہ بھی ہونا ہے
گریں گے غار میں کرنوں کو ہم پکڑتے ہوئے

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ جہاں مصور کی انفرادیت خوف کی امیجری ہے وہیں ان کی شاعری کا بنیادی محرک اپنی جڑوں کی تلاش ہے اور وہ اس لیے ہے کہ وہ اس اجنبی اور بے وفا دنیا میں اپنی شناخت قائم کر سکیں، انھیں اپنے ہونے کا احساس ہو سکے۔ دیہات کی فضا سے وابستگی، دیہی مناظر کی بازیافت، کراہتی ہوائیں، اداسی کی فصلیں، گہری سانج کی بیلا، مانجھی کے گیت، پت جھڑ کے نوحے اور اس نوع کی متعدد امیجری مصور کی اس تلاش سے عبارت ہے جو وہ اپنے بچپن کی فضاؤں کی بازیافت اور اس سرزمین سے اپنے بنیادی تعلق کے ذریعے کر رہے ہیں۔ یہ ان کی اپنی جڑوں کا احساس ہے جس کی طرف انھوں نے اپنی غزلوں میں متعدد جگہ اشارے کیے ہیں اور یہی احساس انھیں اپنائیت کی تلاش کا احساس دلاتا ہے جبھی تو مصور اس طرح کے شعر کہتے ہیں:

میں تیری یاد کے ساون کو کہاں برساؤں
اب کی رُت میں کوئی بادل بھی نہ گرجا مجھ میں

دفن اب ندی کے پار ہے وہ زندہ قہقہہ
جورت جگوں کے گاؤں میں ڈھولک کی تھاپ تھا

لیکن آگے چل کر یہ تلاش ذاتی شناخت تک محدود نہیں رہی۔ اب یہ پھیل کر اجتماعی تشخص کی تلاش بن گئی ہے۔ شہید کربلا، واقعات کربلا اور کربلا کے شہیدوں کا تذکرہ مصور کی شاعری میں محض شعری استعارے کے طور پر نہیں آئے بلکہ حضرت علیؓ کی ذات والا صفات اور مظلوم کربلا امام حسینؓ اور شہیدان کربلا پر گذری ہوئی مصیبتیں، ان کی مظلومی، وفاداری، حق جوئی، راہ صداقت میں قربانی اور بھوک و پیاس میں ثابت قدمی، پس ماندگان کربلا خصوصاً مخدرات عصمت و طہارت پر گذری ہوئی قید و بند کی صعوبتیں مصور کا تہذیبی و تاریخی ورثہ بن کر ان کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ اپنی شناخت کو اجاگر کرتے ہوئے واقعۂ کربلا کو استعارہ بناتے ہوئے کہتے ہیں:

بلند ظرفوں کو جھکتے سروں سے پہچا نو
نسب ہماری پھٹی چادروں سے پہچانو

عظیم تر ہے جماعت سے انفرادیت
حسینؓ کو نہ بھرے لشکروں سے پہچانو

شہیدان کربلا کی عظیم قربانی کے حوالے جہاں جہاں بھی مصور کی شاعری میں آئے ہیں وہاں شاعر کے اپنے احساسات و واردات کو ان سے علاحدہ کرنا مشکل ہے۔ کہیں وہ اس کی ذات کا حوالہ بن گئے ہیں اور کہیں اس کے ماحول کا۔ حضرت مسلم بن عقیلؓ کے کمسن بچوں کا حوالہ ملاحظہ فرمائیں:

ہر آنکھ سر بریدہ یتیموں کی نہر ہے
یہ شہر بے وفا وہی کوفے کا شہر ہے

تشنگی کا احساس واقعۂ کربلا کے حوالے سے دیکھیں:

فرات ہار کے ہم نے تو تشنگی جیتی
یہ سلسبیل یہ زمزم اٹھا لیے جائیں

یا خودی کے حوالے سے یہ شعر بھی قابل توجہ ہے:

مفا ہمت کا کوئی راستہ نکلتا کیا
عدو کی ہم سے طلب کردہ بیعتیں ہیں بہت

یا درج ذیل شعر ملاحظہ فرمائیں جس کے ذریعے اپنی پہچان قائم کرنے کی آرزو ہے:

میں پیٹھ موڑ لوں یہ فطرت حسینؓ نہیں
کھڑی ہیں میرے مقابل یہ کربلائیں مری

مصور سبزواری نے اپنی شاعری میں واقعۂ کربلا کو اپنی محرومیوں، وفا شعاریوں، حق جویوں، خودی اور عزت نفس کا استعارہ بنایا ہے اور اس طرح اسے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو اس روایت کا حصہ محسوس کر سکیں اور اس سے اپنا بنیادی رشتہ جوڑ سکیں۔ تشنگی کی شدت میں حضرت عباس علمدار کے لیے ہاتھ اور چھلنی مشکیزہ آنا بھی اسی روایت کا حصہ ہے جس کا شاعر علم بردار بننے کی آرزو رکھتا ہے اور جس کی اپنے تجربات سے مماثلت ڈھونڈ رہا ہے:

خیمہ ہائے تشنگی تک پہنچیں گے جب نصف ہاتھ
چھلنی مشکیزے کو پانی دیر تک یاد آئے گا

نہ بھیگے ہونٹ بھی کم ظرف دشت و دریا کے
کوئی حسینؓ لہو کی سبیل چھوڑ گیا

اسی طرح مصور نے اسیری کے منظر نامے کو بھی اپنی شاعری کا استعارہ بنایا ہے۔ یہ منظر نامہ بھی مصور کے اپنے تہذیبی پس منظر اور اس روایت کا احساس ہے جس کی جڑوں سے وہ وابستہ ہیں۔ حضرت سید سجاد اور مخدرات عصمت و طہارت کی اسیری کا استعارہ ملاحظہ فرمائیں:

ایک تھا بیمار قیدی اک گواہ چشم دید
ایک ہی زنجیر کو دربار تک وہ لے گیا

ناموس صبح کربلا اپنی ردا سنبھال
چل کر ابھی تو شام کا دربار آئے گا

سطور بالا میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ مصور کے ایسے اشعار ہیں جن میں واقعہ کربلا کا اظہار بالواسطہ طور پر ہے۔ ان کے یہاں اکثر یہ حوالے موہوم اشاروں ہی پر مبنی ہیں۔ چند اشعار دیکھیں:

نہ تیری پیاس نے دریاؤں ہی سے بیعت کی
نہ پانیوں پہ لکھا تیرا نام ختم ہوا

امیر شہر کی مجلس میں پیش ہونا ہے
کلاہ کج میں نئے خم اٹھا لیے جائیں

بچے جوان ہو گئے نا طاقتی کے ساتھ
کب بازوؤں میں زور علمدار آئے گا

■

Dr. Abid Husain Hydery Head Dept of Urdu,
MGM (P.G) College, Sambhal - 244302 (UP)

کرشن چندر کا تصورِ اتحاد

عبدالرشید خان

ہمارا ملک دنیا بھر میں واحد ملک ہے جو وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کی ایک نمائندہ مثال پیش کرتا ہے۔ یہاں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ ان کے رنگ و نسل، زبان، رسم و رواج، تہذیب و تمدن، کلچر، ثقافت، بول چال اور عقائد میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ عوامی سطح پر پایا جانے والا یہی تفاوت اس ملک کی شان اور پہچان ہے۔ بقولِ ذوق:

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
ہے ذوق اس چمن کو زیب اختلاف سے

ہندوستان میں قائم اسی ماحول کے پیش نظر مفکروں، دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور سیاستدانوں نے ملک کی سالمیت کے لیے قومی یکجہتی کو لازمی قرار دیا۔ یہاں کے اہلِ دانش ہمیشہ اس بات پر ہم خیال رہے ہیں کہ ہندوستان کی بقا عوام کی یکجہتی میں مضمر ہے۔ یہاں کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ محمد بن قاسم سے لے کر عہد مغل کے اختتام تک جس مشترکہ تہذیب وتمدن اور قومی یکجہتی کو جنم ملا اس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہیں کہ سالہا سال تک نشیب و فراز آنے کے باوجود اس کے مٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

"دونوں قومیں ایک دوسرے کے تمدن و معاشرت اور خیالات اور دیگر اثرات سے اس قدر متاثر ہوئی ہیں کہ اب اگر کوئی چاہے کہ ان اثرات کو مٹادے تو ناممکن ہے۔ گویا قسمت میں یہ بدا تھا کہ یہی دونوں قومیں اس ملک کی وارث ہوں گی اور اس کی قسمت دونوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ ان کے ایکے میں اس کی بہبودی و فلاح اور ترقی و عروج ہے تو ان کی پھوٹ میں اس کی ذلت و خواری اور نکبت و غلامی ہے۔ جب اٹھیں گے تو مل کر اٹھیں گے اور اگر گریں گے تو اپنی نااتفاقی کی بدولت۔ دنیا میں کوئی فردِ بشر ایسا نہیں ہے جو بے عیب ہے، اسی طرح کوئی قوم بھی ایسی نہیں جو عیوب و نقائص سے خالی ہو۔ مگر دنیا میں شاید یہی دو قومیں ایسی ہیں جو ایسے اوصاف اور عیوب سے متصف ہیں کہ اگر یہ اتحاد کر لیں تو ایک کے عیوب پر دوسرے کی خوبیوں سے پردہ پڑ جائے گا اور ایک کے ضعف کو دوسرے کی قوت سنبھال لے گی۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہندو ایک ایسی قوم ہے جس کے گزشتہ کارنامے اس عالم کی بہترین اور اعلیٰ یادگاروں میں سے ہیں اور اس میں اب بھی بڑائی کے آثار اور دنیا میں ایک اعلیٰ قوم بننے کی صلاحیت موجود ہے اور اسی طرح ہندوؤں کو بھی نہ بھولنا چاہیے کہ مسلمان وہ قوم ہے جس نے اپنی عالمگیر فتوحات کے ساتھ علم و اخلاق کی روشنی دنیا میں پھیلائی اور گو اب انحطاط میں ہے۔ مگر اب بھی اس کی سلطنتیں دنیا میں قائم ہیں اور اگر وہ عقل سے کام لے تو اس میں اتنی سکت باقی ہے کہ وہ پھر انہی کے نام اور قوموں میں سے ہو جائے۔ اسے خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ ان دونوں قوموں کا سنگم ایک ایسے ملک میں واقع ہوا ہے جو دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اگر یہ دونوں قومیں نفسیات اور خود غرضی کو چھوڑ دیں اور تھوڑا سا جبر اور تھوڑا سا صبر اختیار کریں تو ان کے اتحاد کی بدولت ایک ایسے تمدن کی بنیاد قائم ہو جائے اور یہ خود ایک ایسی قوت بن جائیں کہ اس کی نظیر نہ ہو اور ایک دنیا ان کے قدموں تلے ہو۔"

(تمدنِ ہند، مترجم سید علی بلگرامی ص 22)

اتحاد اور اتفاق کی برکت محسوس کرتے ہوئے ہندوستان کے ادیبوں اور قلمکاروں نے مختلف زبانوں میں اس موضوع پر مضامین لکھے، شعر کہے اور کتابیں تحریر کیں۔ اُردو کے قلمکاروں خصوصاً افسانہ نگاروں نے بھی اس حساس موضوع پر قلم اٹھایا۔ منشی پریم چند نے قومی یکجہتی پر کئی کہانیاں لکھی ہیں جن میں 'دو بیل' ایک شاہکار ہے۔ جن ترقی پسند ادیبوں نے اس موضوع کی جانب اپنی خاص توجہ مبذول کی ان میں کرشن چندر ایک خاص نام ہے۔

کرشن چندر ترقی پسند تحریک سے حد درجہ متاثر تھے۔ وہ جس زمانے میں مصروف بہ تحریر تھے اس وقت ایک طرف مغربی سامراج کی زور زبردستی اور مظالم کا ماحول تھا اور دوسری طرف ہندوستانیوں کے لہو میں انقلاب کی حد درجہ حرارت موجود تھی۔ وہ تقسیم وطن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی لوٹ مار، کشت و خون، عصمت دری اور قتل و غارت کے چشم دید گواہ تھے۔ انھوں نے ہجرت کے ناقابلِ فراموش اور گہرے زخم بھی دیکھے تھے اور روحانی عذاب میں مبتلا کرنے والے دیگر حادثات بھی۔ ان حالات کے زیر اثر کرشن چندر نے جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں تقسیم وطن کے حالات پر واویلا بھی ہے اور یکجہتی کے لیے مودبانہ اپیل بھی۔ اس سلسلے میں 'امرتسر آزادی سے پہلے اور امرتسر آزادی کے بعد' اُن کی ایک مشہور کہانی ہے۔ یہ کہانی دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ ملک کے امن اور ہندو مسلم اتحاد کی عکاسی کرتا ہے جب کہ دوسرا حصہ تقسیم وطن کے بعد رونما ہونے والے خونی واقعات کی منظر کشی کرتا ہے۔ پہلے حصے میں کرشن چندر نے اُس پنجاب کی تصویر کھینچی ہے جب ہندو، مسلم اور سکھ، اتحاد اور اتفاق کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ تینوں مذاہب کے لوگ انگریزی کے تسلط سے نجات پانے کے لیے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ کہانی جلیانوالہ باغ کے اس تاریخی سانحہ کو بیان کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ جب جنرل ڈائر نے ہزاروں ہندوستانیوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ چنانچہ آزادی کی طلب اور چاہت ہر ہندوستانی کے دل میں موجزن تھی۔ ملک کے طول و عرض میں جلسوں کا انعقاد ہوتا تھا جہاں آزادی کے علمبردار تحریک کا لائحہ عمل پیش کرتے تھے۔ جلیانوالہ باغ کا تاریخ ساز جلسہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ جلسے میں اطراف و اکناف سے آنے والوں میں ہندو، سکھ اور مسلمان شامل تھے۔ تحریک کے قائد یکے بعد دیگرے تقریر کرنے میں مصروف تھے،

انگریزی افواج نے تینوں اطراف سے جلسہ گاہ کو گھیر رکھا تھا۔ مقررین اور سامعین دونوں جذبۂ آزادی سے مخمور تھے کہ انگریزی افواج نے جلسہ گاہ پر اندھادھند گولیاں چلائیں۔ جلسہ گاہ آناً فاناً لاشوں کے ڈھیر میں بدل گیا۔ دو پڑوسی صدیق اور اُوم پرکاش بھی جلسہ گاہ میں قائدین کی تقاریر سننے میں مشغول تھے۔ اُوم پرکاش گولی لگنے سے ایک دم زمین پر گر پڑا۔ صدیق جوں ہی اُس کو اٹھانے کے لیے جھکا تو دوسری گولی اس کی ٹانگ میں پیوست ہوگئی۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں اُوم پرکاش کو بچانے کے لیے صدیق نے اپنے جسم کو اس کے لیے ڈھال بنادیا۔ پھر دونوں زخمی حالت میں خود کو گھسیٹتے گھسیٹتے دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ دیوار کے ساتھ لگ کر صدیق جانوروں کی طرح نیچے زمین پر ٹک گیا اور اُوم پرکاش کو پیٹھ پر چڑھ کر دیوار پھاندنے کی تاکید کی۔ اُوم پرکاش نے عمل کیا اور دیوار پھاندنے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر صدیق نے بھی پوری طاقت لگا کر دیوار پھاندنے کی کوشش کی کہ ایک اور گولی اس کی ٹانگ میں لگ گئی۔ اور اسی حالت میں وہ دوسری جانب زخمی اوم پرکاش پر گر پڑا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ اوم پرکاش دم توڑ چکا تھا۔ اس کی اُنگلی میں سونے کی ایک قیمتی انگوٹھی اور جیب میں دو ہزار روپے موجود تھے۔ صدیق نے سونے کی انگوٹھی اور دو ہزار روپے بطور امانت اپنے پاس رکھے۔ اُس کی دونوں زخمی ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اسی حالت میں اس نے اوم پرکاش کی لاش کاندھوں پر اٹھا کر اُس کے گھر پہنچادی۔ صدیق نے اُوم پرکاش کی انگوٹھی اور دو ہزار روپے اس کے افراد خانہ کے سپرد کیے اور خود بھی وہیں پر دم توڑ بیٹھا۔ اس طرح صدیق سرزمین ہند پر قومی یکجہتی کا جھنڈا گاڑ کر نہ صرف حب الوطنی کا ثبوت دیتا ہے بلکہ تمام ہندوستانیوں کو اتحاد اور اتفاق کا پیغام بھی سناتا ہے۔ کہانی کے پہلے حصے میں کرشن چندر نے عورتوں میں پائے جانے والے جذبہ یکجہتی کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے۔ تحریک آزادی کا جنون کم کرنے کے لیے انگریزی فوج بار بار کرفیو نافذ کرتی تھی۔ اس دوران ایک بار امرتسر میں حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے کرفیو کی باری آگئی۔ مختلف مذاہب کے ساتھ تعلق رکھنے والی چار عورتیں دو مسلمان، ایک ہندو اور ایک سکھ کرفیو نافذ ہونے سے پہلے سبزی خریدنے کی غرض سے بازار گئی تھیں۔ کرفیو نافذ ہونے سے چند ہی منٹ پہلے وہ جلدی جلدی اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگیں۔ جس گلی سے ان کو گذرنا تھا وہاں انگریزی فوج پہرہ دے رہی تھی۔ ایک فوجی نے چاروں عورتوں کو روک کر یونین جیک کو سلام کرنے کو کہا۔ انھوں نے سراسیمگی کے عالم میں سلام کے لیے ہاتھ اوپر کیے۔ اب فوجی نے ان کو گھٹنوں کے بل چل کر گلی سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ یہ ہتک آمیز حکم سن کر چاروں عورتیں آگ بگولہ ہوئیں اور چاروں نے یک زبان ہوکر حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کیا۔ فوجی نے حکم بجانہ لانے پر عبرتناک سزا بھگتنے کے لیے تیار رہنے کو کہا۔ مسلمان عورت زینب نے بڑی ہٹ دھرمی سے حکم ماننے سے پھر انکار کیا۔ سکھ عورت شام کور سینہ تان کر گلی سے چلنے لگی۔ فوجی آپے سے باہر ہوگیا اور گولی چلا کر شام کور کو ڈھیر کردیا۔ زینب اور بیگم بھی گھٹنوں کے بل گر گئیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور گلی سے چلنے لگیں۔ فوجی نے پھر یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلائیں اور دونوں گر گئیں۔ پاروا کیلی کھڑی ہوکر رورہی تھی کہ فوجی نے ہمدردانہ لہجے میں اُسے حکم ماننے کی تاکید کی۔ پارو نے بڑی ہمت کرکے فوجی کے منہ پر تھوکا۔ انتقامی جذبے نے فوجی کو اور اندھا کردیا، اس نے پارو پر گولی چلا کر اسے بھی گرادیا۔

''پارو، زینب بیگم، شام کور، گھر کی عورتیں، پردے دار خواتین، عفت مآب بیبیاں، اپنے سینوں میں اپنے خاوندوں کا پیار اور اپنے بچوں کی ممتا کا دودھ لیے، ظلم کی اندھیری گلی سے گذر گئیں۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی ہوگئے لیکن ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ اُس وقت کی محبت نے پکارا ہوگا۔ کسی کے ننھے بازوؤں کا بُلاوا آیا ہوگا، کسی کی کہانی سے مسکراہٹ دکھائی دی ہوگی۔ لیکن اُن کی روحوں نے کہا نہیں آج تمھیں جھکنا نہیں ہے۔ آج صدیوں کے بعد وہ لمحہ آیا ہے جب سارا ہندوستان جاگ اٹھا ہے اور سیدھا تن کر اس گلی سے گذر رہا ہے۔ سر اٹھائے آگے بڑھ رہا ہے۔ زینب، بیگم، پارو، شام کور۔ کس نے کہا اس ملک سے سیتا مرگئی ہے؟ کس نے کہا اب اس دیس میں ستی ساوتری پیدا نہیں ہوگی؟ آج اس گلی کا ذرہ ذرہ کسی کے قدوسی لہو سے روشن ہے۔ شام کور، زینب، پارو، بیگم۔ آج تم خود اس گلی سے سر اونچا کرکے نہیں گذری ہو۔ آج تمھارا دیس فخر سے سر اٹھائے اس گلی سے گذر رہا ہے۔ آج آزادی کا اونچا جھنڈا اس گلی سے گذر رہا ہے۔ آج تمھارے دیس، تمھاری تہذیب، تمھارے مذہب کی قابلِ احترام روایتیں زندہ ہوگئی ہیں۔ آج انسانیت کا سر غرور سے بلند ہے۔ تمھاری روحوں پر ہزاروں لاکھوں سلام''۔

'بالکونی' دنیا کے مشہور سیاحتی مقام گلمرگ سے متعلق ایک کہانی ہے۔ گلمرگ کے ایک ہوٹل 'فردوس' میں کئی سیاح قیام پذیر ہیں۔ ان کا تعلق مختلف مذاہب سے ہے۔ ان کا رنگ، تہذیب وتمدن، رہن سہن، بول چال، خورد ونوش، ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن سب کے سب فقط سکونِ قلب اور اطمینان پانے کے لیے گلمرگ آئے ہیں اور ہوٹل فردوس سے سورج غروب ہونے کا دلکش منظر دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہ سارے سیاح شہروں کی مصروف زندگی سے اکتائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی بلا امتیاز مذہب وملت، رنگ ونسل ہوٹل فردوس کی بالکونی سے شفق کا نظارہ کرکے سکون پاتے ہیں۔ کرشن چندر دنیا کو اسی بالکونی کی طرح دیکھنے کے متمنی ہیں جہاں لوگ اطمینان کے ساتھ زندگی کے مختصر ایام گذار سکیں۔ ہوٹل کے کمرہ نمبر 7 میں اطالوی باپ بیٹی قیام پذیر ہیں۔ باپ خوبصورت چھڑیاں بنانے میں ماہر ہے جب کہ اس کی بیٹی میریا کو پیانو بجانے کا کافی ذوق وشوق ہے۔ دونوں کو جنگ سے نفرت ہے اور امن سے پیار۔ وہ اتحاد اور اتفاق کے ساتھ زندگی گذارنے کے آرزومند ہیں۔ میریا واپس اپنے ملک جاکر جنگ کے مضر اثرات کے خلاف امن اور اتحاد کی وکالت کرنے کی متمنی ہے۔

''پھر وہ بولی...... جنگ کے بعد میں اپنے وطن واپس چلی جاؤں گی۔ وہاں اشتراکی پارٹی میں شامل ہوکر سیاسی کام کروں گی۔ پیانو بجانے سے کام نہ چلے گا۔ یہ کم بخت جنگ ختم ہوجائے۔ پھر ہم سب مل کر پوری کوشش کریں گے کہ جنگ دوبارہ نہ ہو کیوں ٹھیک ہے نا''؟

میں نے کہا ''مجھے ساتھ لیتی چلوگی''؟

''ضرور'' وہ مسرت بھرے لہجے میں بولی ''ہمارا گاؤں لومبارڈی میں ہے وہاں انگور کی بیلیں ہیں اور شہتوت کے درخت اور کھیتوں کے کنارے لائم کے پیڑ۔ تب تک میرا بھائی بھی آزاد ہوجائے گا۔ پھر ہم سب مل کر کھیت بوئیں گے اور ریشم کے کوے اکٹھا کریں گے اور پاپا کو ایک اونچی سی کرسی پر بٹھا کر اصلی اطالوی شراب پلائیں گے اور کبھی...... کبھی جنگ نہ ہونے دیں گے''

(کرشن چندر اور ان کے افسانے، اطہر پرویز، ص 241)

کرشن چندر 'بالکونی' کی وساطت سے امن، محبت، ہمدردی اور بھائی چارہ کی اپیل کرتے ہیں۔ وہ دنیا میں اُسی اخوت اور سکون کے طلبگار ہیں جس کی لذت وہ ہوٹل فردوس کی بالکونی سے حاصل کررہے ہیں۔ بالکونی سے کئی یکجا بیٹھ کر بلا لحاظ مذہب وملت شفق کے دلکش منظر سے محظوظ ہوتے ہیں:

''بالکونی ایک نقطۂ بہار ہے جس کے قریب، رفاقت،

محبت، امن، دوستی، خوش حالی اور مسائل زندگی نے ایک دائرہ بنادیا ہے۔ بالکونی میں کھڑے ہوکر ہر آنکھ ایک ہی کیف، ایک ہی لذت، ایک ہی جوش اور سرمستی محسوس کرتی ہے۔ دنیا کے انسانوں کو ایک ایسی بالکونی عطا کردی جائے جس میں کوئی فرقہ، ذات پات، جنگ، چاپلوسی، خودغرضی، ہوس پرستی، چوری، ڈاکہ زنی، نفرت اور حیوانیت نہ ہو۔ ایک ایسی بالکونی ہو جس میں عبداللہ جیسے بہشتیوں کا سنہرا خواب ہو، اوبرائن کا زندگی کا منفی فلسفہ نہ ہو۔ جنس کا شہوت انگیز روپ نہ ہو، عورت کا احترام اور محبت کا نغمہ ہو، پرامید مستقبل ہو، ماضی کا نوحہ نہ ہو اور حال کی افراتفری نہ ہو۔ ایسے جذبۂ عالمگیر کو ظلمت اور انتشار کی گلیوں میں جس طبقے نے بھٹکنے پر مجبور کردیا ہے وہ سرمایہ دار اور سیاست داں ہیں جن کی نگاہوں میں محبت بھی تجارت ہوتی ہے۔ بالکونی وہ آنکھ ہے جس سے انسان محبت کی شفق کو دیکھ کر اپنی روح میں محسوس کرسکتا ہے۔'' (ایضاً، ص141)

'کالو بھنگی' کا مرکزی کردار کالو ہندوستان کے ہریجن طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ پیشے سے بھنگی ہے اور ڈسپنسری کے اندر مریضوں کا بول و براز صاف کرتا ہے۔ فنائیل چھڑکتا ہے، ڈاکٹر اور کمپونڈر کے بنگلوں میں جھاڑو لگاتا ہے۔ وہ ڈاکٹر کی گائے اور کمپونڈر کی بکری کو جنگل میں چرانے لے جاکر شام کو واپس آکر خود کھانا بناتا ہے اور سوجاتا ہے۔ کالو بھنگی پیار و محبت، ایثار و قربانی اور ہمدردی کا مجسمہ ہے۔ گائے، بکری اور لنگڑے کتے جیسے حیوانوں کے ساتھ گہرے تعلقات بڑھانے میں کامیاب ہوتا ہے لیکن وہ خود سماج میں محض اس لیے ٹھکرایا گیا ہے کیونکہ وہ ہریجن ہے اور بھنگی کا کام کرتا ہے۔ وہ چھوت چھات کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ وہ کہانی کار سے بار بار اپنے بارے میں ایک کہانی تحریر کرنے کی درخواست کرتا ہے لیکن کہانی کار کہانی لکھنے سے محض اس لیے معذوری کا اظہار کرتا ہے کہ کالو بھنگی کی زندگی میں کوئی رنگا رنگی نہیں ہے۔ وہ شادی سے محروم ہے کیونکہ علاقے میں اس کی ذات کا کوئی خاندان موجود نہیں ہے اور دوسری ذات کے خاندان میں وہ شادی نہیں کرسکتا ہے۔ وہ شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کا بے حد شوقین ہے لیکن سماجی امتیاز نے اس کے خواب کو شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی سماج میں چھوت چھات کے مرض کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ہریجنوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ کیا جاتا ہے جو ملک کی سلمیت کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ لہٰذا کرشن چندر کے مطابق ہریجنوں کو اپنانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ملک کی بہبودی اور بہتری کا راز رواداری، اخوت اور بھائی چارہ میں مضمر ہے۔ کالو بھنگی جیسے کروڑوں ہریجنوں کو اپنانے کے لیے ملک کے ہر طبقے کو پیار و محبت، اخوت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کی ضرورت ہے۔ کرشن چندر اس بات کے معترف ہیں کہ ملک کے بڑے بڑے مسائل فقط اتحاد اور اتفاق کے ساتھ حل کیے جاسکتے ہیں:

''میں ایک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں۔ ایک نیا انسان نہیں گھڑ سکتا۔ اس کے لیے میں اکیلا کافی نہیں ہوں۔ اس کے لیے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا اور ڈاکٹر کمپونڈر اور بختیار اور گاؤں کے پٹواری اور نمبردار اور دوکاندار اور حاکم اور سیاستدان اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے ہر شخص کی لاکھوں، کروڑوں، اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کرسکوں گا۔ جب تم ہم مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے، یہ کام نہ ہوگا، اور تو اسی طرح جھاڑو لیے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت تعمیر نہ کرسکے گا جس میں تمھاری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھولے اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔''

(فنکار کرشن چندر، محمد غیاث الدین، ص91)

کہانی 'موبی' کا مرکزی کردار ایک امریکی فوجی ہے جسے ہندوستانی تہذیب اور کلچر کے ساتھ نفرت ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو خودغرض، بزدل، ڈرپوک اور لالچی قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں ہندوستان کے لوگ چھوٹا سا تحفہ دے کر بڑے تحفے کی توقع رکھتے ہیں۔ ایک دن جب سانپ امریکی فوجی موبی کو ڈس لیتا ہے تو اس کی زندگی خطرے میں پڑجاتی ہے لیکن ایک ہندوستانی لڑکی موہنی ایک دم اس کے جسم سے سانپ کا زہر چوس کر اُسے نئی زندگی عطا کرتی ہے۔ موہنی کے اس جذبۂ ایثار اور قربانی کو دیکھ کر موبی حیران ہوجاتا ہے اور ہندوستانیوں سے متعلق اپنی آراء کو یکسر بدل دیتا ہے۔ موبی اپنی غلط سوچ پر شرمندہ بھی ہے اور پریشان بھی۔ صحت یاب ہونے کے بعد موبی کو جنگ میں حصہ لینے کے لیے آسام بھیجا جاتا ہے جہاں وہ گولی لگنے سے موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ مرنے سے پہلے موبی نے جو خط اپنی ماں کو لکھا ہے اس میں وہ موہنی کے جذبہ ایثار کا ذکر بڑے پیار و محبت اور خلوص کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ موبی کی ماں کو اس قدر متاثر کرتا ہے کہ وہ دل ہی دل میں موہنی کو اپنی بیٹی تسلیم کرتی ہے۔ موبی کے خط کا حوالہ دے کر اس کی ماں جو خط ہندوستان بھیجتی ہے اس میں وہ موہنی کے مثبت کردار کا ذکر کرکے اس بات کی خواہش ظاہر کرتی ہے کہ یہ ساری دنیا موہنی کی طرح نفرت کا زہر باہر نکال کر کے محبت کا امرت بھردے:

''جس روز موہنی نے اس کے ٹخنوں سے زہر چوس لیا تھا اُسے معلوم ہوا گویا موہنی نے یہ زہر اس کے جسم سے نہیں اس کی روح سے چوس کر نکال دیا۔ وہ زہر جو کالے کو گورے سے، غریب کو امیر سے اور آدمی کو آدمی سے جدا رکھتا ہے۔ اس وقت اُسے معلوم ہوا کہ محبت ہر خوبصورت انسانی سماج کی پہلی اور آخری شرط ہے اور اس کے بغیر دنیا میں کوئی انسانی سماج تادیر پنپ نہیں سکتا۔ وٹھلواری گھاٹی پر اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ محبت کا کوئی رنگ نہیں ہوتا، کوئی ملک نہیں ہوتا، کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کا آخری اور ابدی آدرش ہے۔ اس کا خط پڑھ کر آج مجھے پھر اس عظیم درد کا احساس ہو رہا ہے جیسے میں نے اپنے بیٹے کو پہلی بار جنم دیا ہے۔'' (موبی، کرشن چندر)

'موبی' میں کرشن چندر بین الاقوامی سطح پر محبت کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ کہانی کے دونوں کردار دو الگ الگ ملکوں یعنی امریکہ اور ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ دونوں کی تہذیب، رنگ و نسل، بول چال، رہن سہن، ثقافت اور سیاست میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے لیکن موہنی کے ہاتھوں موبی کے جسم سے سانپ کا سارا زہر چوسنے کے بعد امتیاز کی ساری سرحدیں مٹ جاتی ہیں اور خالص انسانی محبت اور رواداری کا بول بالا ہوجاتا ہے:

''موبی کا کردار رنگ، نسل، مذہب، زبان، تہذیب اور ذات سے بالاتر ہے۔ موبی عالمی محبت کی علامت ہے۔ محبت جو نفع و نقصان سے ہمیشہ بالاتر ہوتی ہے۔ محبت جو انسان اور انسان کے دلوں کو دیکھتی ہے۔ موبی عالمی امن دوستی اور محبت کی طرف بلیغ اشارہ ہے۔''

(فنکار کرشن چندر، محمد غیاث الدین، ص112)

'کرم داد اور کرم چند' قومی یکجہتی سے متعلق کرشن چندر کا ایک مشہور افسانہ ہے۔ کہانی کے شروع میں فرقہ وارانہ فسادات کے منفی اور مضر نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کرشن چندر نے فرقہ وارانہ فسادات کی بڑی شدت سے مذمت کی ہے۔ چنانچہ فرقہ وارانہ فسادات ہندوستان جیسے عظیم ملک کے لیے سمِ قاتل ہیں لہٰذا مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، مذکورہ کہانی میں عوام کے مابین بھائی چارہ قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

■

Dr. Abdur Rashid Khan , HOD Urdu,
GDC Beerwah
Budgam -193411 (J&K)

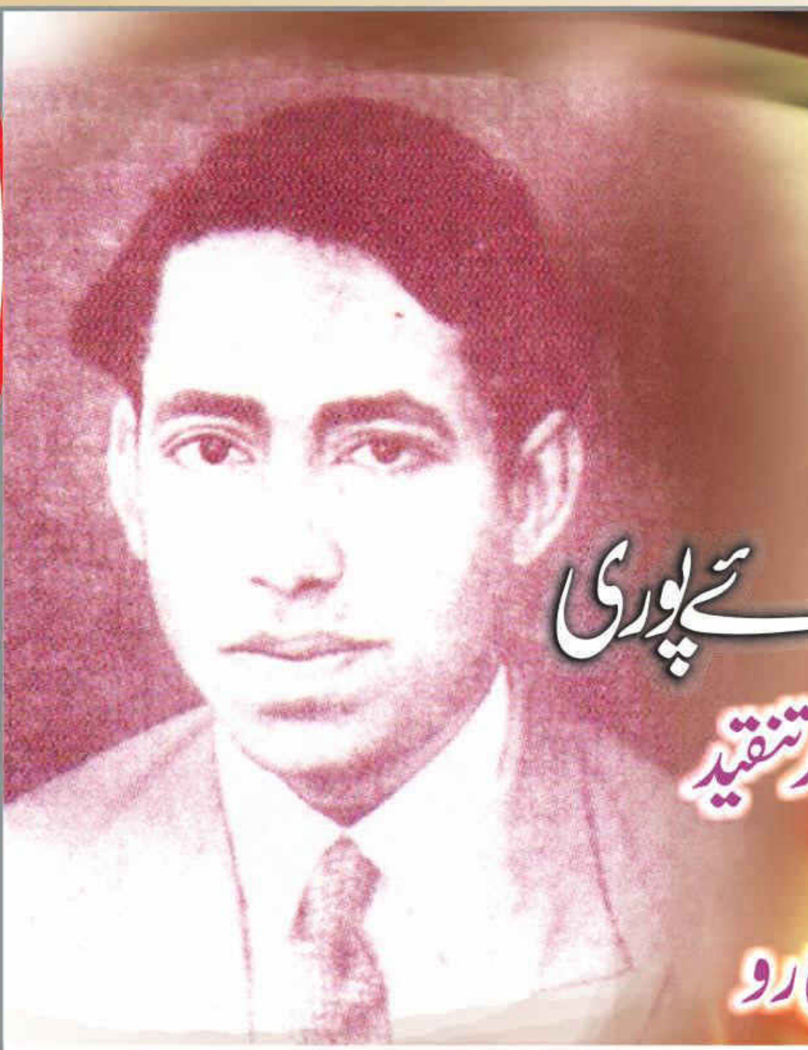

مخمور صدری

اختر حسین رائے پوری
ترقی پسند تنقید کے پیش رو

اختر حسین رائے پوری (1912-1992) کا شمار انجمن ترقی پسند مصنّفین کے معماروں میں ہوتا ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے پہلے باضابطہ نقاد ہیں۔ اردو میں اشتراکی تنقید کا آغاز بھی ان ہی کے ذریعے ہوا۔ ان کے ادبی کارناموں کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ وہ ایک افسانہ نگار، تنقید نگار، مبصر، لغت نویس اور مترجم تھے۔ اختر حسین رائے پوری کے ادبی سفر کا آغاز ہندی افسانہ 'پراجت' (1928) سے ہوا تھا۔ ان کی اردو تخلیقات میں افسانہ نگاری کو اولیت حاصل ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے 'محبت اور نفرت' (1938) اور 'زندگی کا میلہ' (1956) منظر عام پر آئے۔ تنقید میں 'ادب اور انقلاب' (1943) 'سنگ میل' (1949) 'روشن مینار' (1956) اور خودنوشت 'گردِ راہ' (1984) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اختر حسین رائے پوری کو اردو، ہندی، فارسی، بنگالی، گجراتی اور سنسکرت کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی پر بھی عبور حاصل تھا۔ انھوں نے 1939 میں کالی داس کی 'شکنتلا' کا ترجمہ سنسکرت سے اور قاضی نذرالاسلام کی نظموں کا ترجمہ 1940 میں بنگلہ سے 'پیام شباب' کے نام سے کیا۔ (جو رسالہ 'نگار' میں شائع ہوئے تھے۔) عزیز احمد کے تعاون سے فرانس کے مستشرق گارساں دتاسی کے سالانہ جائزوں کا ترجمہ بھی کیا۔ پرل ایس بک کے ناول 'گڈ ارتھ' کا ترجمہ 'پیاری زمین' (1941) کے نام سے کیا۔ روسی مصنف میکسم گورکی کی آپ بیتی کا ترجمہ 'میرا بچپن' (1941) 'روٹی کی تلاش' (1943) 'جوانی کے دن' (1945) ان کے اہم تراجم ہیں۔

اختر حسین رائے پوری کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد نوجوانی میں ہی ہندوستان کی فرسودہ روایات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ جب ان کا مضمون 'ادب اور زندگی' شائع ہوا تو ترقی پسند نقطہ نظر کا بنیادی مضمون تسلیم کیا گیا۔ سجاد ظہیر نے اسی مضمون کی وجہ سے اختر حسین رائے پوری کو اردو کی ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار کیا لیکن اپنی منصبی و دفتری ذمے داریوں کی وجہ سے انجمن سے اختر کا گہرا تعلق کبھی نہیں رہا۔ سجاد ظہیر نے بھی اختر کی انجمن ترقی پسند مصنّفین سے لاتعلقی کے حوالے سے ملال کا اظہار کیا تھا کہ ''وہ بھی اب بڑے ادیبوں کے زمرے میں آ گئے ہیں۔ کچھ نجی مالی مشکلات اور کچھ دنیا میں ترقی کرنے کی خواہش انھیں ترقی پسند ادب کی مشکل ذمے داریوں سے دور کھینچتی جا رہی ہے۔''[1]

یہی نہیں بلکہ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت قبول کرنے پر سجاد ظہیر نے سخت ناراضگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس انجمن کی حیدرآباد دکن میں شاخ اختر حسین رائے پوری نے ہی قائم کی تھی۔ اس کا اجلاس بھی ان کے گھر پر منعقد ہوا تھا اور صدارت مسز سروجنی نائیڈو نے کی تھی۔ 1946 میں انجمن کی دہلی شاخ کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ پھر پاکستان منتقل ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد جب انجمن ترقی پسند مصنّفین سے سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری اور ممتاز شیریں جیسے ادیبوں کو راندہ درگاہ کیا گیا تو ان میں اختر حسین رائے پوری کا نام بھی شامل تھا۔ لاہور ترقی پسند کانفرنس میں انھیں شرکت کی دعوت نہیں ملی۔ انجمن کا یہ متنازعہ اجلاس احمد ندیم قاسمی کے رہائش کدہ پر ہوا تھا اور وہ اس انجمن

کے سکریٹری جنرل تھے۔لیکن جب 1986 میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی کراچی میں منائی گئی تو اس کے ایک جلسے کی صدارت اختر حسین رائے پوری نے کی لیکن احمد ندیم قاسمی کو شرکت کی دعوت ہی نہیں دی گئی۔ انھیں لندن اور لکھنؤ کے گولڈن جوبلی جلسوں میں بھی مدعو کرنے سے گریز کیا گیا۔یہ ساری باتیں میں نے اس لیے پیش کی ہیں کہ ترقی پسند تحریک کے بعض ادباء ڈھلمل یقین تھے لیکن ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے نظریات، ان کے گہرے مطالعے اور ذاتی سوچ کا نتیجہ تھے۔ان کا اجتہادی زاویہ ان کی فطرت اور کردار کا حصہ تھا اور ادب کے تمام حلقوں میں وہ ہمیشہ عزت ووقار کی نظر سے دیکھے گئے۔وہ کسی مخصوص نظریات سے بندھے ہوئے نہیں تھے۔طاہر مسعود کو دیے گئے ایک انٹرویو میں اختر حسین نے کہا تھا کہ ''درحقیقت میں نے کبھی خود کو ترقی پسند نہیں کہا اور نہ ہی کبھی اس کا لیبل لگایا۔''[2]

ترقی پسند ادبی تحریک کے آغاز (1936) سے ایک سال قبل اختر حسین رائے پوری نے ہندی میں ایک مضمون 'ساہتیہ اور کرانتی' کے عنوان سے ہندی کے ماہنامے وشوامتر، کلکتہ، اپریل 1933 میں لکھا تھا۔ پھر 'ادب اور زندگی' کے عنوان سے انھوں نے ایک طویل معرکتہ الآرا مضمون تحریر کیا۔ جس کو مولوی عبدالحق نے اپنے رسالہ 'اردو'، اورنگ آباد، جولائی 1935 میں شائع کیا۔مولوی عبدالحق نے نہ صرف یہ کہ اس مضمون کو رسالہ 'اردو' میں اہتمام کے ساتھ جگہ دی بلکہ اس کی زائد کاپیاں بنوا کر نئے سرورق کے ساتھ اسے کتابی صورت میں اسی سال انجمن ترقی اردو سے شائع کیا جسے اپنے زمانے کی 'بوطیقا' سمجھا جاتا تھا۔اس میں شک نہیں کہ یہ ادب میں پہلی انقلاب آفریں کوشش تھی۔[3] اس کی اشاعت سے ادبی حلقوں میں ایک، ہلچل مچ گئی اور اس دور کے نوجوانوں کے لیے وہ ایک تنقیدی صحیفہ بن گیا۔[4] اس مضمون میں ''انھوں نے ادبی مسائل کا نئے نقطہ نظر سے مطالعہ کیا تھا اور قدیم اردو ادب کی خامیوں اور کوتاہیوں پر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔''[5] پروفیسر صادق لکھتے ہیں:

''اختر حسین رائے پوری کا ایک مضمون 'ساہتیہ اور کرانتی' کلکتہ سے شائع ہونے والے ایک ہندی ماہنامہ 'وشوامتر' کے اپریل 1933 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس مضمون کا ترجمہ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ 'ادب اور زندگی' کے عنوان سے رسالہ 'اردو' کے جولائی 1935 کے شمارے میں شائع ہوا جو کہ نئے اور پرانے لکھنے والوں میں بحث کا موضوع بن گیا تھا۔اس مضمون میں روایتی اور

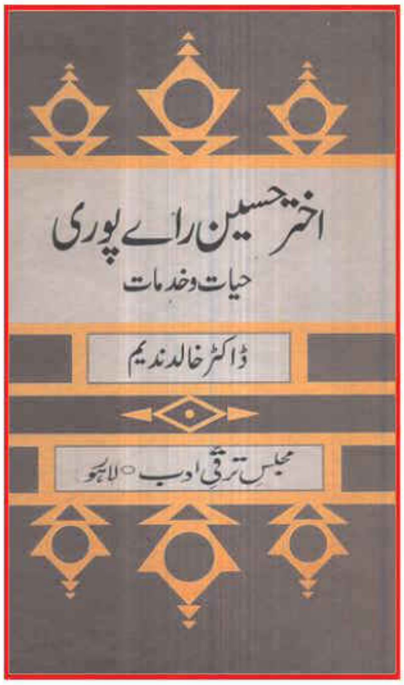

تقلیدی ادب کی بے بصری اور بے بضاعتی کو اجاگر کرتے ہوئے نئی جہتوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔''[6]

مجنوں گورکھپوری کا مضمون 'ادب اور زندگی' 1938 کی تحریر ہے۔اس لحاظ سے ادب اور زندگی کے موضوع پر اور ترقی پسندی کے باب میں اختر حسین رائے پوری کی حیثیت پیش روکی ہے۔ان کا اولین مقالہ 'ادب اور زندگی' ترقی پسند تنقید کا نقطہ آغاز ہے۔سجاد ظہیر نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ'' 1936 یا اس سے کچھ پہلے اختر حسین رائے پوری نے اپنا مشہور مضمون 'ادب اور زندگی' لکھا، جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالے 'اردو' میں شائع ہوا۔ میرے خیال میں یہ ہماری زبان میں پہلا مضمون ہے جس میں مبسوط اور مدلل طریقے سے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق کی ضرورت بتائی گئی ہے۔اس اہم مضمون کے مصنف کی حیثیت سے اختر حسین رائے پوری کو اردو کے ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں اولیت حاصل ہے۔''[7]

اس وقت تک اردو میں سائنٹفک یا مارکسی تنقید نگاری کی بنیاد نہیں پڑی تھی۔ اختر حسین رائے پوری کا یہ مقالہ 'ادب اور زندگی' اردو کا پہلا مقالہ تھا۔جس میں ادب وفن کا اقتصادی بنیاد پر جائزہ لیا گیا تھا اور شعر وادب کی بالکل نئی تعبیر پیش کی گئی تھی... اس لحاظ سے ان کے مقالے کی تاریخی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس عہد کی اردو تنقید کے پس منظر میں اس مقالے کو دیکھیے تو آپ کو اردو ادب میں یہ بالکل نئی آواز اور ایک انقلابی انداز فکر نظر آئے گا۔[8]

1943 میں جب ان کی کتاب 'ادب اور انقلاب' شائع ہوئی تھی تو ناشر نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خواجہ حالی کے 'مقدمہ شعروشاعری' کے بعد کسی تحریر نے اردو کے شعبہ تنقید کو اس حد تک متاثر نہیں کیا۔ 'ادب اور زندگی' کی اشاعت کے بعد اس موضوع پر بے شمار مضامین شائع ہوئے اور اس تحریک نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی صورت منظّم شکل اختیار کر لی۔ یہ امر ناقابل تردید ہے کہ یہ سب اسی حرف اول کی مختلف تفسیریں ہیں۔

اختر حسین رائے پوری نے ادب اور زندگی کے موضوع کو سب سے پہلے اردو داں طبقے سے روشناس کرایا اور ساہتیہ پریشد، ناگپور کے اجلاس کے ذریعے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ 1936 سے پہلے ترقی پسندی کی تحریک چلائی۔ کیونکہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا ناگپور اجلاس اپریل 1936 میں لکھنؤ کانفرنس سے کچھ دن پہلے ہوا تھا۔اس لحاظ سے اختر حسین رائے پوری کو ہندی اور اردو زبانوں میں ترقی پسند ادب کا پہلا مجتہد قرار دیا جاتا ہے۔

اختر حسین رائے پوری کا مضمون 'ادب اور زندگی' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'ادب اور انقلاب' میں شامل ہے۔اس مجموعے میں وہ اعلان نامہ بھی ہے جو ساہتیہ پریشد ناگپور کے اجلاس 24/25 اپریل 1936 میں پیش کیا گیا تھا۔ بھارتیہ پریشد ناگپور اپریل 1936 کے اعلان نامے اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کے پہلے مینی فیسٹو (اجلاس لکھنؤ 10/اپریل 1936) کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔

اختر حسین رائے پوری کی طرف سے پیش کردہ اس مینی فیسٹو پر ان کے علاوہ جواہر لال نہرو، پریم چند، اچاریہ نریندر دیو اور مولوی عبدالحق کے دستخط تھے۔اس مینی فیسٹو سے ہم کو ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے مینی فیسٹو کو مدنظر رکھ کر تیار کیا گیا تھا۔ بلکہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لندن، لکھنؤ (پہلی کانفرنس) میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام سے پہلے ہی ہندستانی ادیبوں اور دانشوروں میں اس کی ضرورت کو محسوس کیا جانے لگا تھا۔مختلف شواہد سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ لندن میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام سے پہلے ہی ہندوستان میں اس کی تشکیل ہو چکی تھی۔ جبکہ ''عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کا قیام پہلے پہل لندن میں عمل میں آیا لیکن احمد علی نے اپنے ایک مضمون 'تحریک ترقی پسند مصنّفین اور تخلیقی مصنف' میں اس حقیقت کا

اظہار کیا ہے کہ لندن میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام سے پہلے 1933 میں ہندوستان میں اس کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔[9]

احمد علی کا یہ بیان اپنی جگہ اہم ہے اس لیے کہ وہ ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ ''لیکن ترقی پسند مصنّفین کا جو تصور سجاد ظہیر کے ذہن میں تھا وہ اس سے بہت مختلف تھا۔ سجاد ظہیر ترقی پسند مصنّفین کی ایک ایسی کل ہند انجمن قائم کرنا چاہتے تھے جس کی ترویج ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہو اور یہ کل ہند انجمن، ترقی پسندوں کے اس بین الاقوامی مرکز سے ملحق ہو جو کہ پیرس میں قائم کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ دونوں کے راستے مقاصد اور دائرہ کار مختلف تھے۔''[10]

بھارتیہ پریشد کے اس اعلان نامے میں جن اغراض ومقاصد کو سامنے رکھا گیا ہے، تقریباً انجمن ترقی پسند مصنّفین نے اپنے پہلے مینی فیسٹو (پہلی کانفرنس لکھنؤ 10/اپریل 1936) میں انھی خیالات کا اظہار کیا تھا ان میں سے کچھ یہ ہیں:

''ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے اور زندگی کے حقائق سے گریز کر کے کھوکھلی رومانیت اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھونڈھ رہا ہے جس کے باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا ہے.... ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں۔''[11]

اگر ہم دونوں کے اعلان ناموں کا موازنہ کریں تو دونوں کے اغراض و مقاصد میں زیادہ فرق نظر نہیں آئے گا۔ دونوں کے منشوروں کا لب و لہجہ ایک جیسا ہے۔ کیونکہ دونوں ادب کو زندگی کا ترجمان مانتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس اعلان نامہ کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ جس اجلاس میں پڑھا گیا تھا اس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیب ملک کے گوشے گوشے سے اکٹھا ہوئے تھے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند خیالات کو اختر حسین رائے پوری کی وجہ سے صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ ملک کی دیگر زبانوں میں بھی فروغ پانے کا موقع ملا۔

اختر حسین رائے پوری نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے انقلابی ادب کے تصور کو اردو ادب میں واضح طور پر پیش کیا۔ اپنے مضامین سے ترقی پسند تحریک اور اس کی نشوونما کے لیے زمین تیار کی۔ انھوں نے اپنے وقت کے تاریخی تقاضوں کے پیش نظر ادب میں ایک نئی فکری جہت کی نشاندہی کی اور وہ جہت تھی زندگی کے سماجی اور

ادب زندگی کاآئینہ دار ہے۔ ادب اپنے گردوپیش سے متاثر ہوتا ہے کسی ادیب کی روح کوسمجھنے کے لیے اس فضاکو سمجھنا ضروری ہے جس میں اس نے پرورش پائی۔ ادب ماضی، حال، مستقبل میں رشتہ جوڑتاہے۔ رنگ ونسل اورملک و قوم کی بندشوں کو توڑکربنی نوع انسان کووحدت کا پیغام سناتا ہے.... ادب زندگی سے عبارت ہے نہ کہ زندگی ادب سے.... اب تک ہماراادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے چارگی کانوحہ پڑھتا آیا ہے.... ادب ایک سماجی فریضہ ہے۔

تاریخی حقائق کی روشنی میں ادب وفن کو پرکھنے کی کوشش۔ یوں تو ادب کی افادیت اور اس کے سماجی وتاریخی کردار پر سب سے پہلے سرسید اور ان کے نامور رفقا نے توجہ دلائی تھی۔ مولانا حالی کی کتاب 'مقدمہ شعر وشاعری' (1893) اسی نقطہ نظر کی ترجمان ہے اور اردو ادب وتنقید پر اس کے اثرات بھی مرتب ہوئے لیکن اختر حسین رائے پوری نے جس وقت لکھنا شروع کیا اس دور میں عبدالرحمان بجنوری، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری کے تاثراتی اور رومانی اثرات اردو تنقید پر حاوی تھے۔ اختر حسین رائے پوری نے اس تاثراتی اور رومانی حصار کو توڑنے کی سعی کی ہے۔

دراصل اردو ادب میں یہی پہلا مضمون ہے ''جس میں ادب سے متعلق مارکسی طرز فکر کے مطابق خیالات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون میں لینن، ٹالسٹائی، گورکی اور رومین رولاں وغیرہ کی تحریروں کے حوالے ہیں اور ان کی روشنی میں ادب اور سماجی زندگی کے رشتے پر نظر ڈالی گئی ہے۔[12] پہلی بار ادیب کی سماجی ذمے داری اور ادب وفن کے افادی ہونے کی نوعیت کو واضح کیا گیا نیز ادیب کے فکری شعور اور اس کے آس پاس کے سماجی ماحول کے درمیان پائے جانے والے گہرے تعلق پر اس انداز سے بحث کی گئی کہ حقیقت پسندی کی طرف مائل تخلیقی ادب کو پرکھنے کے لیے اپنے وقت کا سب سے اہم فکری پیمانہ یہی مضمون ثابت ہوا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''تخلیقی ادب، معاشی زندگی کا شعبہ ہے۔ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ادب اپنے گردوپیش سے متاثر ہوتا ہے کسی ادیب کی روح کو سمجھنے کے لیے اس فضا کو سمجھنا ضروری ہے جس میں اس نے پرورش پائی۔ ادب ماضی، حال، مستقبل میں رشتہ جوڑتا ہے۔ رنگ ونسل اور ملک و قوم کی بندشوں کو توڑ کر بنی نوع انسان کو وحدت کا پیغام سناتا ہے.... ادب زندگی سے عبارت ہے نہ کہ زندگی ادب سے.... اب تک ہمارا ادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے چارگی کا نوحہ پڑھتا آیا ہے.... ادب ایک سماجی فریضہ ہے۔ ادب کی تخلیق میں دو طاقتیں کام کرتی ہیں۔ (1) ماحول (2) شخصیت۔[13]

اختر حسین رائے پوری نے اس مضمون میں مارکسی نقطہ نظر سے اردو کے قدیم ادبی سرمائے پر سخت تنقید کی اور ماضی کے اعلیٰ تخلیقی کارناموں کو رجعت پرستی کا شکار قرار دیا۔ جبکہ مارکسی نظریہ ماضی کے ادب، روایات اور ماضی کے اقدار کو یکسر ہی فراموش نہیں کرتا اور نہ ہی خارج از بحث بتلاتا ہے۔ اگرچہ ''مارکس نے ادبی، سیاسی وسماجی ارتقا کا انحصار معاشی ارتقا پر رکھا تھا۔ ساتھ ہی اس نے بعض دوسرے محرکات کی اہمیت کا اعتراف بھی کیا تھا جو ان کے ارتقا میں معاون ہوتے ہیں لیکن اختر حسین رائے پوری نے اس کے نظریات کو ادب پر منطبق کرتے وقت صرف اقتصادی ومعاشی اثرات کو ہی اہمیت دی جس کی وجہ سے ان کے یہاں ایک قسم کا انتہا پسندانہ مارکسی نظریہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدوں میں ادبی اصولوں کے بجائے سماجی ضرورتوں پر زیادہ زور نظر آتا ہے۔''[14]

اختر حسین رائے پوری نے اپنی نظری اور اطلاقی دونوں تنقیدات میں مارکسی اصولوں کو ہی پیش نظر رکھا ہے۔ اسی نقطہ نظر سے انھوں نے ہندستان کے قدیم وجدید ادب کا معاشی تجزیہ کیا ہے۔ سنسکرت، ہندی، بنگالی، گجراتی اور متعدد زبانوں کے ادب کو طبقاتی کشمکش کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور پر اردو کے کلاسیکی ادب کے جائزے میں تھوڑا تجاوز کر گئے ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی ادب کو جاگیردارانہ عہد کا زائیدہ قرار دیا۔ اس کی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ کلاسیکی شعر وادب میں سماجی زندگی کی کشمکش، زندگی کے مسائل اور ماحول کو جگہ نہیں دی گئی ہے۔ اس لیے انھوں نے ٹیگور کو فراری اور اقبال کو فسطائیت کا نمائندہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کلاسیکی ادب میں موجود قابل قدر اور عمدہ عناصر کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ لیکن جن باتوں کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے وہ کافی اہم ہیں۔ مثلاً ادب میں عصری آگہی کے فقدان پر ان کے یہ خیالات ملاحظہ ہوں:

''تمام ہندوستانی شعراء زندگی سے کتنے بے خبر اور بے پروا تھے۔ ان کے جذبات کتنے اوچھے اور احساسات کتنے بے حقیقت تھے اس کا اندازہ لگانے کے لیے چشم عبرت کی ضرورت ہے۔ پلاسی کی لڑائی کتنا بڑا قومی سانحہ

تھا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی ہندو طاقت کے لیے موت تھی۔ ٹیپو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے تنزل کا اعلان تھا اور ان سب سے اہم 1857 کا سانحہ تو ہندوستانی سماج کی بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ کتنے شاعروں نے ان خونچکاں واقعات کو نظم کیا۔ کتنے نوحے لکھے گئے۔ کہاں تھے وہ رجز گو مرثیہ خواں جن کی جادو بیانی سے محرم کی ہر محفل ماتم کدہ بن جاتی تھی۔ کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی پر ایک نوحہ نہ لکھا۔ واقعات 1857 پر داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھیے اور سر پیٹ لیجیے کہ جب پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ یہ حضرات اپنی روٹیوں کے سوا اور کچھ نہ سوچ سکتے تھے۔ اور سوچتے تھے تو ایسے بزدلانا اور رجعت پسندانہ طریقوں سے جو زندگی اور شاعری کے لیے باعث ننگ ہے۔''[15]

ایک دوسرے مضمون میں یوں رقمطراز ہیں:

''ہماری کرم خوردہ شاعری اور ادب کے نمونوں کو لوگ میوزیم میں رکھیں گے اور انھیں اسی حیرت سے دیکھا کریں گے جس طرح آج ہم زمانہ قدیم کی ممیوں کو دیکھا کرتے ہیں۔''[16]

اختر حسین رائے پوری نے دیگر مضمون میں بھی اس بات کا بغیر کسی پس وپیش کے اظہار کیا ہے کہ اردو شاعری میں درد اور نظیر جیسے معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ وظیفہ خور تھے۔ درد دنیا سے بیگانہ اور میر تقی میر اپنی ناکامیوں کی وجہ سے زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان وجوہ کی بنا پر یہ دونوں شاعر زندگی کے لیے ضروری جذبات سے اجتناب برتتے ہیں۔ افسردگی، رہبانیت اور حزنیت کا ایک لامتناہی سلسلہ وہ اردو شاعری میں دیکھتے ہیں۔ انھوں نے قدیم دور میں صرف نظیر ہی کو صحیح معنوں میں شاعر قرار دیا ہے اور کہا کہ اگرچہ نظیر کے یہاں حسن بیان کی کمی اور عامیانہ جذبات کی زیادتی ضرور ہے جس کی وجہ اس کی آوارہ اور خانہ بدوش زندگی ہے لیکن پورے اردو ادب میں وہی ایسا شاعر ہے جو عوام کے ساتھ رہتا ہے۔ انھیں سمجھتا ہے اور ان کے تاثرات کو انھی کی زبان میں بیان کرتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کو پہلی بار اس انداز نظر سے اختر حسین رائے پوری نے ہی دریافت کیا تھا۔ اسی طرح وہ رابندر ناتھ ٹیگور اور نذرالاسلام پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں اور ان کی شاعری کے حسن وقبح کا ژرف نگاہی سے جائزہ لیتے ہیں۔ وہ ٹیگور میں اصلاح، عدم تشدد اور تصوف کی تبلیغ کو مستحسن نہیں سمجھتے تاہم ان کا خیال ہے کہ ٹیگور کے کلام کا بڑا حصہ زمان ومکان سے بالاتر ہے۔ اقبال کو فسطائیت کا

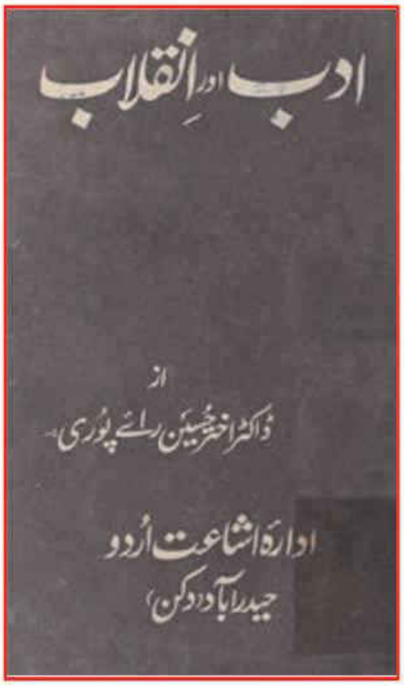

ترجمان سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری میں قوم کے صرف ایک خاص طبقے کو ہی مخاطب کیا ہے۔ یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے۔ تاریخ اسلام کا ماضی انھیں بہت روشن اور شاندار معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اقبال کے متعلق لکھا ہے کہ

''... اقبال اسلامی فاشسٹ ہے اور اس کا ردعمل ڈاکٹر پرمانند اور ڈاکٹر مونجے کے ہندو فاشزم کی صورت میں ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ جن کے نزدیک ویدک عہد کی تہذیب انسانیت کی معراج ہے اور ذات پات کی تقسیم تقسیم عمل کا بہترین نمونہ ہے۔''[17]

اختر حسین رائے پوری کی کتاب 'ادب اور انقلاب' کے مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ ادب کو اشتراکی اصولوں کی تبلیغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اس کا اظہار کھلم کھلا تو نہیں کیا ہے۔ لیکن ان کی تحریروں میں اس کے اشارے ضرور ملتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ ''ادب کا فرض اولین یہ ہے کہ دنیا سے قوم، وطن، رنگ، نسل اور طبقہ ومذہب کی تفریق کو مٹانے کی تلقین کرے اور اس جماعت کی ترجمانی ہو جو اس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہے۔[18] ان کے یہاں اس طرح کا انتہا پسندانہ رجحان عام طور پر ملتا ہے۔ غرض کہ اختر حسین رائے پوری اردو میں مارکسی تنقید کے نقش اول ہیں۔ انھوں نے اردو تنقید میں ایک نئی منزل کی نشاندہی کی ہے جس کو ایک اجتہادی کوشش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ترقی پسند نظریات کو عام کرنے کی سب سے پہلے شعوری کوشش کی۔ انھیں اپنی اس کوشش میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی لیکن اتنا ضرور ہے کہ اردو ادب میں ان کی تنقیدی نگارشات سے فکروفن کے نئے مسائل بحث کے لیے پیدا ہوئے۔ ادیبوں اور دانشوروں کو ایسے موضوعات پر سوچنا سکھایا جن پر ان سے پہلے کسی نے بھی کچھ نہیں سوچا تھا۔ ان کا انداز بیان شگفتہ اور جاندار ہوتا ہے اور وہ اپنے نظریات ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس بنا پر انھیں ان ناقدین کی صف اول میں جگہ دیتے ہیں جنھوں نے اردو زبان میں ترقی پسند تنقید کو رواج دیا اور اردو ادب کو نئی قدروں سے روشناس کیا۔

حواشی

1. سجاد ظہیر، روشنائی، ص 171، سیما پبلی کیشنز، دہلی 1985
2. طاہر مسعود، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص 84، مکتبہ تخلیق ادب، کراچی، 1985
3. شارب ردولوی، تنقیدی مباحث، ص 40، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1995
4. خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص 289، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1996
5. ایضاً، ص 35
6. ڈاکٹر صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، 62-61، اردو مجلس، بازار چتلی قبر، دہلی۔ 1981
7. سجاد ظہیر، روشنائی، ص 168، سیما پبلی کیشنز، دہلی۔ 1985
8. شہزاد منظر، اختر حسین رائے پوری کا تصور ادب، ص 817 مشمولہ ادبیات، شمارہ، 27 تا 1994/30
9. ڈاکٹر صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، 63-62، اردو مجلس، چتلی قبر، دہلی 1981
10. ایضاً، ص 63
11. سردار جعفری، ترقی پسند ادب، ص 4 2، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ 1957
12. خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص 289، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1996
13. اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ص 81، 74، 15، 13، 11 ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد۔ 1943
14. شارب ردولوی، جدید اردو تنقید: اصول ونظریات، ص 362-361، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1994
15. اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ص 51 ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد۔ 1943
16. ایضاً، ص 257
17. ایضاً، ص 62
18. ایضاً، ص 23

■

Dr. Makhmoor Sadri
R-81, Second Floor, Near Hari Masjid
Jogabai Extn, Batla House, Jamia Nagar
Okhla, New Delhi-25

غلام صمدانی

بیسویں صدی میں صنعتی ارتقا اور سماجی و خاندانی نظامِ حیات

(چوگانِ ہستی اور گئودان کے حوالے سے)

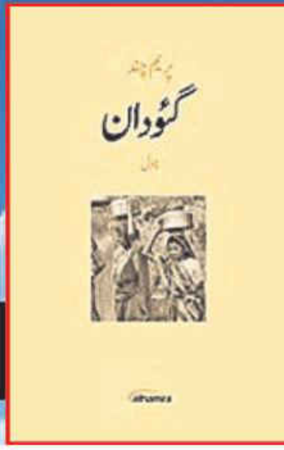

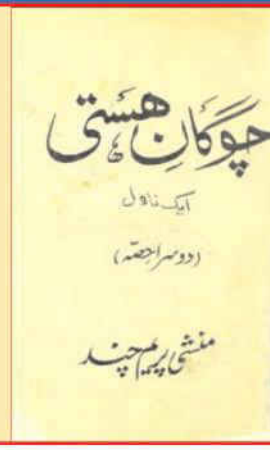

صنعتی انقلاب سے عالمی تاریخ میں تغیرات کے کئی موڑ آئے۔ سماجی، سیاسی اقتصادی اور انفرادی زندگی میں بہت ساری عمومی تبدیلیاں اسی انقلاب کے باعث رونما ہوئیں۔ موجودہ دور میں بھی اگر صنعت کاری کے اثرات کے سماجی پہلوؤں پر غور کریں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مشینی انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس نے سماج و خاندان، تہذیب و ثقافت اور ادب وفن پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ بالخصوص ادب میں صنف ناول کو صنعتی انقلاب کی ہی پیداوار تصور کیا جاتا ہے۔

ہندستان میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں جس سماج کی ہیئت تشکیل پائی اور اس سے خاندان اور افراد خاندان کی زندگیوں میں جو تبدیلیاں آئیں ان سارے مسائل کو اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف میں معاصر حالات کے تناظر میں عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ بالخصوص یہ مسائل ناول میں غالب موضوعات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سماج اور فرد کا ردعمل بیشتر ناولوں کا موضوع ہے۔ بیسویں صدی میں صنعت کاری کے اثرات سے تشکیل پانے والی سماجی، تہذیبی، خانگی اور انفرادی زندگی کو اس دور کے ناول نگاروں کی تخلیقات میں سماجیاتی اور تاریخی دونوں نظریے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ راشد الخیری، پریم چند، کشن پرشاد کول اور علی عباس حسینی اس دور کے ایسے ناول نگار ہیں جو اپنے زمانے کے تغیر پذیر حالات سے وابستہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں صنعتی ارتقا کے تحت بدلتے سماج کی تاریخی ترتیب موجود ہے۔ جو تاریخی مطالعے کے لیے ایک دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔

پریم چند جدید ناول نگاری کے اہم ستون تھے۔ وہ ناولانہ اسلوب اور حقیقت کے پیرایے میں صنعت کاری اور سرمایہ داری کی ترقیاتی اور سماج و خاندان پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات کو بیان کر کے سیاسی، سماجی، معاشی اور انصاف و مساوات کی سطح پر ملک کی ترقی اور استحکام کے خواہاں تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندستان کی مشترکہ تہذیب، سیکولر کردار، حب الوطنی، اخوت و محبت، امن اور شانتی نیز مزدور اور کسانوں کے ہمدرد اور غمخوار بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں رائج جابرانہ طرز حکومت، استحصالی صنعتی قوت اور فرسودہ نظام حیات کے خلاف تحریری اور عملی دونوں لحاظ سے دلچسپی لی اور اپنے ناولوں میں تعمیری فکر ونظر سے ایک ایسے سماج اور خاندان کی تشکیل کا خاکہ کھینچا جس کی جڑیں انصاف و مساوات، اتحاد و اتفاق اور ترقی و بلندی میں پیوست تھیں۔

پریم چند نے جس طرح کسانوں و مزدوروں، غریبوں وساہوکاروں، نچلے طبقوں واعلی ذاتوں، مذہبی ٹھیکیداروں اور بے بس عقید تمندوں کے درمیان کے تصادم کو دیہی اور شہری پس منظر میں پیش کیا ہے اسی طرح صنعتی ترقی سے پیدا ہونے والے سرمایہ داروں اور ورکروں کے بیچ پنپنے والی پیچیدگیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے صنعت سے وابستہ لوگوں کی زندگی میں بدلاؤ کے پہلوؤں کو متعدد زاویے سے دیکھا اور خانگی زندگی پر مرتب ہو رہے اثرات کی حقیقی تصویر پیش کی۔ صنعتی انقلاب کے بعد خاندان میں تبدیلی آنے کی سب سے بڑی وجہ معاشی حیثیت میں بہتری تھی۔ دوسری وجہ مختلف علاقوں اور طبقوں کی آمیزش تھی۔ تیسری وجہ پشتینی مقامات سے ہجرت۔ ان وجوہات کی بنیاد پر خاندان میں دو طریقے سے بدلاؤ آرہے تھے۔ ایک یہ کہ وہ خاندان جو کارخانوں میں کام کر رہے تھے ان کی طرز رہائش اور طرز زندگی کے معیار میں بہتری آرہی تھی۔ دوسرا یہ کہ وہ خاندان جس کے ہنرمند اور تعلیم یافتہ افراد گھروں کو خیر آباد کہہ چکے تھے ان میں تنزلی آرہی تھی۔ مزید یہ کہ دونوں کے درمیان دن بہ دن فاصلے بڑھنے کی وجہ سے خاندان میں بکھراؤ پیدا ہو رہا تھا جس کے نتیجے میں چھوٹے خاندان کی بنیادیں مضبوط ہو رہی تھیں۔

صنعت کاری کے سبب ایک طبقہ سرمایہ داروں کا بھی وجود میں آیا تھا۔ جو بڑی بڑی فیکٹری کے مالک تھے ایسا نہیں کہ اس سے پہلے بھی ان کی سماجی اور خانگی زندگی ایسی ہی تھی جیسا کے سرمایہ دار ہونے کے بعد ان کا معیار تھا۔ اس لحاظ سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پہلے سے جن کی حیثیت سرمایہ دارانہ نہیں تھی خواہ وہ زمیندار ہوں ان میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے سماجی اور خاندانی اقدار بدلے۔ رشتے ناطے کی ہیئتوں میں تغیرات پیدا ہوئے۔ اور سب سے اہم یہ کہ دولت کی فراوانی کے سبب ان کے نظریات میں بدلاؤ کی صورت پیدا ہوئی۔ جواہر لعل نہرو نے ہندستان کی سماجی اور خانگی زندگی پر صنعت کاری کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے 'تلاش ہند' میں لکھا ہے:

ہندستان میں مشترکہ خاندانی نظام دن بہ دن ختم

ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا اثر صرف اقتصادی حالات میں تبدیلی تک محدود نہیں بلکہ زندگی میں بہت سی پیچیدگیاں اور عملی دشواریاں بھی پیدا ہو رہی ہیں۔ ہندستانی زندگی میں یہ انحطاطی رجحان ہر جگہ سرایت کر گیا ہے۔'' (جواہر لعل نہرو، تلاش ہند، ص، 69-268، بحوالہ: فخر الکریم صدیقی، اردو ناولوں میں خاندانی زندگی، ص 150)

یہی وہ سارے عوامل ہیں جن کی بنیاد پر ایک ایسا سماج تشکیل پا رہا تھا جس میں استحصال، ظلم، حق تلفی، بے مروتی اور دیگر انسانی اقدار سے محرومی کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ پریم چند کے ناولوں کا یہی پس منظر، اسی سماج و خاندان کی تفہیم اور ان کا مقصد تخلیق ہے، جس میں نوآبادیاتی جبریت اور اس سے پیدا ہونے والا انتشار، ہندوستانی صنعتی مسائل، زرعی کیفیت، محنت کشوں کی صورت حال، اجرت میں کمی اور فرائض کی ادائیگی میں سختی، سرمایہ داروں کی زیادتی، خاندان اورا فراد کے درمیان پھیلنے والی غلط فہمی اور بڑے بڑے کارخانوں کے نقصانات وغیرہ سبھی شامل ہیں جن سے بیسویں صدی کا ہندستانی معاشرہ تعمیر ہوتا ہے۔ قمر رئیس لکھتے ہیں:

''ٹالسٹائی نے اپنے ناول ''انا کرنینا'' کا آغاز اس طرح کیا ہے۔

'' تمام آسودہ اور خوش اطوار گھرانے ایک سے ہوتے ہیں لیکن نا آسودہ گھرانوں کی ابتری اپنی علاحدہ نوعیت رکھتی ہے''

ٹالسٹائی نے اپنے اس ناول میں کچھ ایسے ہی گھرانوں کی الجھنوں، تلخیوں اور اخلاقی پستیوں کو موضوع بنایا ہے۔ پریم چند کے یہ ناول بھی ہندستان کی معاشرت بالخصوص گھریلو زندگی کے بعض مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ٹالسٹائی کے گھرانے روسی معاشرے کے اعلیٰ طبقے کی اور پریم چند کے گھرانے ہندستان کے متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔''

(قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص 216)

'چوگان ہستی' ایک ایسا ناول ہے جس میں اس دور کی زندگی کی تمام باریکیوں اور گہرائیوں کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ سماج کے خاتمے، صنعتی ترقی کے سبب سرمایہ دارانہ اور مزدور سماج کے بننے بگڑنے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ پریم چند نے اپنی ژرف نگاہی سے ہندستان کی اس بدلتی ہوئی سماجی اور خانگی زندگی کے درمیان پیدا ہونے والے تضاد اور تصادم کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ صنعتی انقلاب کی خرابیوں اور اچھائیوں پر بھرپور گرفت اور مادی غلبے سے آگاہی کی وجہ سے انھیں اس چیز کا بھی علم تھا کہ صنعت کاروں و سرمایہ داروں کے تسلط اور مزدوروں کے استحصال روایتی زندگی کے بہت سارے مفید اقدار کو پامال کردیں گے۔

پریم چند نے چوگان ہستی کو 1924 میں مکمل کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندستان میں صنعتی اور کاروباری صورت حال بہتر ہوئی تھی۔ سیاسی اعتبار سے بھی یہ پرسکون تھا۔ ادیب اور دانشور سنجیدگی سے سماجی اور ملکی صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ انھوں نے بھی صنعت اور سیاست پر غور وفکر کرنے کے بعد معاصر زندگی کی سماجی اور انفرادی ہیئت سے آگاہی حاصل کی۔ اور ناول کا موضوع بنایا۔

'چوگان ہستی' کا مرکزی کردار سورداس ہے جو نیک نامی کے لیے مشہور ہے۔ ورثے میں ملی اپنی زمین کو چراگاہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور اسے کسی طرح بیچنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ دوسرا کردار صنعت کار جان سیوک کا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے کردار ہیں جو مختلف طبقے اور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ناول کسانوں اور مزدوروں پر مشتمل پانڈے پور نامی ایک ایسی بستی کی کہانی ہے جس میں کئی خاندان بستے ہیں۔ پریم چند نے سورداس اور جان سیوک کی کہانی کے ضمن میں سرمایہ دار اور کسانوں کے تصادم، گھریلو تنازعات، ازدواجی اور انفرادی رشتوں کی جزئیات کو بھی بیان کیا ہے۔ جان سیوک سورداس سے کسی بھی قیمت پر زمین حاصل کرنے کے لیے ظلم و جبر کے سارے ہتھکنڈے اپناتا ہے۔ عدالتوں اور اعلیٰ عہدے داروں سے ساز باز کر کے اپنی خودغرضانہ چال میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ سگریٹ کا کارخانہ کھولنے کے لیے صرف سورداس کی زمین ہی نہیں بلکہ پورے گاؤں والوں کے پشتینی مکانات بھی خالی کرائے جاتے ہیں تاکہ وہاں مزدوروں کی رہائش کا انتظام کیا جا سکے۔ سورداس کسی بھی قیمت پر گھر اور زمین چھوڑنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔ بالآخر پولس کی جھڑپ میں اسے گولی ماردی جاتی ہے، پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارتا اور کہتا ہے۔

''کوئی کسی کی نہیں مانتا۔ تم کھیلنے میں ہوسیار (ہوشیار) ہو اور ہم اناڑی ہیں بس اتنا پھرک (فرق) ہے..... ہم ہارے تو کیا میدان سے بھاگے تو نہیں۔ روئے تو نہیں۔ دھاندلی تو نہیں کی پھر کھیلیں گے۔ جرا دم تو لے لینے دو۔ ہار ہار کر تمھیں سے کھیلنا سیکھیں گے۔ اور ایک نہ ایک دن ہماری جیت ہوگی ضرور ہوگی۔''

(چوگان ہستی، دوم، ص 391)

سورداس اور جان سیوک کی لڑائی کا دائرہ محض انہی فریقین تک محدود نہیں۔ اور نہ ہی پانڈے پور میں فیکٹری اور انڈسٹری کے کھلنے سے وہاں کے لوگ اور جغرافیائی حالات بیان کیے گئے ہیں بلکہ پریم چند نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر صنعت کاری کے نتیجے میں سرمایہ دار اور غریب کسان کے درمیان ہونے والے تصادم کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے سماجی اور خانگی نظام حیات اور بدلتے اقدار کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ سورداس مظلومی اور محرومی کے باوجود موت کے وقت تک سماج اور خاندان کی بنیادی قدروں اور انسانی فلسفے کو ترک نہیں کرتا ہے۔ وہ ہارنے کے بعد بھی انسانی اصولوں اور اس کے رشتوں کی بنیاد پر جیت کی آس لگائے رہتا ہے۔

پریم چند نے ان مسائل کو سورداس اور جان سیوک کی کہانی میں پیش کر کے ہندستانی صنعت کاری کے ان عوامل کو اجاگر کیا ہے جن سے سماج، خاندان اور فرد پر مثبت اور منفی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ جان سیوک کو دولت وثروت کے باوجود اطمینان نصیب نہیں۔ بالخصوص گھریلو اور ازدواجی زندگی میں اسے کئی پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں۔ کبھی بیٹی کی جدید طرز فکر سے بیزار رہتا ہے تو کبھی اس کی آزاد خیالی اور زندگی کے معاملے میں خود مختاری سے۔ اس کہانی میں ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں ان سرمایہ داروں کی نفسیات کا بھی ذکر ہے جن کے لیے دولت انسان اور انسانیت سے بڑی حقیقت بن گئی ہے۔ جان سیوک کا مسئلہ صرف یہ نہیں کہ سگریٹ کی فیکٹری کیسے کھولا جائے بلکہ اب اس کی سرمایہ دارانہ حیثیت کا بھی سوال ہے۔ صنعت کاری اور استحصالی قوت کی بنیادوں پر مبنی اعلیٰ حکاموں سے وابستگی کا غرور ہے۔ اس کے لیے انسانی، سماجی رشتوں کی پامالی ایک چھوٹی چیز ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انسانی اور سماجی زندگی سے متعلق مختلف موضوعات کی تفہیم اور تقابل کے پہلو بھی اس ناول میں موجود ہیں۔

پریم چند اپنے منشا کی تکمیل کے لیے کرداروں میں کایا پلٹ کے اصول پر کاربند نظر آتے ہیں۔ جان سیوک کا سرمایہ دارانہ کردار سماجی اور انسانی اقدار سے کوسوں دور تھا۔ لیکن انھوں نے اپنی نظریاتی تکنیک سے اس میں ساری کھوئی ہوئی قدروں کو اجاگر کردیا ہے۔ جیسے یہ اقتباس:

''سیوک۔ سورداس، اگر اس فلسفہ کو۔ زندگی کے اس بھید کو میں بھی تمھاری طرح سمجھ سکتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ مجھے یاد ہے تم نے میرے کارخانہ کو آگ سے بچالیا

تھا۔ میں تمھاری جگہ ہوتا تو شاید آگ میں اور تیل ڈالتا۔ تم اس لڑائی میں ہوشیار ہو سورداس۔ میں تمھارے سامنے نادان بچہ ہوں۔ دنیا کی نظروں میں میں جیتا اور تم ہارے۔ مگر میں جیت کر بھی دکھی ہوں اور تم ہار کر بھی سکھی۔ تمھارے نام کی پوجا ہو رہی ہے۔ اور میرا پتلا بنا کر لوگ جلا رہے ہیں۔ میں دولت اور عزت رکھ کر بھی تمھارا سامنا کر کے نہ لڑ سکا۔ سرکار کی آڑ سے لڑا۔ مجھے جب موقع ملا میں نے تمھارے اوپر ناجائز حملے کیے۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔'' (چوگان ہستی، دوم، ص 380)

پریم چند نے جس زمانے میں یہ ناول لکھا تھا ممکن ہے اس دور کے سماج اور فرد کے اندر ظاہری پیچیدگیوں کے باوجود باطنی اور داخلی شفافیت موجود ہو۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جان سیوک کے اندر کایا پلٹ ہونے کا سبب انسانی رویے کے عین مطابق ہو۔ کیونکہ انسان کبھی کبھی حالات اور ذاتی مفاد کے دباؤ میں غیر انسانی عمل پر ضرور آمادہ ہو جاتا ہے لیکن جب اس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور زندگی کی حقیقت آشکار ہوتی ہے تو مثبت قدروں کی جانب اس کا میلان خود بخود ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسے بھی پریم چند کی حقیقت نگاری پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ البتہ موجودہ زمانے کی سرمایہ دارانہ روایت میں اس نوعیت کے بدلاؤ کے امکانات نہ کے برابر ہیں۔

پریم چند کو عصری حالات سے آگہی اور مستقبل کے امکانات کی دور اندیشی میں کمال حاصل تھا۔ جنگ عظیم اوّل کے دوران فوج کے لیے چمڑے کی مصنوعات کی مانگ میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا، جس کے نتیجے میں ہندستان میں بھی چمڑے کی صنعت میں بہتری آئی تھی۔ خاص طور سے کلکتہ اور مدراس میں اس کے کئی یونٹس قائم ہوئے۔ پریم چند نے اس صنعت سے وابستہ مزدوروں کی سماجی اور خانگی صورت حال کو طاہر علی، ماہر علی اور ان کی تین سوتیلی ماؤں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اس سے مسلم متوسط طبقے اور وہ خاندان جو سرکاری ملازمت کے دوران خوشحال تھا لیکن اب مالی مشکلات نے اس میں بدحالی پیدا کر دی ہے، ان دونوں طبقات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

طاہر علی چمڑے کے کارخانے میں تیس روپیہ مہینہ پر کام کرتا ہے۔ زمانے کی تبدیلیوں کے تحت بال بچوں کی پرورش کے ساتھ اپنے سوتیلے بھائی ماہر علی کی تعلیم کے لیے وہ اپنی بیوی کے زیورات تک کو فروخت کر دیتا ہے۔ لیکن خانگی ضروریات اور تعلیمی اخراجات پورا نہ کر پانے کی صورت میں اس کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے اور یہ چوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چوری کے جرم میں اسے جیل ہو جاتی ہے۔ یہاں سے خاندان میں غلط فہمیوں کی شروعات ہوتی ہے۔ ماہر علی اس کے تئیں بدگمان ہو جاتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ بھائی نے اپنی بری عادتوں کی بدولت خاندان کی عزت داؤ پر لگا دیا۔ اسے یہ بھی غلط فہمی ہوتی ہے کہ بھائی اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات کے لیے چوری میں ملوث رہا ہے۔ اس طرح خاندان کے دوسرے افراد بھی اس سے بدگمان ہو گئے۔ اور خاندان اقتصادی بحران کی وجہ سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں میں ٹوٹنے بکھرنے لگا۔ اس میں ایک طرف تو مشترکہ خاندان میں باہمی تعاون کے جذبے کی نشاندہی ہوتی ہے تو دوسری طرف اس میں پیدا ہونے والے منفی اثرات بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

ایک بڑے اور مشترکہ خاندان میں جب کسی کے تئیں بدگمانی ہو جاتی ہے۔ یا کوئی بڑی آفت میں پڑ جاتا ہے تو معاشی بدحالی میں بھی اس کا ساتھ کس طرح چھوڑ دیتے ہیں اس کا اندازہ طاہر علی کی بیوی کی حالت اور خاندان کے منفی رویے سے کیا جا سکتا ہے۔

''رات کے نو بج گئے۔ کلثوم (بیوی) دیکھ رہی تھی کہ چولہا گرم ہے۔ مصالحہ جات کی خوشبو آ رہی تھی۔ بگھارنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ لیکن جب بڑی دیر تک کوئی اس کے بچوں کو بلانے نہ آیا تو ڈاڑھیں مار کر رونے لگی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ گھر والوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور اب میں بیکس ہوں۔ دنیا میں کوئی میرا نہیں ہے۔ دونوں بچے روتے روتے سو گئے تھے۔ انھیں کے پائنتے وہ بھی پڑ رہی۔ یا اللہ! یہ دو دو بچے اور پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ گھر کے آدمیوں کا یہ حال۔ یہ ناؤ کیسے پار لگے گی....

رقیہ۔ (سوتیلی ماں) سالن اور روٹی کس جیتے کھائیں گی۔ انھیں تو زردہ اور شیر مال چاہیے۔

دوسرے روز دونوں بچے سویرے ہی باورچی خانہ میں گئے تو زینب نے ایسی کڑی نگاہوں سے دیکھا کہ بس روتے ہی لوٹ آئے۔ اب کلثوم سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ جھلا کر اُٹھی اور باورچی خانہ میں جا کر ماما سے بولی۔ تو نے بچوں کو کھانا کیوں نہیں دیا؟ کیا اتنی جلد کایا پلٹ ہو گئی؟ اسی گھر کے پیچھے ہم مٹی میں مل گئے اور آج میرے بچے بھوکوں کے مارے تڑپیں کسی کو ترس نہ آئے۔''

(چوگان ہستی دوم، ص، ص 31-230)

پریم چند نے چوگان ہستی میں اور بھی بہت سارے خاندانوں کا ذکر ان کے معاشی اور سماجی زاویہ نظر سے کیا ہے۔ دراصل بیسویں صدی کا یہ زمانہ معاشی اور اقتصادی اعتبار سے ہر اس طبقے کے لیے پریشان کن تھا جو نچلے یا متوسط درجے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ برٹش حکومت کی اقتصادی پالیسی ہی ایسی تھی جس میں صرف اور صرف انگریزوں اور انگریز سرکار کا فائدہ مقصود تھا۔ ہندستانی عوام اور ملکی انتظام کے تئیں وہ بالکل سنجیدہ نہیں تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ کچھ ہندستانی افراد بھی محض مالی منفعت کے تابع ہو کر انگریزوں کی دلالی کر رہے تھے۔

بیسویں صدی میں صنعتی ترقی اور ہندستانی سماج کے بدلتے اقدار کی عکاسی پریم چند نے اپنے ناول 'گئودان' میں بھی کی ہے۔ اس کا بیشتر حصہ ہوری کی سماجی، خانگی، مذہبی اور اقتصادی المیے کی داستان پر مبنی ہے۔ اور اس ضمن میں دیہی معاشرہ، ایک گاؤں کی مکمل اور متحرک شکل میں موجود ہے۔ اسی کے مقابل شہری حیات آفرینی زمیندار رائے صاحب، صنعت کار کھنا، صحافی اونکار ناتھ، دلال ٹنخا صاحب، ڈاکٹر مالتی، پروفیسر مہتا اور سیاسی بصیرت رکھنے والے مرزا خورشید جیسے کرداروں کو حقیقی و نفسیاتی واقعات کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ گوبر کی داستان انہی دونوں سماج کے تضاد اور تصادم کی پروردہ ہے۔ گوبر دراصل صنعتی مزدور کی شعوری بیداری اور احتجاجی رویے کی علامت ہے جو اس دور میں پروان چڑھ رہی تھی۔ نیز پریم چند نے گوبر کے ذریعے مشترکہ خاندان اور روایتی اقدار میں در آئی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جدید صنعت سے وابستہ مزدور کے مرکزی خاندان کے تشکیلی عمل کو بھی بیان کیا ہے۔ جدید صنعتی ارتقا کے نتیجے میں شہری آبادکاری اور دیہی و قصباتی علاقوں سے لاکھوں انسان کی شہروں کی جانب منتقلی سے انسانی اور خانگی زندگی میں جو پریشانیاں لاحق ہو رہی تھیں اس کا اندازہ گوبر کے ان ایام سے لگایا جا سکتا ہے جب وہ پہلی مرتبہ لکھنؤ جا کر محسوس کرتا ہے۔ اور پھر گھر میں آنے کے بعد سماج اور خاندان سے اس کی بغاوت ہوتی ہے۔ اس کی ماں دھنیاں، بیٹے سے کیسی کیسی امیدیں باندھے رکھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے سبھی ارمانوں کا اس وقت جنازہ نکل جاتا ہے جب گوبر نہ صرف گھر چھوڑتا ہے بلکہ معمولی جھگڑے کی وجہ سے دھنیا کی مامتا کو بھی ٹھکرا دیتا ہے۔

''ہوری نے بھرے گلے سے کہا۔ بیٹا کچھ کہنے کا منہ تو نہیں ہے، پر جی نہیں مانتا۔ کیا جرا جا کر اپنی ابھاگنی ماتا کے پاؤں چھو لوگے تو کچھ برا ہوگا؟...

گوبر نے منہ پھیر کر کہا۔ ''میں اسے اپنی ماں نہیں سمجھتا۔'' ....

اور دھنیا بیٹھی رو رہی تھی، جیسے کوئی اس کے دل کو آرے سے چیر رہا ہو۔ اس کی مامتا اس گھر کے مانند ہو رہی تھی جس میں آگ لگ گئی ہو اور سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا ہو، بیٹھ کر رونے کے لیے بھی جگہ نہ بچی ہو۔" (گئودان، ص 289-90)

معاشی تنگی کی وجہ سے رشتوں میں افتراق کا سبب محض گوبر کا احتجاج نہیں ہے بلکہ یہ ہر دور کی نئی نسل اور پرانی پیڑھی کے درمیان آزادانہ تصورات اور روایتی طرز فکر کا تصادم ہے جس کو پریم چند نے حقیقت نگاری کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور خانگی زندگی کی بدلتی تصویر کو مزید واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کے بعد گوبر جب واپس شہر آ کر باضابطہ مرکزی خاندان کے تحت زندگی کی تگ و دو میں قدم رکھتا ہے۔ شہروں کی بھیڑ میں رہائش کے طریقے کار کی نوعیت اور روح فرسا کیفیت کو پریم چند ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"وہ گھر بھی اب اسے بنجر سا لگتا تھا۔ جھنیا اب اس میں تنہا بیٹھی ہوئی رویا کرتی تھی۔ لڑکا دن بھر آنگن میں یا دروازے کا عادی تھا۔ وہاں اس کے کھیلنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ کہاں جائے؟ دروازے پر مشکل سے گز بھر کا راستہ تھا۔ یہاں عفونت پھیل رہی تھی۔.... گھر پر کبھی دھنیا، کبھی روپا، کبھی پنیا۔ یہاں تنہا جھنیا تھی اور اسے گھر کا سارا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں جھنیا اس زندگی سے اکتا گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ کہیں تخلیہ میں جا کر بیٹھے اور خوب بے فکری سے لیٹے، سوئے مگر وہ تخلیہ کہیں نہ ملتا تھا۔ اب اسے گوبر پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے شہری زندگی کی کتنی دلکش تصویر کھینچی تھی اور یہاں اس کال کوٹھری کے سوا کچھ نہ تھا۔" (گئودان، ص 349-50)

اس کے علاوہ اور بھی دیگر ایسی پریشانیاں ہیں جو مرکزی خاندان کو جھیلنی پڑتی ہیں۔ جھنیا دروزہ کے باوجود گھر کے کام کرنے پر مجبور رہتی ہے۔ دوران حمل اسے وہ سارے کام کرنے پڑتے ہیں جسے مشترکہ خاندان میں ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا جاتا ہے۔ اسی عرصے میں اس کا بیٹا للّو بھی مر جاتا ہے۔ اس سے گوبر کی نفسیات اور داخلی کیفیت تو اتنی متاثر نہیں ہوتی تاہم جھنیا کے لیے ایک بڑا حادثہ تھا۔ اس کی زندگی میں اس حادثے کے انمٹ نقوش گہرے ہو گئے تھے۔ یہاں تک تو کچھ راحت تھی کہ گوبر اپنا خوانچہ لگاتا تھا۔ اپنی مرضی کے مطابق کام کرتا تھا۔ لیکن اس میں کامیاب نہ ہونے پر جب وہ کھنا کے مل میں نوکری کرنے لگتا ہے تب اس کی پریشانی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اب وہ غم غلط کرنے کے لیے شراب کا بھی عادی ہو رہا تھا۔ یہ صنعتی ارتقا کی دین ہے کہ مزدوروں میں آزاد خیالی اور عیش پرستی کی زندگی جینے والی ذہنیت تشکیل پا رہی تھی۔ مخرب اخلاق اور آزادانہ روش کے سبب خانگی نظام حیات اور رشتوں میں تلخی، فساد اور جھگڑے جیسی کمزوری اور اخلاقی اقدار سے انحراف کی روایت پیدا ہو رہی تھی۔ شہری اور صنعتی زندگی کی ہیجان انگیزی اور دیہی معاشرے کی طمانیت کا موازنہ پریم چند نے بڑے خوبصورت انداز میں کچھ اس طرح کیا ہے۔

"گوبر نے خوانچے سے نراس ہو کر شکر مل میں نوکری کر لی تھی۔ مسٹر کھنا نے پہلے مل سے حوصلہ پا کر حال ہی میں یہ دوسرا مل کھول دیا تھا۔ گوبر کو وہاں بڑے سویرے جانا پڑتا اور دن بھر کے بعد وہ جب چراغ جلتے گھر واپس آتا تو اس کے بدن میں ذرا بھی جان نہ رہ جاتی۔ پہلے گھر پر اسے کچھ کم محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ مگر اسے وہاں ذرا بھی تکان نہ ہوتا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ہنس بول بھی لیا کرتا تھا۔.... وہاں اس کا جسم چاہے جتنا کام کرے دل آزاد رہتا تھا۔ اب یہاں اتنی جسمانی محنت نہ ہونے پر بھی جیسے اس طوفانی شور اور ہلچل کا اس پر بوجھ سا لدا رہتا تھا۔ یہ اندیشہ بھی لگا رہتا تھا کہ نجانے کب ڈانٹ پڑ جائے۔ سبھی مزدوروں کی یہی حالت تھی، سبھی تاڑی یا شراب میں اپنے جسمانی اور دماغی تکان کو ڈبو دیا کرتے تھے۔ گوبر کو بھی شراب کا چسکا لگا۔ گھر آتا تو نشے میں چور اور پہر رات گئے۔ اور آ کر کوئی نہ کوئی بہانہ کھوج کر جھنیا کو گالیاں دیتا۔ گھر سے نکالنے لگتا۔ اور کبھی کبھی مار بھی دیتا۔ جھنیا کو اب یہ اندیشہ ہونے لگا کہ وہ داشتہ ہے۔ اسی لیے اس کی یہ ذلت ہو رہی ہے۔" (گئودان، ص 352)

یہ اقتباس مشینی دور کی زندگی کی مرقع کشی کا عمدہ نمونہ ہے۔ پریم چند نے صنعتی مزدوروں کی صورت حال کا عالمی پس منظر بیان کرتے ہوئے انسان کے جسمانی و نفسیاتی کرب کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ انسان جو کل تک ہنس بول رہا تھا، جس کی ظاہری اور باطنی کیفیت خوشگوار تھی، جو اخلاقی قدروں سے آراستہ تھا، جس کے گھر میں طمانیت تھی اور جس کے ازدواجی و خاندانی رشتے محبتوں کے امین تھے صنعتی ارتقا نے انھیں زائل کر دیا ہے۔

برٹش حکومت کے مفاد پرستانہ رویے سے اسی زمانے میں ملوں کے ٹیکس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مل مالکوں کو یہ بہانہ مل جاتا ہے کہ وہ اس اضافے کی آڑ میں مزدوروں کی اجرت کم کر دیں کیونکہ پانچ کے نقصان سے دس کا منافع تھا۔ دوسری طرف مزدوروں میں احتجاج اور ہڑتال کے شعور کو بلند کرنے کے لیے مرزا خورشید اور اونکار ناتھ بھی میدان میں آ چکے تھے۔ کھنا جو مل کا مالک تھا اسے مزدوروں سے ہمدری تو تھی لیکن صنعتی اور سرمایہ داری کے اصول کا اس پر اتنا غلبہ تھا کہ وہ بھی کشمکش میں مبتلا تھا۔ کھنا کی بیوی گوبندی مزدوروں کی حمایت میں تھی۔ وہ سرمایہ داروں کی عیش کوشی کو حقارت سے دیکھتی ہے۔ کھنا کی خانگی زندگی سے عدم توجہ کا سبب صنعتی ذہنیت کو قرار دیتی ہے۔ اسے شوہر پرستی پر پورا یقین ہے لیکن اس کی نفسیاتی اور داخلی قوت کھنا کے مزاج سے بالکل مختلف تھی۔ سب سے زیادہ وہ دھن دولت کی فکر میں کھنا کی عدم فرصتی، بچوں سے بے تعلقی اور خود کی بے عزتی سے خائف رہتی ہے۔ غرض یہ کہ پریم چند نے صنعتی ارتقا کے نتیجے میں خانگی زندگی کے انتشار اور سماجی ہیئتوں کی تخریب کاری کو اس ناول میں پیش کیا ہے۔ قمر رئیس لکھتے ہیں۔

"فکر و شعور کے اعتبار سے اردو کا کوئی ناول نگار پریم چند کی بلندی اور بصیرت کو نہ پہنچ سکا۔ ان کے ناول صحیح معنی میں اس عہد کا رزمیہ ہیں۔ ان میں سیکڑوں کردار سامنتی اور صنعتی دور کے جس مکمل اور متحرک انسان کا نقش ابھارتے ہیں وہ اپنی اور اپنے عہد کی زندگی کے نجانے کتنے تاریک گوشوں، عقدوں اور الجھنوں پر سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔ آج بھی ہم اس آئینہ میں اپنے خد و خال دیکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ آج بھی وہ تمام مسائل حل نہیں ہو سکے۔ آج کے سماج میں بھی فرد اسی طرح مجبور و بے بس ہے۔ ان ہی آزمائشوں کا شکار اور ان ہی کشمکشوں کا اسیر ہے۔"

خلاصہ یہ کہ جدید صنعتی پیداواری نظام نے انسانی طرز حیات کو اس قدر متاثر کیا کہ سماج اور خاندان میں تبدیلیوں کا آنا ناگزیر ہو گیا۔ اس نے نوجوانوں اور عورتوں کی گھریلو ذمے داریوں کے دائرہ کار میں وسعت پیدا کی اور گھر و خاندان سے باہر جانے کے مواقع فراہم کیے۔ بڑے پیمانے پر پیداوار کے نظام کی وجہ سے نہ صرف خاندانی ربط ٹوٹے بلکہ پیشہ ورانہ ہیئت و ساخت میں بھی تبدیلی آئی۔ روایتی ہنرمندی، خاندانی فنکاری، گھریلو دستکاری اور گھریلو صنعتکاری جو مشترکہ خاندان سے مربوط تھے سبھی میں تنزلی آئی۔ انسانی سماج و خاندان پر ہونے والے صنعتی ارتقا کے اثرات کو پریم چند نے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔

■

Ghulam Samdani Room No.:2, Mahanadi Hostel, JNU, New Delhi - 110067

خورشید احمد

منٹو کے افسانوں میں کشمیر اور کشمیریت

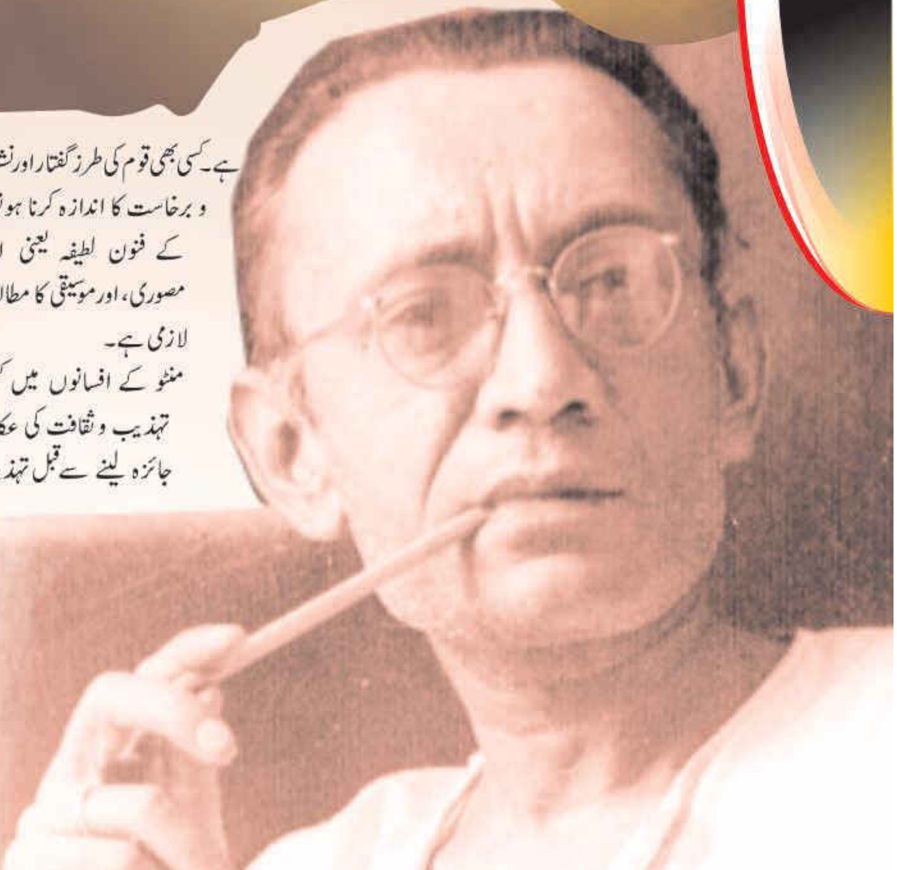

ادب زندگی کا اظہار ہے اور معاشرے کے ظاہر و باطن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جو کچھ معاشرے پر گزر رہی ہے اور جو کچھ معاشرے کے اندر ہو رہا ہے، ادیب کی تحریر اس کا احاطہ کرتی ہے۔ ادیب جو کچھ معاشرے میں دیکھتا ہے، جو کچھ مشاہدے سے اخذ کرتا ہے اس کو اپنے شعور و لاشعور سے فن کے سانچے میں ڈھال کر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔ ادب قومی تہذیب کا آئینہ اور ترجمان ہوتا ہے۔ کسی بھی قوم کی طرز گفتار اور نشست و برخاست کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے فنون لطیفہ یعنی ادب، مصوری، اور موسیقی کا مطالعہ کرنا لازمی ہے۔

منٹو کے افسانوں میں کشمیری تہذیب و ثقافت کی عکاسی کا جائزہ لینے سے قبل تہذیب و ثقافت کے مفہوم و ماہیت پر مختصر گفتگو کرنا ناگزیر ہے۔ تہذیب انسانی طرز زندگی، بود و باش، رفتار و گفتار، عقیدے اور افکار و نظریات کا مظہر ہوتی ہے۔ تہذیب ایک سماجی حقیقت ہے اور سماج کے اندر ہی اس کی نشو و نما ہوتی ہے اور سماج کے اندر جو طریقِ گفتگو، طرز لباس، طرزِ زندگی، معیارِ اخلاق، جمالیاتی احساسات اور طرزِ فکر ہوتی ہے وہ تہذیب کہلاتی ہے۔ ایڈوارڈ۔ بی۔ ٹائلر لکھتے ہیں:

"Culture is that complex whole which includes Knowledge, belief, art, law, morals, custom and any other capabilities and habits acquired by a man as a member of society" [1]

ڈاکٹر طارق سعید تہذیب و ثقافت پر اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اقدار کا شعور جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے اور جن کے مطابق وہ اپنی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے، تہذیب ہے۔''[2]

تہذیب کی مزید تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر عابد حسین رقم طراز ہیں:

''تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے، جسے وہ اپنے اجتماعی ادارات میں ایک معروضی شکل دیتی ہے، جسے افراد اپنے جذبات و رجحانات، اپنے سبھاؤ اور برتاؤ میں اور اُن اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو وہ مادی اشیا پر ڈالتے ہیں۔''[3]

ان بیانات کی روشنی میں تہذیب و ثقافت کو پرکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ تہذیب اُن اقدار کا مجموعہ ہے جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے اور جن کے مطابق وہ روزمرہ زندگی گزارتی ہے نیز جن سے جماعت کی علیٰحدہ پہچان ہوتی ہے۔ تہذیب اپنے اندر دو پہلوؤں کو رکھتی ہے، ظاہری پہلو اور باطنی پہلو۔ اخلاقی، جمالیاتی، روحانی قدریں، عقیدے، آرزوئیں اور آدرش باطنی پہلو میں شامل ہیں جو ایک قوم یا انسانی جماعت ارتقا کے سفر کے دوران تشکیل دیتی ہے۔ طرزِ اظہار، طرزِ زندگی، آدابِ گفت و شنید، آپسی رہن سہن، میل جول، علوم و فنون وغیرہ تہذیب کے ظاہری پہلو میں شامل ہیں۔

کشمیری تہذیب و ثقافت اگرچہ قومی سطح پر دیگر ریاستوں کی طرح کچھ مشترکہ اقدار رکھتی ہے مگر اس کے باوجود اس میں کچھ ایسی چیزیں شامل ہیں جو اس کو ملک کی

دوسری ریاستوں سے ممیّز کرتی ہیں۔اس تفاوت کے کئی وجوہات ہیں۔ایک وجہ یہ ہے کشمیر ایک بالائی علاقہ ہے جہاں موسم کی تبدیلی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔یہاں جاڑے کے موسم میں شدید سردی رہتی ہے اور بیرونی رابطے مسدود ہوجاتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اس سردی کو ایک منتخب طبقہ جھیلتا ہے جس کی وجہ سے کشمیری تہذیب و ثقافت میں کچھ چیزیں ایسی شامل ہوگئی ہیں جو اس تہذیب کو ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے علٰیحدہ کرتی ہیں۔

منٹو کشمیری نژاد تھے اور اُنھیں اپنے کشمیری ہونے پر فخر تھا۔ انسان اپنے ماضی سے آزاد نہیں ہو پاتا ہے۔ ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں ماضی کی جڑوں کا عکس موجود رہتا ہے۔ ہر قوم ماضی میں جھانک کر اپنی جڑوں کو تلاش کرتی ہے اور یہ کام قومی وسماجی سطح کے ساتھ ساتھ انفرادی سطح پر بھی ہوتا ہے۔منٹو کے افسانوں میں بھی اس کی لے موجود ہے جس کی وجہ سے کشمیری تہذیب وثقافت کے کئی پہلو اُن کے افسانوں میں شامل ہوگئے ہیں۔ کشمیری تہذیب وثقافت کی عکاسی میں اُن کے جو افسانے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اُن میں 'شغل' 'ٹیڑھی لکیر'،موسم کی شرارت، بھیگو، نامکمل تحریر، مصری کی ڈلی، لالٹین، شیرو، پانچ دن، مزدوری، شانتی، آخری سلوٹ، ٹیٹوال کا کتاوغیرہ ہیں۔

کشمیری شریف النفس بن کر کام کرتے ہیں۔ رواداری، مہمان نوازی، احترام آدمیت اور معصومیت جیسی انسانی صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔منٹو نے افسانے 'بھیگو' میں اس کی بہترین عکاسی کی ہے۔ بھیگو ایک معصوم پہاڑی لڑکی کی کہانی ہے جو لوگوں کی چاپلوسی اور مکروفریب کا شکار ہو جاتی ہے۔اس کہانی کا واحد متکلم جو بھیگو کا عاشق ہوتا ہے لوگوں کی چاپلوسی اور مکروفریب کا شکار ہوتا ہے اور بھیگو کی پاک دامنی پر شک کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے وہ بھیگو سے جدا ہو جاتا ہے۔ بھیگو اپنی پاک دامنی کو اپنے بھولے پن اور معصومیت کی وجہ سے ثابت نہیں کر پاتی جس کی وجہ سے وہ اپنی محبت کو بچا نہیں پاتی ہے نیز اپنے عاشق کے نظروں میں عصمت باختہ ثابت ہو جاتی ہے۔ بالآخر وہ عصمت فروشی پر مجبور ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ دق کی مریض بن جاتی ہے اور ایام جوانی میں ہی موت کا شکار ہو جاتی ہے۔منٹو نے 'بھیگو' کے کردار سے کشمیری پہاڑی لڑکیوں کے بھولے پن، معصومیت، پاکیزگی کی دلکش عکاسی کی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظ کیجیے:

''بھیگو! میں تمھارے چال وچلن کی سب کہانی سن چکا ہوں اور تمھارے سارے حالات سے باخبر ہوں ...کتنی بھولی بنتی ہو جیسے کچھ جانتی ہی نہیں ہو'' ...''مجھے یاد ہے، آپ نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ پانی بھرنے نہ آیا کروں، بھینس نہ چرایا کروں۔شاید آپ اسی وجہ سے ناراض ہو رہے ہیں''...'میں چاہتا تھا کہ وہ لڑکی میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائے۔ اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور گال آنسوؤں کی وجہ میلے ہو رہے تھے... بھیگو نے میرے جانے کے بعد اپنے شباب کو دونوں ہاتھوں سے لٹانا شروع کر دیا اور دق کے مریضوں سے ملنے کی وجہ سے وہ خود اس کا شکار ہوگئی... اس مرض نے بالآخر اُسے قبر میں سلا دیا۔''[4]

افسانہ 'شغل' بھی کشمیریوں کی لاچاری، بے بسی اور مفلسی کی عکاسی میں قابل ذکر ہے۔ یہ کشمیری پہاڑی

منٹو کشمیری نژاد تھے اور اُنھیں اپنے کشمیری ہونے پر فخر تھا۔ انسان اپنے ماضی سے آزاد نہیں ہو پاتا ہے۔ ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں ماضی کی جڑوں کا عکس موجود رہتا ہے۔ہر قوم ماضی میں جھانک کر اپنی جڑوں کو تلاش کرتی ہے اور یہ کام قومی وسماجی سطح کے ساتھ ساتھ انفرادی سطح پر بھی ہوتا ہے۔منٹو کے افسانوں میں بھی اس کی لے موجود ہے جس کی وجہ سے کشمیری تہذیب و ثقافت کے کئی پہلو اُن کے افسانوں میں شامل ہوگئے ہیں۔

مزدوروں کی کہانی ہے جو حکمرانوں کے ظلم وستم کے آگے بے بس اور لاچار نظر آتے ہیں۔اُن کی نظروں کے سامنے لڑکیوں کی عصمت کا سودا ہو جاتا ہے مگر وہ کچھ کر نہیں پاتے ہیں کیوں کہ معاشی طور پر ان کا اس قدر استحصال کیا گیا ہے کہ مشکل سے دو وقت کی روٹی مل پاتی ہے اور حکمرانوں کے زور و جبر کے آگے چپ سادھ لینے کے علاوہ اُن کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔ افسانے 'شغل' سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''دیہاتوں میں روپے کا منہ دیکھنا بہت کم نصیب ہوتا ہے اس لیے ہم سب خوشی خوشی چھ آنے روزانہ پر سارا دن پتھر ہٹاتے رہتے ہیں...پتھروں کو سڑک پر سے ہٹانا تو خیر معمولی بات تھی، ہم تو اس اجرت پر ان پہاڑوں کو بھی ڈھانے پر تیار تھے...ہم سب کے پائجامے یا تو گھٹنوں پر سے گھس گھس کر اتنے باریک ہوگئے تھے کہ ان میں سے جسم کے بالوں کی پوری نمائش ہوتی تھی یا بالکل پھٹے ہوئے تھے۔''[5]

منٹو نے اسی افسانے میں ان نوجوانوں کی مفلسی اور حکمرانوں کے ظلم و جبر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

ہمارا مطمحِ نظر کام کرنا اور اپنا پیٹ پالنا تھا اور چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ہم میں سے کسی نے بھی اگر اپنے کام میں ذرا سی بھی سست رفتاری یا بے دلی کا اظہار کیا ہے تو تاش کی گڈی سے ناکارہ جوکر کی طرح باہر نکال کر پھینک دیا جائے گا۔ہم دل لگا کر کام کرتے تھے تاکہ ہمارے افسروں کو شکایت کا موقع نہ ملے۔اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارے افسر ہم سے بہت خوش تھے۔ یہ کیوں کر ہوسکتا ہے، وہ بڑے آدمی ٹھہرے، اس لیے اُن کا جائز و ناجائز طور پر خفا ہونا بھی درست ہوتا ہے۔[6]

رام دئی ایک چمار کی لڑکی ہوتی ہے جس کی عصمت کا سودا ان نوجوانوں کے سامنے ہوتا ہے اور وہ چپ سادھ لینے کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں پاتے ہیں کیوں کہ سماجی اور معاشی طور پر اُنھیں اتنا کمزور کیا گیا ہے کہ اُنھیں خاموشی میں ہی اپنی عافیت نظر آتی ہے۔منٹو اس کی عکاسی پنڈت اور نوجوان مزدوروں کے مکالمے سے کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''جب پنڈت، رام دئی، اور وہ دونوں جوان ہمارے پاس سے گزرے تو ہم نے دیکھا کہ نوجوانوں کے چہرے پر ایک حیوانی جھلک ناچ رہی ہے ...رام دئی کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔...''انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں ...امیر آدمی ہیں، ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں۔'' یہ کہہ کر پنڈت چلا گیا۔''[7]

فطرت انسان کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے کیونکہ فطرت ہی سے انسان نے کھیتی باڑی کرنا، گھر بنانا، مل جل کر رہنا وغیرہ سیکھا ہے۔ کشمیر کو دنیا میں جو شہرت حاصل ہے وہ اس کے موسم اور قدرتی نظاروں کی وجہ سے ہے۔ کوہساروں، آبشاروں، درازقد درختوں، بیل بوٹوں، جھیلوں، چشموں اور دریاؤں کی وجہ سے یہاں کی ہواؤں میں کیف و مستی پائی جاتی ہے۔اس لیے فطرت کے مطابق انسان کی زندگی ڈھل جاتی ہے جس کی وجہ سے کچھ چیزیں انسانی زندگی میں شامل ہو جاتی ہیں جو آگے چل کر تہذیب وثقافت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ کشمیر کے پہاڑی لوگوں کی غذائی اشیا میں مکئی کی روٹی، دودھ اور چاول کا بھنا ہوا ستو اور جنگلی سبزی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ افسانہ ''شغل''میں اس کی عکاسی کرتے ہوئے منٹو لکھتے ہیں:

''بارہ بجے کے قریب ہم کام چھوڑ کر، کھانا کھانے کے لیے سڑک کے نیچے اُتر کر پیڑ کے سائے تلے بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کھانا ہم صبح کپڑے میں باندھ کر اپنے

ساتھ لاتے تھے۔ تین 'ڈھوڈے' (مکئی کی موٹی روٹیاں) اور عام طور پر سرسوں کا ساگ ہوتا تھا جس کو ہم اپنے بھو کے پیٹ میں ڈالتے تھے۔''8

کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں عام طور پر جو فصلیں کاشت کی جاتیں ہیں اُن میں مکئی، گیہوں، شہتوت، سیب، اخروٹ، خوبانی اور ناشپاتی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کشمیر پر مبنی بیشتر افسانوں میں منٹو نے اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مثالیں ملاحظ ہو:

''سیب کے رس بھرے ہوئے ہاتھوں کو بچوں کے مانند اپنی پتلون سے صاف کر کے اس نے میرا ہاتھ بڑے جوش سے دبایا۔''9

''جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوگئی جو سڑک کے نیچے مکئی کے چھوٹے سے کھیت کے ساتھ بنا ہوا تھا۔'' (بھیگو) 10

''سڑک کے دائیں بائیں پہاڑوں اور ڈھلوانوں پر مکئی کے کھیت، رات کے خاکستری رنگ کے بڑے بڑے قالین معلوم ہوتے تھے۔'' (لالٹین) 11

''مگو نالے کے ساتھ ساتھ اُگے ہوئے ناشپاتی کے درختوں کی ٹھندی ٹھنڈی چھاؤں، اخروٹ کے گھنے درختوں میں پرندوں کی نغمہ ریزیاں اور گیلی زمین پر سبز اور ریشمی گھاس، میرے دل و دماغ پر ایک خوش گوار تکان پیدا کر دیتی تھی۔'' (شیرو) 12

فطرت جس طرح کشمیر کے کھانے پینے، بول چال، کھیتی باڑی کے طور طریقوں کے پس منظر میں کام کرتی ہے اسی طرح یہاں کے لباس میں بھی اس کا بڑا دخل رہا ہے۔ سردی کے موسم میں لوگ اون کے گرم کپڑے پہنتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں ریشم کے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ عام طور پر لوگ رنگین کپڑے پسند کرتے ہیں جس کے پس منظر میں فطرت کا عمل دخل ہے۔ عورتوں کے لباس میں اس کا خاصا عمل دخل رہا ہے۔ عورتوں کے لباس رنگین پھولوں، ہریالی، خوشنما بیل بوٹوں سے سجے ہوتے ہیں۔ ان کے لباس کو دیکھ کر فطرت کے عمل دخل کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ منٹو نے اس کی بہترین عکاسی کی ہے:

''سبز لباس میں ملبوس وہ سڑک کے درمیان مکئی کا ایک قد دراز بوٹا معلوم ہو رہی تھی۔'' (بھیگو) 13

''وہ گہرے سبز رنگ کا دوپٹا اوڑھے ہوئے تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آس پاس کی ہریاول نے اپنی سبزی اُسی سے مستعار لی ہے۔ اُس کی شلوار بھی اُسی رنگ کی تھی۔ اگر کرتہ بھی اُسی رنگ کا پہنے ہوتی تو دور سے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ سڑک کے درمیان ایک چھوٹا سا درخت اُگ رہا ہے۔'' (موسم کی شرارت) 14

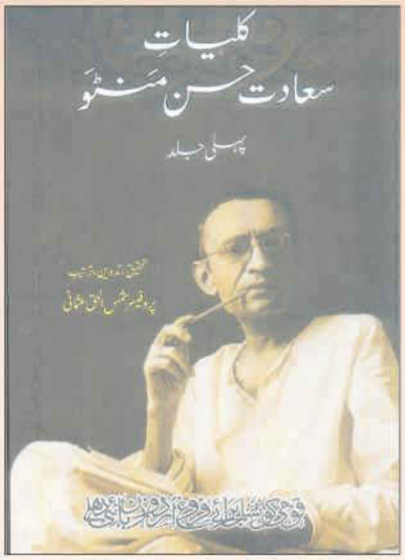

کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں جواں لڑکیاں عام طور پر بھینس، بکری، بھیڑ اور گائے پالنا، لکڑی توڑنا اور دودھ گھر گھر لے جانا، کپڑے دھونا اور جنگلی سبزی چننے کا کام کرتیں ہیں۔ پہاڑی لوگ ان بھینس، بکریوں سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں اور یہی کام اُن کے روزگار میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ منٹو نے یہاں کے لوگوں کے ذریعے معاش بالخصوص عورتوں اور جواں سال لڑکیوں کے معاش کی بہترین عکاسی کی ہے۔ یہ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

''جھونپڑے سے کچھ دُور جھاڑیوں کے پاس لڑکی کی گائیں گھاس چر رہی تھیں۔'' (موسم کی شرارت) 15

''صبح سویرے اُٹھتی ہوں اور چھلاں (بھینس کا نام) کو لے کر گھاس چرانے کے لیے باہر چلی جاتی ہوں... ں شام کو پانی بھرتی ہوں۔ ہر روز میرا یہی کام ہے۔'' (بھیگو) 16

''جھاڑیوں کے پیچھے کوئی بیٹھا خشک ٹہنیاں توڑ رہا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور سلیپر پہن کر اُس طرف روانہ ہوا کہ دیکھوں کون ہے۔ ایک لڑکی تھی جو خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا باندھ رہی تھی۔'' (شیرو) 17

کشمیر میں موسم سرما میں شدت کی سردی ہوتی ہے اور برف باری کی وجہ سے اس سردی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے کشمیر میں مکانات بھی ایک خاص طرز سے تعمیر ہوتے ہیں۔ مکان عام طور پر انیٹوں، پتھروں اور لکڑی کے بنے ہوتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں کچھ مکان خالص لکڑی کے بنے ہوتے ہیں اور کچھ کچی مٹی کے ہوتے ہیں جن کے چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں۔ ان کمروں میں کھڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں اور فرش اور دیوار، گاڑھے مٹی سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ منٹو اس کا ذکر افسانے 'شیرو' میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''چیڑ اور دیودار کے ناہموار تختوں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا مکان تھا جسے چوبی جھونپڑا کہنا بجا ہے... چھت ٹین سے پاٹی ہوئی تھی۔... کمرے کا فرش خالص مٹی کا تھا جو کپڑوں کو چمٹ جاتی تھی۔'' (شیرو) 18

منٹو نے کشمیر کی فطری خوبصورتی کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگوں کی مفلسی، لاچاری، معصومیت، شریف النفسی، رواداری، مہمان نوازی، بول چال، اندازِ گفتگو اور احترام آدمیت کو افسانوی پیرایے میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ منٹو کے افسانوں کا مطالعہ کر کے یہاں کی ہریالی، پھولوں اور میووں سے معطر ہواؤں، دراز قد کے درختوں اور پرندوں کی نغمہ ریزیوں کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کے ذریعۂ معاش، لباس، رسم و رواج اور انداز فکر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ غرض منٹو کے افسانوں میں کشمیری تہذیب بالخصوص کشمیری پہاڑی تہذیب کا کافی سرمایہ سما گیا ہے۔

حوالہ جات

1. The meaning and proces of culture ; Govind Chandra pande p 19
2. طارق سعید: اردو ادب کا تہذیبی پس منظر ص 21
3. ڈاکٹر عابد حسین: قومی تہذیب کا مسئلہ، ص 29
4. شمس الحق عثمانی مرتب: کلیات منٹو جلد اول ص 265
5. ایضاً، ص 135
6. ایضاً، ص 136
7. ایضاً، ص 140
8. ایضاً، ص 136
9. ایضاً، ص 149
10. ایضاً، ص 259
11. ایضاً، ص 517
12. ایضاً، کلیات منٹو جلد دوم، ص 39
13. شمس الحق عثمانی، مرتب: کلیات منٹو، جلد اوّل، ص 259
14. ایضاً، ص 250
15. ایضاً، ص 251
16. ایضاً، ص 267
17. ایضاً، کلیات منٹو جلد دوم، ص 40
18. ایضاً، ص 36

■

Khursheed Ahmad Research Scholar, Dept of Urdu, MANUU, Hyderabad (Telangana)
Mob.: 8019414247

ریحان حسن

ولی الحق انصاری کی غزل میں تلمیحات

دنیائے شعروسخن کے ہر ذہین وفطین شخص کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اس کی شاعری منفرد رنگ و آہنگ سے پر ہوتا کہ اسے صاحب طرز قرار دیا جاسکے۔ پروفیسر محمد ولی الحق انصاری کا شمار اسی قبیل کے شعرا میں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بے عدیل محقق، لاجواب مدرس، بے مثل انشا پرداز اور مایہ ناز نقاد بھی تھے۔ بلاشبہ ان کے شعری مجموعہ ہائے کلام غزالان خیال، فروغ شعلۂ دل، شاہدان معانی، گلزار نقوش زیبا، انفاس گرم، اور کہکشاں نے اردو شعرا کو ایک نئے رنگ سے آشنا کیا جبکہ شعلۂ ادراک، خرمن گل، گل افشانِی خیال، انتخاب کلام دکتر ولی الحق، چراغ عشق اور شب چراغ فارسی شاعری میں کوس لمن الملک الیوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دراصل ولی الحق فارسی زبان وادب کے پروفیسر تھے لیکن انھوں نے اردو شاعری کو بہت توانائی بخشی بقول پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی:

''پروفیسر انصاری نے مشاہدات وتجربات کا ایک وسیع خرمن جمع کیا ہے اور ان پر نظم کے بجائے غزل کی جمالیات کو بڑی مہارت کے ساتھ عائد کردیا ہے۔''

(غزالان خیال، ص 15 مطبوعہ نامی پریس 1980)

ولی الحق کی شاعری میں ماضی کی شاندار روایات اور حال کے میلانات و رجحانات کا دل نشیں اور دلکش امتزاج نظر آتا ہے۔

ولی الحق انصاری نے اپنی شاعری کو محدود تلمیحات کے حصار سے نکالا اور اس طرح انھوں نے اردو شاعری کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی۔ ولی الحق ولی نے اپنی غزلوں میں نئی نئی تلمیحات اس قدر خوبصورتی اور چابکدستی سے استعمال کی ہیں کہ کہیں کہیں محسوس ہوتا ہے یہ تلمیحات اردو زبان کے لیے ہی وضع کی گئیں تھیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں نئی نئی تلمیحات کے ذریعے نت نئے حقیقی واقعات وحادثات کی جانب اس طرح متوجہ کیا ہے کہ وہ سارے واقعات وحادثات نظروں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ یہاں ان کی ایک منفرد غزل پیش ہے جس کا ہر شعر تلمیحی ہے۔ مطلع ہے:

رونق نہ پھر سے دے سکا دل کے نگر کو میں
آباد کر نہ پایا پھر اس استخر کو میں

پروفیسر ولی الحق نے اس شعر میں جو تلمیح نظم کی ہے وہ قدیم زمانے کے واقعات کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ دراصل استخر ایران کی پہلی شہنشاہیت یعنی ہخامنشی خاندان کا دارالحکومت تھا جو بہت ہی خوبصورت اور شاندار شہر تھا جس کے کھنڈرات ایران میں آج بھی اپنی عظمت رفتہ کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ولی الحق نے اس شعر میں دل کو استخر سے تشبیہ دے کر یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ استخر ایک زمانے میں بڑا شہر تھا لیکن اب وہ کھنڈر میں تبدیل ہوچکا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت میرے دل کی ہے۔ اس غزل کے دوسرے شعر میں بھی ایسی ہی تلمیح دیکھنے کو ملتی ہے:

ہے آج بھی نمونہ مدائن کا زندگی
ایواں کی شکل دے نہ سکا اس نگر کو میں

مدائن ساسانی خاندان کا دارالحکومت تھا یہ بھی بہت ہی خوبصورت شہر تھا مگر اب وہ کھنڈر بن چکا ہے۔ لیکن اب بھی اس کے کھنڈرات بغداد کے قرب ونواح میں دیکھنے کو ملتے ہیں اس شعر میں دل کو مدائن سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ولی الحق انصاری نے یہ بتایا ہے کہ مدائن جیسا سرسبز و شاداب اور آباد شہر کھنڈر میں تبدیل ہوچکا ہے اس طرح میرا دل بھی کھنڈر بن چکا ہے یعنی اب ہر قسم کی خواہش معدوم ہوچکی ہے۔

ولی الحق انصاری قد آور شاعر ہیں جنھوں نے خالص ہندوستانی تلمیحات کو نظم کرکے شعرا کو ایک نئی راہ دکھائی ہے بلاشبہ ولی الحق کو مہابھارت کے واقعات کو تلمیح کی شکل دینے میں خاصی دلچسپی رہی ہے اور اس طرح انھوں نے قارئین کو ہندکی روایات سے بھی آشنا کرانے کا فریضہ انجام دیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

مثل ویاس جہد و عمل کی کتاب میں
ترتیب دوں گا ایک نئے چیپٹر کو میں

ویاس مہابھارت کے مصنف تھے جن کا کارنامہ مہابھارت کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ دراصل مہابھارت ایک عظیم جنگ کا منظر ہے وہاں کرشن جی نے ارجن کو لڑنے کی تعلیم دی کیونکہ ارجن جب میدان کارزار میں پہنچے تو دیکھا کہ میدانِ جنگ میں جتنے بھی لوگ ہیں وہ سارے کے سارے رشتہ دار ہیں چنانچہ اس موقعے پر کرشن نے ارجن کو بتایا کہ سچائی کی فتح کے لیے لڑنا ضروری ہے اور اگر تم لڑوگے تو کوئی نہیں مرے گا اس لیے کہ روح لافانی شے ہے یہ انسان جو مرتا ہوا نظر آرہا ہے وہ دراصل قید جسم سے آزاد ہورہا ہے انسان مرنہیں رہا ہے۔

(شری بھگوت گیتا مطبوعہ گیتا پریس گورکھپوری)

کرشن نے مہابھارت کے ایک پاٹھ گیتا میں بالکل نیا فلسفہ پیش کیا ہے کہ روح لافانی شے ہے اس شعر میں ولی الحق نے ویاس کی تلمیح کو استعمال کرکے یہ بتایا ہے کہ جس طرح ویاس نے مہابھارت لکھ کر انسانوں کو عظیم جنگ کے منظر کو پیش کرتے ہوئے مہابھارت کے چیپٹر

گیتا میں ایک نیا فلسفہ پیش کیا اسی طرح میں بھی دنیا کے سامنے ایک نئی چیز پیش کروں گا:

جب ہوں گے مجھ پہ وار زنانوں کی آڑ سے
ہنستا رہوں گا پھینک کے تیغ و سپر کو میں

اس شعر میں ولی الحق نے طویل تلمیح استعمال کی ہے اس شعر میں بھی مہابھارت کی جنگ کی طرف اشارہ ہے۔ دواپر میں راجہ شانتنو کے بیٹے بھیشم پتامہ بہت شجاع و بہادر تھے۔ راجہ کا دل धिवर (دھیور) (ملاح) کی لڑکی پر آگیا چنانچہ انھوں نے دھیور کی لڑکی سے شادی کا پیغام دیا۔ دھیور نے راجہ کو جواب دیا کہ تمھارے بعد تو تمھارے وارث بھیشم ہوں گے اگر میں اپنی بیٹی کی شادی تم سے کردوں تو میری بیٹی کی اولاد کی حیثیت کیا ہوگی۔ اس کی اطلاع جب بھیشم کو ہوئی تو انھوں نے ولی عہدی سے انکار کردیا لیکن اس کے بعد بھی دھیور اپنی لڑکی کی شادی کے لیے آمادہ نہ ہوا اس نے کہا کہ بھیشم نے ولی عہدی سے انکار کردیا ہے لیکن اس کے لڑکے تخت کا دعویٰ کریں گے بھیشم کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے پرتگیہ (قسم کھانا) کی کہ وہ شادی ہی نہیں کریں گے تاکہ میرے بعد تخت کے دعوے کا سوال ہی پیدا نہ ہو چنانچہ شانتنو مچھیرے کی بیٹی سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے جس سے دو لڑکے ہوئے جن کا نام وچتر ویر اور چترانگد ہوئے۔ باپ کے انتقال کے بعد بھیشم ہی اپنے بھائیوں کے سرپرست ہوئے جب وہ جوان ہوئے تو بھیشم کو ان کی شادی کی فکر ہوئی چنانچہ ایک راجہ کاشی راج کے تین بیٹیاں انبا، انبیکا، انبالیکا تھیں ان کو وہ اٹھا لائے انبالیکا، انبیکا کی شادی وچتر ویر اور چترانگد سے کردی لیکن ایک بہن انبا بچ گئیں۔ انبا نے کہا کہ میں پہلے سے اپنے شوہر کا چناؤ کرچکی ہوں تو بھیشم نے اسے باعزت طریقے سے शालव (شالو) راجہ کے پاس بھیج دیا مگر اس نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ تب وہ دوبارہ بھیشم کے پاس آئیں۔ بھیشم شالو کے پاس خود گئے لیکن وہ راجہ انبا کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوا بالآخر انبا نے دونوں طرف سے مایوس ہوکر شنکر بھگوان کی تپسیا کی اور بالآخر شنکر بھگوان سے قول لیا کہ میں ہی بھیشم کی موت کا سبب بنوں وہی دوسرے جنم میں سکھنڈی کی شکل میں پیدا ہوئی مہابھارت جنگ میں جب کورو پانڈو جنگ ہورہی تھی تو ایک بار بھیشم پتامہ نے پانڈوؤں کو ہرادیا بالآخر مایوس ہوکر شری کرشن نے بھیشم سے پانڈو کی بیوی دروپدی کو ہمیشہ سہاگن رہنے کی دعا بھیشم سے دلائی چنانچہ دعا کی عزت برقرار رکھنے کے لیے بھیشم نے شری کرشن سے کہا کہ تمھاری فوج میں جو سکھنڈی نام کا جنگجو ہے وہ پہلے جنم میں عورت تھی لہٰذا وہ آج بھی میری نظروں میں عورت ہی ہے اس لیے اگر وہ جنگ کرنے کے لیے سامنے آئے گا تو اس پر میں ہتھیار نہیں چلاؤں گا اگلے دن جنگ میں ارجن سکھنڈی کو آگے کرکے بھیشم سے نبرد آزما ہوئے بھیشم نے سکھنڈی کو پہچان لیا ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ کسی زنانہ پر تیر چلائیں چنانچہ سکھنڈی کو دیکھتے ہی بھیشم نے اپنے ہتھیار چلانا بند کردیے ارجن نے موقع پاکر بھیشم کو تیروں سے چھلنی کردیا۔

(مہابھارت 279 تا 283 مطبوعہ گووردھن پستکالیہ متھرا)

اس تلمیح کے ذریعے ولی الحق یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بھیشم کے مثل میں بھی اتنا باہمت ہوں کہ میں مرجانا تو پسند کروں گا لیکن کسی زنانہ پر وار کرنا پسند نہ کروں گا:

یہ جانتے ہوئے بھی کہ مقصد ہے اس کا کیا
دے ڈالوں گا کوچ کو بھی دریوزہ گر کو میں

اس شعر میں کوچ کی تلمیح استعمال کرکے کرن کی جانب ملتفت کیا گیا ہے۔ دراصل کرن پانڈوؤں کی ماں کنتی کا بیٹا تھا جو پانڈوؤں کی جانب نہیں تھا بلکہ وہ کورووں کی طرف سے لڑرہا تھا کیونکہ وہ دریودھن کا دوست تھا دریودھن کی ماں گاندھاری سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے دریودھن پر آنچ نہیں آسکتی اور اس نے وعدہ وفا بھی کیا اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بہت سخی تھے صبح کے وقت نہانے کے بعد وہ لوگوں کو بخشش دیا کرتے تھے ان کے لیے مشہور یہ تھا کہ اس وقت ان کے سامنے کوئی بھی سوالی آجاتا ہے تو وہ خالی ہاتھ واپس نہیں جاسکتا کرشن کو بخوبی یہ معلوم تھا کہ جب تک کرن زندہ ہیں کورووں کو شکست نہیں دی جاسکتی۔ چنانچہ انھوں نے دیوراج اندر کو براہمن کی شکل میں کرن کے پاس अमोग रक्षा اموگھ رکچھا (زرہ) بخشش میں طلب کرنے کے لیے بھیجا جب کرن سے اندر نے بخشش میں کوچ مانگا تو کرن سمجھ گئے کہ یہ دیوراج اندر ہیں لیکن سخاوت کے جذبے اور اپنی بخشش کی عادت کی عزت کی بقا کی خاطر اپنا کوچ (زرہ) دے دیا اور وہ میدان جنگ میں بغیر زرہ کے پہنچے لیکن پھر بھی انھیں مارا نہ جاسکا یہاں تک کہ ان کے رتھ کا پہیا نکل گیا چنانچہ اسے درست کرنے کے لیے انھیں رتھ سے نیچے اترنا پڑا کرشن نے ارجن کو اشارہ کیا کہ اسی وقت انھیں تیر کا نشانہ بنالیا جائے چنانچہ قوانین جنگ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ارجن نے کرن کو تیر کا نشانہ بنالیا۔

(مہابھارت گووردھن پستکالیہ متھرا)

اس طرح ولی الحق نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جو حقیقی سخی ہوتا ہے وہ اپنی سخاوت پر آنچ نہیں آنے دیتا خواہ اس کی زندگی ہی داؤ پر کیوں نہ لگ جائے:

سب ساتھیوں کے برف میں دھنسنے کے باوجود
رکھوں گا برف زار میں جاری سفر کو میں

پروفیسر ولی الحق انصاری نے اس شعر میں بھی مہابھارت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ مہابھارت کی عظیم جنگ کے بعد جب کورووں اور پانڈوؤں کا خاندان ختم ہوگیا تو پانچوں پانڈو یعنی یدھشٹر، بھیم، ارجن، نکل، سہدیو اور ارجن کا ایک پوتا پرکچھت زندہ رہ گیا پانچوں پانڈوؤں نے دنیا سے برگشتہ ہوکر دنیا ہی کے راستے سورگ (جنت) جانے کا عزم کیا چنانچہ یہ پانچوں ہمالیہ کے برفستان کی جانب چلے کیونکہ یہی سورگ جانے کا راستہ ہے۔ جب یہ ہمالیہ پر چڑھنے لگے تو برف میں دھنسنے لگے۔ جب بھی کوئی برف میں دھنستا تو وہ سوال کرتا کہ بالآخر میرا گناہ کیا ہے کہ سورگ میں جانے سے قبل میں برف میں دھنس گیا۔ برف میں دھنسنے والے پانڈوؤں کی یدھشٹر کمزوری کو بتا دیتے اس طرح یدھشٹر کے چاروں بھائی برف میں دھنس گئے اور یدھشٹر تن تنہا سورگ (جنت) کے سفر کے لیے چلتے رہے۔

(مہابھارت 582 تا 584 مطبوعہ گووردھن پستکالیہ)

اس شعر کی تلمیح میں برف مصائب اور جدوجہد کا سمبل سفر کو قرار دیا گیا ہے جس کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا میں خواہ کتنی ہی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے لیکن جو مشن میں لے کر چلا ہوں اس مشن کو پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچاؤں گا۔

بلاشبہ ولی الحق نے خالص ہندوستانی تلمیحات نظم کرکے اردو زبان کو صحیح معنوں میں ہندوستانی ادب کہلانے کا مستحق بنایا ہے اور ہندو مسلمان اتحاد کی بنیادوں کو بھی مضبوط کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ حب وطن کا بھی پیغام دیا ہے۔

اگر آپ اس غزل کا مطالعہ کریں تو یہ اندازہ ہوگا کہ مہابھارت کے واقعات پر گہری نظر کے ساتھ ساتھ ولی الحق کی عالمی واقعات پر بھی نظر ہے کیونکہ قدیم یونانی ادب میں یونان اور Troy کی لڑائیوں کا ذکر ہے۔ ولی الحق نے اس واقعے کو بھی اس غزل میں بطور تلمیح برتا ہے:

ہکٹر کی طرح موت کے کامل یقیں کے ساتھ
آنے نہ دوں گا پاس کبھی اپنے ڈر کو میں

موجودہ ترکی کے مغرب میں ایک شہر Troy تھا شہر کے بادشاہ پرائم (Priam) کے دو بیٹے ہیکٹر اور پیرس تھے۔ پیرس ایک یونانی شہزادی HEUN کو بھگا لایا چنانچہ

انتقامی جذبے کے تحت پورے یونان نے متحد ہوکر ٹرائے پرحملہ کیا ان یونانی حکمرانوں میں اکیلس HILIOOS نامی ایک شخص تھا۔ ولادت کے بعد اس کی ماں نے اس کی ایڑی پکڑ کر ایک چشمہ میں غوطہ دیا تھا چشمے کا پانی جسم کے جس حصے پر لگا تھا اس پر ہتھیار اثر انداز نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن چونکہ ایڑیاں ماں کے ہاتھ میں تھیں اس لیے ایڑیوں پر پانی نہ پہنچ سکا اور یہی اکیلس کی کمزوری کا سبب قرار پایا میدان جنگ میں اکیلس کے مقابلے کے لیے ہیکٹر نکلا اگرچہ وہ جانتا تھا کہ اکیلس کو مارنا ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کے جسم پر ہتھیار کارگر نہ ہوسکتے تھے پھر بھی اس نے جنگ سے منہ نہیں موڑا اور انجام کار مارا گیا ہیکٹر کا چھوٹا بھائی پیرس واقف تھا کہ اکیلس کی ایڑی پر پانی نہیں پہنچا تھا اس لیے اس نے میدان جنگ میں پہنچ کر اکیلس کی ایڑیوں کا نشانہ لگا کر تیر مارا اور اکیلس مرگیا ولی الحق نے Trojenwar کی تلمیح استعمال کرکے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ موت کے کامل یقین کے بعد بھی بہادر شخص مقصد کو پانے کی خاطر جنگ سے منہ نہیں موڑتا بلکہ وہ موت کی پروا کیے بغیر اپنے قدم کو آگے بڑھاتا رہتا ہے:

لوٹس خوروں کی طرح پڑا سوچتا ہوں یہ
سب ہیچ ہے تو کیوں پیوں خون جگر کو میں

یونانی سردار یولیسس فتوحات کرتے ہوئے شمالی افریقہ کے ساحل پر پہنچ گیا اس کی فوج بالکل تھک چکی تھی وہاں ان کو ایک پھل نظر آیا جسے انھوں نے کھایا اور اس کا اثر ان کے دماغ پر یہ ہوا کہ وہ یہ سوچنے لگا کہ جب دنیا میں زیادہ رہنا ہی نہیں ہے تو اس کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا بیکار ہے اس لیے جتنے دن دنیا میں رہو سکون کے ساتھ رہو اور کسی قسم کے ذہنی دباؤ میں مبتلا رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ولی الحق لوگوں کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ جب ہر چیز کا انجام خاتمہ ہے تو پھر یہ جدوجہد اور پریشانیوں میں پڑنے سے کیا حاصل ہے یعنی جنگ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ سب چیزیں ختم ہوجانے والی ہیں تو پریشانیوں کا سامنا کرنا سراسر حماقت ہے اسی مفہوم کو انھوں نے ایک دوسری تلمیح استعمال کرکے کچھ اس انداز میں کیا ہے:

جب منزل حیات کا کوئی پتا نہیں
کیوں ختم اس جگہ پہ نہ کردوں سفر کو میں

مشہور ایرانی فلسفی مانی اور جرمن فلسفی شوپن ہار کے قنوطی فلسفے کی جانب انھوں نے متوجہ کیا ہے۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ "Life is cruel joke which has been played by nature upon man" یعنی زندگی قدرت کی جانب سے انسان کے خلاف کھیلا گیا ایک تکلیف دہ مذاق ہے اور بقول مانی ایک سمجھدار انسان کو اس مذاق کو ختم کردینا چاہیے یعنی ولی الحق یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب زندگی کا انجام ہی معلوم نہیں ہے تو جتنی جلد اس زندگی کا سفر ختم ہوجائے اتنا ہی بہتر ہے:

کیا فائدہ بڑھانے سے بیکار کی تھکن
رک کر یہیں پہ کھول نہ دوں کیوں کمر کو میں

اس شعر کی تلمیح میں لوٹس اور ایٹرس کی جانب اشارہ ہے دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جدوجہد سے کوئی فائدہ نہیں محض یہ کہ پریشانیوں اور تھکن میں مزید اضافہ ہوگا اس لیے یہیں پر کمر کو کھول کر سفر کو ختم کردیا جانا چاہیے:

کشتی میں موت کی ہوں سوار اور چلا ہوں اب
کنگ آرتھر کی طرح جہانِ دگر کو میں

پروفیسر ولی الحق نے اس شعر میں قبل تاریخ انگلینڈ کے ایک بادشاہ آرتھر کی جانب اشارہ کیا ہے جس نے اپنے بہادروں کی ایک راؤنڈ ٹیبل بنائی تھی جس کا ایک ممبر سر بیڈیویر تھا۔ آرتھر جب ایک لڑائی میں شکست کھا کر موت سے ہمکنار ہورہا تھا تو اس نے بیڈیویر سے کہا کہ اسے ساحل تک پہنچادو چنانچہ آرتھر کو لے کر بیڈیویر ساحل پہ گیا تو اس نے دیکھا کہ دور سے چلتی ہوئی ایک کشتی آرہی ہے آرتھر اس کشتی پر سوار ہوکر نظروں سے غائب ہوگیا۔ کنگ آرتھر کی تلمیح کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ زندگی کی جنگ میں شکست کا انجام موت کا سفر ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے شعر میں بھی تلمیح جو استعمال کی ہے وہ بھی کنگ آرتھر کے واقعہ سے متعلق ہے:

رخصت ہو مجھ سے دوستو مثلِ بیڈیویر
اب چھوڑ کر رباط کو جاتا ہوں گھر کو میں

دراصل دنیا آرتھر کے لیے ایک سرائے تھی جسے وہ چھوڑ کر اب اصلی مکان کی جانب جارہا تھا اس طرح ولی الحق نے یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ یہ دنیا محض ایک سرائے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بعد کی جو دنیا ہے وہی دنیا اصل مکان کی حیثیت رکھتی ہے:

گرابن فیلقوس کہے مانگ اے فقیر
قبضے میں آج رکھتا ہوں ہر بحر و بر کو میں
دوں گا یہی جواب 'مری دھوپ چھوڑ دے'
قزاق سے طلب نہ کروں مال و زر کو میں

ان دونوں اشعار میں ولی الحق نے سکندر اور دیوجانس کلبی کی ملاقات کی جانب ملتفت کیا ہے۔ یونان میں ایک گروہ فلسفیوں کا تھا جو STOICS کہلاتے تھے جو زندگی کو زیادہ اہمیت دینے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ نہ یہاں کے غم رنجیدہ ہونے کے لائق ہیں اور نہ یہاں کی خوشی قابل التفات ہے یعنی یہاں کی خوشی اور غم دونوں ہی توجہ کے مستحق نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب انسان خوشی وغم سے بے نیاز ہے تو اسے کسی سے مانگنے کی احتیاج بھی نہیں ہے۔ سکندر کو یہ چیز بہت ناگوار تھی کہ ایک شخص ایسا بھی ہے جو اس کی شہرت، دولت، طاقت الغرض کسی چیز سے مرعوب نہیں ہوتا ایک موقعے پر سکندر ایک بڑی لڑائی جیت کر آیا دیوجانس ایک درخت کے نیچے لیٹا دھوپ سینک رہا تھا۔ سکندر اس زعم ناقص میں کہ میں عظیم جنگ میں فتح یاب ہوا ہوں دیوجانس کے پاس آکر کہا کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ دیوجانس اسی طرح لیٹا رہا اور صرف یہ جواب دیا کہ تم میرے سامنے کھڑے ہوکر میری دھوپ روک رہے ہو لہٰذا تم سامنے سے ہٹ جاؤ یعنی اس نے کثیر مال وزر کے بجائے ایک معمولی سی چیز مانگی شاعر نے ان اشعار میں اس تلمیح کو برت کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جو صاحب عرفان ہوتا ہے اس کے نزدیک خوشی اور غم کی کوئی حقیقت نہیں جس کے نتیجے میں دنیوی عزت و ثروت اور مال و دولت کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا:

اٹ، ٹے۔ بروٹ کافی ہے تنبیہ کے لیے
سمجھوں نہ اب نہ دوست کسی بھی بشر کو میں

اس شعر کی تلمیح میں جولیس سیزر کے قتل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے قاتلوں میں اس کا دوست بروٹس بھی تھا جب بروٹس نے وار کیا تو سیزر نے کہا ET, TE< BRUT (یعنی اے بروٹ تو بھی) سیزر کے اس جملے سے شاعر نے متنبہ کیا ہے کہ ہمیں کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ دنیا قابل اعتبار نہیں ہے۔ قریب سے قریبی شخص بھی دھوکہ دے سکتا ہے:

جانا تھا 'ایل، ڈی-راڈو' غلط، اب پتا چلا
خالی شکم میں کیا کروں انبارِ زر کو میں

''ایل، ڈی-راڈو'' کا مطلب ہوتا ہے City of Gold (سونے کا شہر) روسو فرانس کا ایک فیزیوکریٹ (ماہر اقتصادیات) تھا جس کا کہنا تھا کہ دولت زراعت سے پیدا ہوتی ہے وہ بیان کرتا ہے کہ دو بھائی تھے۔ ایک کو سونے کی ہوس تھی اور دوسرا قناعت پسند تھا۔ بھائی کے کہنے پر یہ قناعت پسند بھی سونے کے شہر کی طرف روانہ ہوا لیکن ایل، ڈی راڈو پہنچنے سے قبل وہ رک گیا اور اس نے وہاں زراعت شروع کردی لالچی بھائی ایل، ڈی۔ راڈو پہنچا جتنا سونا لادسکتا تھا اس نے لادلیا اور لے کر واپس

آ گیا لیکن راستے میں کھانا ختم ہوگیا اور فاقوں سے نڈھال اس جگہ پہنچا جہاں اس نے اپنے بھائی کو چھوڑا تھا اس نے بھائی سے کھانا مانگا بھائی نے کہا تمام سونا دے دو تو میں تمھیں کھانا دوں گا مجبوراً یہ شرط اسے ماننا پڑی اور تمام سونا بھائی کو دے دیا پھر اس قانع بھائی نے سمجھایا کہ اصل چیز زراعت ہے سونا نہیں ہے۔ شاعر نے اس شعر میں یہ کہنا چاہا ہے کہ انسان کی بنیادی ضرورت غذا ہے دولت نہیں ہے۔ ثروت و دولت کی کوئی حقیقت نہیں ہے دولت تو محض غذا حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے:

پینے کے بعد زہر بھی کامل سکوں کے ساتھ
درس نظارہ دوں گا ہر اک دیدہ ور کو میں

اس شعر کی تلمیح میں سقراط کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جس نے زہر پیتے پیتے CRITO کو زندگی کے مفہوم سے آگاہ کردیا کہ انسان کی روح غیر فانی ہے زہر روح کو ختم نہیں کرسکتی ولی الحق نے اس شعر کی تلمیح کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ ایک عارف کے نزدیک موت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ آخر وقت تک لوگوں کو درس عرفان دیتا رہتا ہے:

چکھنے کے بعد تلخی دار و صلیب و تیغ
حق آشنا کروں گا ہر اہل نظر کو میں

پروفیسر ولی الحق انصاری نے اس شعر کی تلمیح سے مختلف لوگوں کی جانب متوجہ کیا ہے جنھوں نے حقانیت کے لیے اپنی جانیں قربان کردی ہیں اس قبیل کی تلمیحات اردو شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہیں لیکن ایسی تلمیح جو ایک ہی ساتھ مختلف واقعات کی جانب متوجہ کردے شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں یہ شعر ہمیں ایک ساتھ حضرت عیسیٰ، منصور، سقراط وغیرہ کے واقعات یاد دلانے لگتے ہیں۔ ولی الحق نے یہ بتایا ہے کہ ایک عارف کے نزدیک موت کی کوئی حقیقت نہیں ہے وہ آخر تک درس عرفان دیتا رہتا ہے:

مقصد کو دوں گا باردگر تازہ زندگی
میداں میں گرم ریت پہ کٹوا کے سر کو میں

واقعہ کربلا کی تلمیح کو مختلف شعرا نے اپنی اپنی غزلوں اور نظموں میں استعمال کیا ہے۔ موجودہ دور میں افتخار عارف کے یہاں کربلا بطور استعارہ واقعہ کربلا کے اردگرد گھومتا ہے۔ اس کے علاوہ پروین شاکر، ناصر کاظمی، مجید امجد، منیر نیازی، عرفان صدیقی، پروفیسر انیس اشفاق نے واقعہ کربلا کی تلمیح برت کر بہت اچھے اچھے اشعار کہے ہیں چونکہ واقعۂ کربلا کا کینوس بہت وسیع ہے اس لیے شعرا نے اپنے اپنے انداز سے واقعہ کربلا کو نظم کیا ہے جس سے امن و آشتی اور حریت کا درس ملتا ہے۔ ولی الحق اس شعر میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک حق پرست اچھے مقصد کو پانے کے لیے جان کی کوئی وقعت نہیں سمجھتا:

جوہر کی رسم کرکے ادا ایک بار پھر
چھوڑوں نہ بعد مرگ ہی اپنے نگر کو میں

اس شعر میں راجپوتوں کی اس رسم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جنگ میں شکست کھانے کے بعد بھی راجپوت میدان سے فرار اختیار نہ کرتے تھے بلکہ آخری شخص بھی میدان جنگ میں لڑتے ہوئے جان دے دیتا تھا اور ان کی عورتیں جوہر کی رسم یعنی خودسوزی کرلیا کرتی تھیں۔ یہاں شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ کوئی بھی شخص زندہ رہے اسے اپنے جیتے جی اپنے وطن کو دشمن کے سپرد نہیں کرنا چاہیے:

عظمت کا اپنی سینۂ مانڈو گواہ ہے
کیسے بھلاؤں ہند کے اس استخر کو میں

پروفیسر ولی الحق انصاری نے اس تلمیح کو استعمال کرکے ایک تاریخی واقعے کی جانب توجہ ہماری مبذول کرائی ہے۔ ہمارے تاریخی مقامات ہمیں ہماری گذشتہ عظمت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ دراصل مانڈو مالوے کے مسلم حکمرانوں کا دارالحکومت تھا جواب ویران ہوچکا ہے اور اس کی حیثیت ہندوستان میں استخر کے مثل ہوکر رہ گئی ہے لیکن مانڈو کے کھنڈرات آج بھی اس کے حکمرانوں کی عظمت رفتہ کا پتہ دیتے ہیں۔ اس قبیل کی تلمیحات کے علاوہ انگریزی ادب کے شیکسپیئر کے ڈرامے کے واقعات کو بھی بطور تلمیح ولی الحق نے استعمال کیا ہے:

دھوکے میں رکھ سکیں گے نہ مجھ کو تھری وچز
پہچاننے لگا ہوں ولی اہل شر کو میں

اس شعر میں قدیم انگلینڈ کے بادشاہ میک بیتھ کی جانب اشارہ کیا ہے جو شیکسپیئر کے ڈرامے کا موضوع ہے۔ میک بیتھ اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ ڈنکن کا ایک سردار تھا۔ Leady Macbeth کے اکسانے پر وہ ڈنکن کو قتل کرنے پر راضی ہوگیا۔ چنانچہ سازش کی کامیابی کے بعد میک بیتھ بادشاہ ہوگیا اور اس نے ظلم ڈھانا شروع کردیا چنانچہ اس کے خلاف بغاوت بھڑک اٹھی لہٰذا اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے میک بیتھ روانہ ہوا۔ دشمنوں سے مقابلہ کے لیے جاتے وقت اسے راستے میں تین بھوتنیاں ملیں جن سے اس نے پوچھا کہ جنگ کا انجام کیا ہوگا۔ بھوتنیوں نے جو جواب دیے وہ دھوکے میں رکھنے والے تھے جیسے یہ کہا کہ MEC DUFF کے بجائے تم Thene Fife ہوجاؤ گے دوسرے یہ کہ تمھیں عورت سے پیدا کیا ہوا شخص مار نہیں سکے گا تیسرے یہ کہ جب تک Birname کا جنگل اپنی جگہ سے نہ ہٹے گا تم شکست نہیں کھا سکتے۔ ان ذومعنی پیشین گوئیوں سے میک بیتھ دھوکا کھا گیا۔ جب ڈنکن کو قتل کرکے میک بیتھ بادشاہ ہوگیا تو اس نے بھوتنیوں کی ہر بات کو صحیح تسلیم کرلیا اور سوچا کہ جب تک Birname کا جنگل حرکت میں نہ آئے اسے شکست نہیں ہوسکتی اور ظاہر ہے کہ جنگل حرکت میں نہیں آسکتا لیکن جب وہ میدان جنگ میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ جنگل حرکت کرتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا ہے اور وہ اس طرح کہ بینکو کی فوج نے درختوں کی شاخیں کاٹ لی ہیں اور وہ انھیں لیے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں اس طرح جنگل حرکت میں آچکا تھا جب میک بیتھ اور Thene کا آمنا سامنا ہوا تو اس نے اشارہ کیا کہ مجھے عورت سے پیدا ہوا شخص مار نہیں سکتا تو Bankoe نے جواب دیا کہ میں اپنی ماں کے پیٹ چاک کیے جانے کے بعد آپریشن کرکے نکالا ہوں اس طرح میں عورت کا پیدا کیا ہوا نہیں ہوں۔ اس طرح بھوتنیوں کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور بینکو کے ہاتھوں میک بیتھ مارا گیا۔

ولی صاحب نے تھری وچز کو بطور تلمیح اس غزل میں استعمال کرکے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ میں اہل شر کو بخوبی جانتا ہوں کہ ان کی باتوں میں کس قدر فریب اور دھوکہ ہوتا ہے اس لیے میں اہل شر کے مفاہیم کو سمجھنے لگا ہوں کہ یہ اہل شر کہتے تو کچھ ہیں لیکن مقصد کچھ اور ہوتا ہے اسی بات کو کہنے کے لیے شیکسپیئر کے ایک کیریکٹر میک بیتھ کا انتخاب کیا جو تین بھوتنیوں کی ذومعنی پیشین گوئیوں کی وجہ سے برباد ہوگیا۔

بلاشبہ اس غزل کے مطالعے سے اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے کہ ولی الحق انصاری کو تلمیحات استعمال کرنے میں قدرت تامہ حاصل ہے اور یہی نہیں بلکہ ان تلمیحات کے نئے طریقوں سے استعمال کرکے شاعری اور ادب میں بلاغت کی روح پھونکتے ہوئے شعرا کو اس جانب متوجہ کیا ہے کہ صرف بندھی ٹکی تلمیحات استعمال نہیں کرنا چاہیے بلکہ تلمیحات کا دائرہ بہت وسیع ہے یقیناً ان تلمیحات کو استعمال کرنے کے لیے وسیع مطالعہ درکار ہے۔ جب تک عالمی اور بین الاقوامی تاریخ و ادب پر نظر نہیں ہوگی بندھی ٹکی تلمیحات کے حصار سے شاعر نہیں نکل سکتا۔ تلمیحات پر مشتمل یہ غزل ان کی کوئی تنہا غزل نہیں ہے۔ ان کی تقریباً ہر غزل میں کوئی نہ کوئی تلمیح ملتی ہے۔

ڈاکٹر ولی الحق انصاری کی یہ منفرد غزل اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اسی لیے ان کی غزلوں میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔

■

Dr. Raihan Hasan, Dept of Urdu, Guru Nanak University, Punjab

نوشاد منظر

بلراج کومل اور رسالہ شاہراہ

رسالہ 'شاہراہ' کا پہلا شمارہ جنوری، فروری 1949 میں منظرعام پر آیا۔ اس وقت تک ترقی پسند تحریک کا زور مدھم پڑ گیا تھا مگر شاہراہ نے اپنے ابتدائی شمارے سے ہی ترقی پسند نظریات کو فروغ دینا شروع کردیا۔ شاہراہ کے ابتدائی شماروں پر 'ترقی پسندوں کا دو ماہی ترجمان' درج ہوتا تھا، جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رسالہ شاہراہ کا اصل مقصد ترقی پسند نظریات کی ترویج واشاعت تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ 'شاہراہ' میں جن تخلیق کاروں کی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں، کچھ عرصے بعد ان میں سے بعض لوگوں کی شناخت جدید ادیب و ناقد کی بن گئی۔ 'شاہراہ' نے یوں تو تمام مکتب فکر کے لکھنے والوں کے لیے ایک موقع فراہم کیا مگر کچھ شعرا بعد کے دنوں میں جس طرح سامنے آئے اسے روایتی طور پر ترقی پسند نہیں کہا جاسکتا ہے، اس لحاظ سے بھی 'شاہراہ' کو ایک امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اپنا بنیادی ترقی پسندانہ مزاج قائم رکھتے ہوئے نظریاتی سطح پر ایک ایسی فضا قائم رکھی جو بعد میں جدیدیت کے طور پر خود کو پیش کرنے والوں کے لیے تربیت گاہ ثابت ہوئی۔ 'شاہراہ' میں شائع ہونے والے ایسے شعرا میں ایک اہم نام بلراج کومل کا ہے۔

میری اس تحریر کا مقصد اس حقیقت کو سمجھنا ہے کہ بلراج کومل جن کا تعلق جدیدیت سے تھا انھوں نے ترقی پسند تحریک کے کتنے اثرات قبول کیے، یہ سوال اس لیے اہم ہے کیونکہ بلراج کومل کی نظمیں ابتدائی دنوں میں شاہراہ جیسے ترقی پسند رسالے میں کثرت سے شائع ہوئیں۔ بلراج کومل کی 16 نظمیں رسالہ شاہراہ میں شائع ہوئیں جن میں 'بیداری تک'، 'راستے پر'، 'سوچتے سوچتے'، 'کونپلیں'، 'درمیانہ طبقہ'، 'تیسری جنگ'، 'کھنڈر اور پھول'، 'معصومیت کے نام'، 'یہ لوگ' اور 'یہ زرد بچے' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نظم 'کونپلیں' کی اشاعت رسالہ شاہراہ کے مارچ اپریل 1950 کے شمارے میں ہوئی۔ ہیئت کے لحاظ سے یہ آزاد نظم ہے۔ نظم کا ابتدائی حصہ ملاحظہ کریں:

چشم اظہار ہیں/ مسکراتے ہوئے سبز میدان ہیں
جن میں ننھے گھروندے چمکتی ہوئی دھوپ میں ہنس
رہے ہیں،
آنگنوں میں شگوفوں کی مانند کھلتے ہوئے،
نرم معصوم بچے،/ تالیاں پیٹتے ہیں،
کھیل میں منہمک ہیں
حسن کے لہلہاتے ہوئے قہقہوں کی چٹک
ناز برسا رہی ہے،
دور کھیتوں میں دھیمی، شگفتہ ہوائیں سرکنے لگی ہیں

نظم کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ متکلم کسی نئی چیز کے آغاز کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ 'چشم اظہار' کا ٹکڑا ایک خاص سماجی صورت حال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا کہ اس نظم کی اشاعت 1950 میں ہوئی تھی، یہ وہی وقت ہے جب ترقی پسند ادبی تحریک کا زور مدھم پڑنا شروع ہوگیا تھا۔ نظم کا مطالعہ اس پس منظر میں کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے مسکراتے ہوئے سبز میدان ننھے گھروندے دھوپ میں چمک رہے ہیں اور معصوم بچے تالیاں بجارہے ہیں۔ گھروندے اور بچے کا آپس میں ایک گہرا تعلق ہے۔ چھوٹے معصوم بچے مٹی سے گھروندے بنا کر کھیلتے ہیں۔ اب دیکھیے کہ گھروندے کی اہمیت کیا ہے، مٹی کا بنا ہوا یہ چھوٹا سا مکان بچوں کا ایک کھیل ہے۔ نئی شاعری میں لفظ 'گھروندے' کو بچوں کے کھیل سے زیادہ بے ثباتی کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ متکلم کا اشارہ ان ادیبوں ودانشوروں کی طرف بھی ہوسکتا ہے جو معصوم بچے تو ہرگز نہیں تھے لیکن جب ان لوگوں نے ادب میں ایک نئے رجحان کو فروغ دینے کی کوشش کی تو عام طور پر لوگوں نے اسے بچوں کے گھروندے کی طرح ایک کھیل کے طور پر دیکھا اور کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

چند دہقاں
دھیمے دھیمے کوئی گیت گاتے ہوئے

اپنے بیلوں کی طرارسی جوڑیاں ہانکتے
دھیرے دھیرے چلے جارہے ہیں،
اورآکاش کی نیلگوں خامشی میں بڑے ناز سے
کچھ پرندے قطاروں میں اڑتے ہوئے،
جانے کس کھوج میں جارہے ہیں......،

شاعری میں دہقان، کسان اور بیل وغیرہ ایک خاص فکر کی طرف اشارہ کرتے ہیں مگر چند دہقان دھیمے دھیمے کوئی گیت گاتے کہاں جارہے ہیں؟ اور یہ گیت کیا ہے؟ خوشی کا گیت یا غم کا؟ اور پرندے قطار بند کس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں؟ کیا متکلم نے تقسیم کے بعد رونما ہونے والی صورت کی طرف اشارہ کرنا چاہا ہے؟ اور پرندوں کی قطار سے کیا مراد ہے؟ یہ وہ مہاجر بھی ہوسکتے ہیں جو ہجرت پر مجبور ہوئے۔ متکلم کا اشارہ ادب میں آرہی تبدیلی کی طرف بھی ہوسکتا ہے۔ پرندوں کا کسی شے کی تلاش میں اڑنا دراصل ان دانشوروں کی طرف اشارہ بھی ہوسکتا ہے جو ترقی پسند تحریک کی شدت پسندی سے ناراض ہوکر نئے رجحان کی طرف مائل ہوئے۔ نظم کا آخری ٹکڑا ملاحظہ کریں جس سے میری بات کو تقویت ملتی ہے:

ہائے ہم ان مناظر کو ایک اجنبی آنکھ سے،
کس لیے گھورتے ہیں، / جب کہ تخلیق کی کونپلیں
پھوٹ نکلی ہیں دھرتی سے ہنستی ہوئی
اوراٹھتے ہوئے وقت کے ساز سے
نغمگی کی پھواریں برسنے لگی ہیں!!!

'کونپلیں' کی تعبیر ہر قاری اپنے طور پر کرسکتا ہے، لیکن تخلیق کی کونپلیں بنیادی طور پر ایک ایسے معاشرے کی جانب اشارہ ہے جس کے تخلیقی سوتے خشک نہیں ہوتے۔ علی سردار جعفری نے اپنی ایک اہم نظم 'میرا سفر' میں 'کونپلیں' کا لفظ اسی سیاق میں استعمال کیا ہے:

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا / بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا / جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے / مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی، کلی کلی / اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا

بلراج کومل کے یہاں تخلیق کی کونپلیں پھوٹ چکی ہیں اور لوگ اسے حیرت و استعجاب سے دیکھ رہے ہیں۔ متکلم کا اصرار ہے کہ نئے رجحان کو حیرت سے دیکھنے کے بجائے اس کا استقبال کیا جانا چاہیے کیونکہ تخلیق کی کونپلیں نکل چکی ہیں۔ علی سردار جعفری کے یہاں 'کونپلیں' مستقبل سے وابستہ ہے۔ دونوں نظموں میں حال اور مستقبل کا خوب صورت امتزاج نظر آتا ہے۔

بلراج کومل کی نظم 'معصومیت کے نام' دسمبر 1950

میں شائع ہوئی، مگر نظم کے اختتام پر 1946 درج ہے۔ ممکن ہے کہ نظم 1946 میں لکھی گئی ہو اور 1950 میں شائع ہوئی ہو۔ نظم 'معصومیت کے نام' میں متکلم خوبصورت زندگی کا خواب دیکھتا ہے۔ اسے اپنے اردگرد بس خوشیاں نظر آتی ہیں دور دور تک غم کا شائبہ تک نہیں۔ وہ آنے والے دن کے لیے پرامید نظر آتا ہے۔ مگر خواب پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے بعد بکھرتا نظر آتا ہے۔ دراصل نظم میں اس خواب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو مجاہدین وطن نے بھی دیکھا تھا مگر آزادی کے بعد خواب کی تعبیر تقسیم لے کر آئی:

وہ شب مجھے یاد ہے کہ جب میں نے خواب دیکھا تھا روشنی کا
وہ کیسی دنیا تھی جس میں کرنیں تھیں الفتوں کی، چہار سو
گیت ناچتے تھے،
حسین مکھڑوں پہ مسکراہٹ سجی ہوئی تھی
کہ جیسے ہستی غموں کے سایوں سے دور اک وادیِ نگاریں
میں آ گئی ہو،
وہ پھول بھی یاد ہیں مجھے جو ہوا کے جھونکوں میں جھومتے تھے،
فضا میں مستی رچی ہوئی تھی
گگن سے موتی برس رہے تھے
زمین دلہن بنی ہوئی تھی

(نظم 'معصومیت کے نام': بلراج کومل۔ دسمبر 1950)

یہ وہی خواب ہے جس کے بارے میں فیض احمد فیض نے کہا تھا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

بلراج کومل کے یہاں بھی اسی خواب کی طرف اشارہ ملتا ہے جو مجاہدین آزادی اور محبان وطن نے دیکھا تھا، یعنی آزادی، مساوات اور خوشحالی وغیرہ۔ مگر نظم جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے خواب بکھرتا نظر آتا ہے۔ خواب دیکھنے والا خواب کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں کس قدر بے چینی اور خوں ریزی ہے۔ متکلم حالات سے حوصلہ شکن ضرور ہے مگر نظم اس مصرعے پر ختم ہوتی ہے:

تمھاری خاطر مرا تخیل جواں رہے گا!!!

اگست 1950 کے شمارے میں ''تیسری جنگ'' کے عنوان سے بلراج کومل کی نظم شائع ہوئی تھی۔ نظم کا پہلا حصہ جنگ سے پیدا ہونے والی صورت حال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ کریں:

سہمے سہمے حزیں دھند لکے میں
کون اس وقت چیخ اٹھا ہے
دور تک گونجتی ہے تنہائی
کس مصیبت نے لی ہے انگڑائی
عجیب بھری ہوئی سی آوازیں
ایکا ایکی کہاں سے ابھری ہیں
ہر گھڑی شور بڑھتا جاتا ہے
بحر تشویش چڑھتا جاتا ہے

اس نظم کی اشاعت 1950 میں ہوئی مگر اس کا پس منظر تقسیم ہند ہے اور متکلم نے اسی مناسبت سے اس کا عنوان تیسری جنگ رکھا ہے، پہلی دو جنگ عظیم دو مختلف ملکوں اور قوموں کے درمیان ہوئی تھی اور اس کی نوعیت مختلف تھی مگر تقسیم ہند ایک پر درد سانحہ تھا۔ اس بند میں متکلم نے اس سانحے کو مصیبت سے تشبیہ دی ہے۔ متکلم اس صورت حال سے بہت خوفزدہ ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جو سب سے بڑا مسئلہ لوگوں کو درپیش تھا وہ شناخت کا مسئلہ تھا لہٰذا متکلم کہتا ہے کہ دور دور تک صرف تنہائیاں ہی تنہائیاں ہیں:

ٹھہرو، تھم جاؤ، غور سے دیکھو
دور تک چیختی فضاؤں میں
ہڈیاں، لاشیں، ان گنت روحیں
تیرتی ہیں بھنور کی صورت میں
اور پھیلاؤ، پتلیاں اپنی
عین ممکن ہے دیکھ پاؤ تم
صورتیں اپنے ان عزیزوں کی
جن کی ہستی بھنور نے ہتیالی

تقسیم ہند کے بعد رونما ہوئے فساد کی خوفناک تصویر بلراج کومل نے اس شدت کے ساتھ بیان کی ہے کہ سارا منظر

آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس فساد میں ہزاروں جانیں گئیں، بچے یتیم ہوگئے، عورتیں بیوہ ہوگئیں اور چاروں طرف خون کی ندیاں بہتی نظر آنے لگیں اور یہ سارے واقعات مذہب کے نام پر پیش آئے تھے۔ ہندو مسلم صدیوں سے آپس میں اتحاد وامن کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے، مگر ان کو سیاست نے ایک دوسرے کا دشمن بنادیا تھا، بلراج کومل نے اپنی اس نظم میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ چند مصرعے دیکھیے:

دیکھو پہچانو، ان بہاروں کو
جن کی گودی میں کھیل کھیلے تھے
تم نے الفت کی لہلہاہٹ کے
گرم ہونٹوں کی کپکپاہٹ کے
دیکھو پہچانو اس تقسیم کو
چوم لیتے تھے جس کو شفقت سے
جس کو جھولا جھلایا کرتے تھے
میٹھی باتیں سنایا کرتے تھے

متکلم عوام کو رشتوں کے تقدس کی یاد دلاتا ہے، متکلم کا اشارہ تقسیم ہند سے قبل کے ماحول کی طرف ہے جب مذہبی تفریق کے بغیر لوگ ساتھ رہتے تھے۔ متکلم ماضی کے اتحاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان مسکراہٹوں کو یاد کرو جسے دیکھ کر تم ان بچوں کو چوم لیتے تھے اور بنا کسی تفریق کے بچوں کو جھولا جھلایا کرتے تھے۔ دراصل نظم کے اس حصے میں متکلم عوام کو محبت کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ نظم کے اگلے حصے میں متکلم اپنی زمین سے محبت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

دیکھو، پہچانوں، مامتا اپنی
جس کی یادیں بھی ٹھنڈی ہیں
جس کی چھاؤں میں نیند آتی تھی
اور کتنا سکون پاتی تھی/ دیکھو پہچانو، سبز کھیتوں کو
جن میں اُگتی تھی مست شادابی
لہلہاتے تھے خواب جھونکوں میں
رقص کرتی تھیں ہر برس روحیں
دیکھو پہچانو، ان ہواؤں کو
جن کی دھڑکن سے گیت رِستے تھے
کتنے پیغام لایا کرتی تھیں
پیار کے گیت گایا کرتی تھیں

نظم کے اس حصے میں متکلم ان لوگوں کو مخاطب کرتا ہے جو تقسیم ہند کے بعد ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ متکلم کہتا ہے دیکھو سبز کھیتوں کی شادابی، ہواؤں کے جھونکوں کو جو محبت کے نغمے گنگناتے تھے اور مامتا کی ان ٹھنڈی چھاؤں کو جو ہمیشہ سکون بخشتی تھے، ان کو چھوڑ کر کہیں مت جاؤ۔ ان ہی باتوں کی طرف اشارہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جامع مسجد کی اپنی ایک تاریخی تقریر میں بھی کیا تھا کہ اپنے آباواجداد کی سرزمین چھوڑ کر مت جاؤ۔ بلراج کومل کی نظم میں بھی اسی خیال کا اظہار کیا گیا ہے۔ بلراج کومل کی مذکورہ نظم کے پہلے حصے میں متکلم مجموعی طور پر اتحاد کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے محبت اور اخوت پر زور دیتا ہے مگر نظم کا دوسرا حصہ تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کی طرف اشارہ کرتا ہے:

دیکھو اب ہم تڑپ کے لپکیں گے
پھاند جائیں گے موت کا دریا
قہر بن کر فلک سے ٹوٹیں گے
موت کے خالقوں سے پوچھیں گے
کس طرح لپلپاتے شعلوں میں،
جسم کا گوشت بھونا جاتا ہے؟
تڑتڑاہٹ کو خوف آتا ہے!
ہڈیاں کیسے پیسی جاتی ہیں؟
ہچکیاں کیسے موت بنتی ہیں؟
کس طرح شہر راکھ ہوتے ہیں؟
بھوک کیسے جوان ہوتی ہے؟
کس طرح کھیت روندے جاتے ہیں؟
انقلابات کیسے آتے ہیں؟
میرے پیارے اس اشک شوئی سے
کس نے راہِ نجات پائی ہے؟
ہم ہی ظلمات کو نچوڑیں گے!
دست سفاک کو مروڑیں گے

بلراج کومل کی نظم تیسری جنگ کا دوسرا حصہ ترقی پسندی کی اس شدت پسند روایت میں ایک اضافہ ہے جس میں امیروں کے خون سے ہولی کھیلنے کی بات کہی گئی تھی۔ بلراج کومل نے اپنی نظم میں ان امیروں اور سرمایہ دار طبقوں کو ہدف ملامت تو نہیں بنایا مگر انھوں نے ان سیاستدانوں کی ذہنیت پر تنقید کی ہے جن کی وجہ سے ایک ملک کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ نظم کا متکلم ان تمام واقعات سے دل برداشتہ ہے مگر حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ وہ عوام کے دلوں میں نفرت پھیلانے والوں کے لیے شعلہ بھڑکا رہا ہے، لہٰذا وہ عوام کو جنگ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے دیکھو اب ہم ظلم پر قہر بن کر ٹوٹیں گے اور لاوا بن کر زمین سے پھوٹیں گے، یہاں تک کہ اگر موت بھی ہمارا مقدر بنی تو ہم پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں۔ دراصل متکلم ان موت کے سوداگروں کو اس خوف کا احساس دلانا چاہتا ہے جو خود اس نے پیدا کیا ہے، لہٰذا وہ دیکھو ہڈیوں کے ٹوٹنے اور جسم کے جلنے پر کیسی تکلیف ہوتی ہے، کس طرح آدمی تڑپ تڑپ کر مرجاتا ہے، بھوک کی تکلیف کیا ہوتی ہے۔ نظم کا اختتام امید پر ہوتا ہے کہ ظلمت بھری راتیں اور ظالم سب کا خاتمہ جلد ہوگا۔ تقریباً تمام ترقی پسند نظم کا اختتام اسی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے۔

'شاہراہ' کے جون 1950 کے شمارے میں بلراج کومل کی نظم 'سوچتے سوچتے!' شائع ہوئی تھی۔ نظم کے عنوان سے بڑی حد تک موضوع کو سمجھا جاسکتا ہے۔ نظم کا متکلم ایک ایسا شخص ہے جو ماضی کے دریچوں سے اپنی زندگی کی بازیافت میں مصروف ہے۔ مگر نظم 'سوچتے سوچتے!' کے متکلم کا انداز خودکلامی کا ہے:

کتنی ویراں ہیں رات کی آنکھیں
سہمی سہمی خموش پلکوں میں
بہتی گھڑیوں کی یاد آئی ہے
مردہ غم نے حیات پائی ہے

گزرے ہوئے پل کو متکلم مردہ غم کے حیات پانے سے تشبیہ دیتا ہے۔ کتنی ویراں ہیں رات کی آنکھیں، ایک تو ویرانی اور اس پر رات کی ویرانی۔ گویا رات کی اس ویرانی کو دیکھ کر ماضی کی یاد کچھ اس طرح تازہ ہوگئی جیسے کسی مردہ جسم میں زندگی آجائے ٹھیک اسی طرح ماضی کی یاد نے میرے زخم کو ہرا کردیا ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ زخم ابھی ہی لگے ہوں۔ نظم کا ایک بند دیکھیے:

پیڑ رہ رہ کے کپکپاتے ہیں
اور تنکوں کی نرم شفقت میں
ننھے ننھے پرندے سوتے ہیں
ایسے لمحے عجیب ہوتے ہیں

اس بند میں 'پیڑ' کے کپکپانے کا ذکر ہے۔ یہ پیڑ ہی اس بند کی جان ہے، یہ پیڑ کسی تہذیب کسی روایت اور کسی تحریک کا استعارہ بھی ہوسکتا ہے، مگر یہاں یہ پیڑ دراصل ایک عظیم تحریک کے خاتمے اور نئے رجحان کے آغاز کی طرف اشارہ کررہا ہے، شاعر نے خوبصورتی کے ساتھ ان دونوں تحریک کے باہمی رشتے کو پیش کیا ہے، وہ ترقی پسند تحریک کی خامیوں اور خوبیوں کا ذکر کرنے کے بجائے اس تحریک کے مقاصد کو ایک پیڑ سے تشبیہ دیتا ہے۔ ایک بند اور دیکھیے:

ایک دریچے کے پاس دو آنکھیں
اپنی پلکوں میں آئینے تھامے
پہروں سنسان راہ تکتی ہیں
تنہا تنہا خموش جلتی ہیں

اس نظم میں متکلم اپنی شناخت میں سرگرداں نظر آتا ہے، شاعر کی ذہنی کشمکش بھی ہمیں نظر آتی ہے، وہ اپنی بیتی ہوئی زندگی پر ماتم کرتا ہے، وہ خود کو تنہا اور اکیلا بھی محسوس کرتا ہے، یہی وہ تنہائی ہے جو اسے اپنی شناخت کے کھو جانے کا احساس دلاتی ہے۔

بلراج کومل کی ایک نظم ''یہ لوگ'' بھی شاہراہ میں شائع ہوئی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اپنی ذمے داری پوری کرلی ہے اور اب اس کی جگہ نئی تحریک اور رجحان کی ضرورت ہے۔ مگر کچھ لوگ ابھی بھی اس سچائی کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔ نظم کا ایک بند دیکھیے:

محفل کی تمازت میں بڑے ناز سے بیٹھے
یہ لوگ کسی زلف کو سلجھاتے رہے تھے
اک میں بھی تھا خاموش پریشان وہاں پر
ہر لمحہ مری نظروں نے محفل کو ٹٹولا
شاید کہیں مل جائے کوئی ننھا شرارہ
اک نقطہ جہاں رکتی ہے مقصد کی نگاہ
یہ لوگ، مرے دوست مسرت کے بھکاری
باتوں کے سوا ان میں کوئی بات نہیں تھی۔

بلراج کومل کی مذکورہ نظم 'یہ لوگ' کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بلراج کومل ترقی پسندوں سے کس قدر بیزار ہوگئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ترقی پسندوں کے پاس اب کوئی ادبی نقطہ نہیں بلکہ ان کے پاس محض باتیں ہیں جن پر سب خوش ہوتے رہتے ہیں۔ ایک بند اور ملاحظہ کریں:

چپ چاپ مرے اٹھ کے چلے آنے پہ دل نے
احساس کے کانوں میں دھڑک کر یہ کہا تھا
یہ لوگ پریشانیٔ تسکین کے مارے
ناکام تمناؤں کے تنکوں کو سنبھالے
خوابوں کے سمندر میں بھٹکتے ہیں مسلسل
گو تم بھی ہوا ان میں سے مگر ان سے جدا ہو
گر آتے ہو ہر روز انھیں ملنے کی خاطر
یوں آؤ کہ محفل کو کوئی نقطہ بجھا دو
تسکینِ دل و جاں کے نئے ڈھنگ سکھا دو

بلراج کومل کا خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک کی جگہ نئی تحریک یا رجحان کو فروغ دیا جانا چاہیے، یہ وہی دور ہے جب جدیدیت اپنے لیے نئی راہ تلاش کر رہی تھی۔ بلراج کومل اور ان کے ہم خیال ادیبوں کی تخلیقات نے جدیدیت کے لیے راہیں ہموار کیں۔ نظم ''یہ لوگ'' کے مطالعے سے بھی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آج ہم جس شاعر بلراج کومل کو جانتے ہیں ان کی بنیادی شناخت جدیدیت کی ہے لیکن بلراج کومل کے شعری سفر کے مطالعے میں ان کے ابتدائی رنگ سخن کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے جدیدیت کو فروغ دینے اور اس کی جڑوں کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ جہاں تک رسالہ 'شاہراہ' کا تعلق ہے تو یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس رسالے نے ترقی پسند فکر کو ازسرنو فروغ دینے کی کوشش کی۔ مگر اس بات سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ 'شاہراہ' نے نئے رجحانات کو فروغ دینے والی تخلیقات کو بھی اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔

بلراج کومل کی ایک نظم 'کھنڈر اور پھول' بھی شاہراہ کی زینت بنی۔ یہ ایک آزاد نظم ہے اور اس کا موضوع ماضی اور حال کی کشمکش ہے۔ اس زمانے کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن کو ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے درمیان کی ایک کڑی کہا جاسکتا ہے۔ ان نظموں میں نہ تو اجتماعیت نظر آتی ہے اور نہ ہی انفرادیت بلکہ ان کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی تناور درخت کی شاخ کے پیلے اور سوکھے پتوں کی جگہ نئی پتیاں نکل رہی ہوں، جس نے اس تناور درخت میں ایک نئی جان ڈال دی ہے۔ نظم ''کھنڈر اور پھول'' دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصے میں متکلم اس بات کا اعلان کردیتا ہے کہ مکان جل چکا اب صرف کھنڈر اور بجھی ہوئی راکھ کی سسکیاں ہیں۔ نظم دیکھیے:

مکاں جل چکا ہے
کھنڈر ہے سیاہی ہے، بجھتی ہوئی راکھ کی سسکیاں ہیں
مری آنکھ پرنم ہے
چپ چاپ گم صم کھڑا ہوں یہاں میں
مرے آنسوؤں میں تصاویر ہیں
ماضی و حال کی/ وقت کی منزلوں کی
مرے ذہن میں داستاں ہے
زمانے کے بننے بگڑنے کی
تعمیر و تخریب کی دھڑکنوں کی
مرے کان میں گونجتی ہیں وہ نرم اور شیریں صدائیں
جنھیں آگ نے اس مکاں کے کھنڈر میں فنا کردیا ہے
محبت کی تقدیس

معصوم شمعوں کے اشکوں کی گرمی
دھوئیں کی تڑپتی ہوئی دھاریاں
ان کا پیغام بن کر/ فضاؤں میں شاید بھٹکنے لگی ہیں

یہ نظم 'کھنڈر اور پھول' کا پہلا حصہ ہے۔ مذکورہ نظم پوری طرح اس زمانے کی سماجی بلکہ سیاسی صورت حال کو پیش کرتی ہے۔ 1947 کے فساد کو بلراج کومل نے یقیناً اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اسے محسوس بھی کیا ہوگا، انھوں نے اسی درد اور تکلیف کو اپنی مذکورہ نظم میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ متکلم گم صم کھڑا اپنی آنکھوں سے مکان کو جلتے بلکہ کھنڈر بنتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ متکلم غمگین، آنکھوں میں آنسو لیے اپنی بربادی کا منظر دیکھ رہا ہے اور اس کے ذہن میں ہزاروں قسم کے سوالات ہیں جن کے جواب کا وہ متمنی ہے۔ اس کے کانوں میں اس معصوم بچوں کی صدا گونج رہی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود متکلم ناامید نہیں ہے، اسے امید ہے کہ حالات سازگار ہوں گے:

مری آنکھ پرنم ہے/ پھر بھی میں خوش ہوں
مرے پاس خوابوں کی معصوم ٹھنڈک
ارادوں کے روشن ستاروں کی نرمی
ہواؤں میں بہتی ہوئی نغمگی ہے
میں یادوں کے ملبے پہ تخلیق کا پھول لے کر کھڑا ہوں

اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں بلراج کومل ترقی پسند ادبی تحریک سے متاثر تھے ان نظموں کے مطالعے سے ایک ترقی پسند نظم گو کے طور پر وہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آج ہم جس شاعر بلراج کومل کو جانتے ہیں ان کی بنیادی شناخت جدیدیت کی ہے لیکن بلراج کومل کے شعری سفر کے مطالعے میں ان کے ابتدائی رنگ سخن کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے جدیدیت کو فروغ دینے اور اس کی جڑوں کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ جہاں تک رسالہ 'شاہراہ' کا تعلق ہے تو یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس رسالے نے ترقی پسند فکر کو ازسرنو فروغ دینے کی کوشش کی، مگر اس بات سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ 'شاہراہ' نے نئے رجحانات کو فروغ دینے والی تخلیقات کو بھی اہتمام کے ساتھ شائع کیا، یہی وجہ ہے کہ 'شاہراہ' میں ایسے بہت سے تخلیق کاروں کی تخلیقات شائع ہوئیں جو بعد میں جدیدیت کے علمبردار ہوئے۔ ان میں ایک اہم نام بلراج کومل کا بھی ہے۔

■

Naushad Manzar, Research Scholar, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

سنتوش کمار

عدم گونڈوی
باغیانہ مزاج کا شاعر

ادبی دنیا میں عدم گونڈوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ عدم ایک اعلیٰ درجے کے حقیقت پسند شاعر ہیں۔ ان کی اکثر نظموں میں اسی قوم کے مسائل بیان ہوئے ہیں جس سے ان کا تعلق ہے۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور ان کی نظموں میں گاؤں کی بناوٹی زندگی کا کوئی نظارہ دیکھنے کو نہیں ملتا مثلاً گاؤں کی خوشحال زندگی، خوبصورت ہری بھری فصلیں، خوش حال کسان، گاؤں کی آب وہوا اور رہن سہن وغیرہ۔ ان کی نظموں میں وہ گاؤں بھی ابھر کر سامنے آتا ہے جہاں عام لوگ پریشان حال ہوتے ہیں اور زندگی جینے کی کوشش کرتے ہیں۔ عدم اپنے گاؤں کی پہچان کراتے ہوئے کہتے ہیں:

پھٹے کپڑوں سے تن ڈھانکے گزرتا ہو جہاں کوئی
سمجھ لینا وہ پگڈنڈی عدم کے گاؤں جاتی ہے

(سمے سے مُڈ بھیڑ: عدم گونڈوی، ص 95)

عدم ایک باغیانہ خیالات کے حامل شاعر کہے جاتے ہیں۔ وہ صرف فیشن کے لیے شاعری نہیں کرتے بلکہ سماج کی سچائی کو سامنے لانا چاہتے ہیں، وہ دولت کمانے کے لیے نظم نہیں لکھتے بلکہ وہ اپنے دل میں اٹھ رہے درد، گھٹن، تڑپ، کسک اور چھٹپٹاہٹ کو پیش کرتے ہیں۔ جسے پورا سماج اور سماج کا ایک حصہ جھیلتا آ رہا ہے۔

عدم کی شاعری کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان کی عام زندگی ان کی نظموں میں سادگی، خوبی، جوش وجذبات اور سچائی کے ساتھ موجود ہے۔ وہ جس قوم کو اپنی نظموں کا موضوع بناتے ہیں اس کے ساتھ ہمدردی دکھاتے ہوئے انقلابی بننے کے لیے جوش وجذبہ پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح عدم ایک بہترین انقلابی شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے نظر آتے ہیں۔ وہ روایتوں سے انحراف کرتے ہوئے اپنا راستہ سب سے الگ بناتے ہیں۔ اس نئے راستے پر وہ خود بھی چلتے ہیں اور عوام کو بھی اسی راستے پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ ایسے ادب کو پسند نہیں کرتے ہیں جس میں صرف اعلیٰ طبقے کی نمائندگی ہے۔ وہ پسماندہ قوموں پر ظلم وزیادتی کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ عدم وہاں زیادہ نظر آتے ہیں جہاں غریبوں کے بچے بھوک وپیاس سے تڑپتے ہوئے نظر آتے ہیں یا پسماندہ ذاتوں کے حالات زندگی کو اپنی نظم کا موضوع بناتے ہیں۔ اس کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مانوتا کا درد لکھیں گے، ماٹی کی بوباس لکھیں گے
ہم اپنے اس کال کھنڈ کا، ایک نیا اتہاس لکھیں گے

(ایضاً، ص 27)

عدم اس ادب کے خلاف لکھتے ہیں جہاں ادب صرف کچھ ادبی اداروں میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ ان کا یہ باغیانہ انداز قابل ستائش ہے:

غزل کو لے چلو اب گاؤں کے دلکش نظاروں میں
مسلسل فن کا دم گھٹتا ہے ان ادبی اداروں میں

(ایضاً، ص 46)

ایک دوسری جگہ ادب کو صرف تخیل کی بنیاد بنا کر لکھنے والے شاعروں، ادیبوں کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ادیبو! ٹھوس دھرتی کی سطح پر لوٹ بھی آؤ
ملمع کے سوا کیا ہے فلک کے چاند تاروں میں

(ایضاً، ص 46)

عدم کا ادب ان پسماندہ قوموں کی نمائندگی کرتا ہے جو بھوک و افلاس اور غریبی کے شکار ہیں اور ذلت وخواری کے ساتھ زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ اپنی تمام بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں۔ اس حوالے سے ان کے یہ اشعار قابل غور ہیں:

بھوک کے احساس کو شعر وسخن تک لے چلو
یا ادب کو مفلسوں کی انجمن تک لے چلو
جو غزل معشوق کے جلووں سے واقف ہوگئی
اس کو اب بیوہ کے ماتھے کی شکن تک لے چلو

(ایضاً، ص 47)

عدم کا خیال ہے کہ ہندوستان کے حکمرانوں اور غریب عوام، جو جھگی جھونپڑیوں میں رہتی ہے، کے درمیان تعلق ہونا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے درمیان گفتگو لازمی ہے۔ اس گفتگو کو قائم کرنے کے لیے ادب کو زمینی سطح کے بہت قریب آنا پڑے گا۔ وہ گاؤں کے مسائل کو حکومت تک پہنچانے کے لیے گاؤں والوں کے لہجے میں وکالت کرتے ہیں اور ہندوستان کے سیاسی طبقے سے کافی شکایت کرتے ہیں۔ الیکشن سے پہلے غریبوں کے گھروں میں جانا، پسماندہ ذاتوں کے یہاں چکر لگانا، ترقی کے خواب دکھانا، تمام وعدے کرنا، پیسے وشراب تقسیم کرنا اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے ہر طریقہ استعمال کرنا، یہ سب چیزیں ان کے دل کو بہت تکلیف پہنچاتی ہیں اور ان کا اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں بہت کھل کر کیا ہے ہے۔ میٹنگ کے نام پر پلیٹ میں بھنے ہوئے کاجو، گلاس میں وہسکی، نشے میں بدمست وچور لیڈروں اور سماج کے نمائندوں سے انھیں بو اور گھن آتی ہے۔ وہ عوام کو بتانا چاہتے ہیں کہ انھوں نے ان اُمیدواروں کو کس لیے چنا تھا اور وہ کیا کرر ہے ہیں؟ صرف یہی نہیں عدم اس سے آگے کہتے ہیں کہ ان نیتاؤں کو صرف اپنی کرسی سے مطلب ہے۔ باقی ملک وقوم میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونا چاہیے؟ انھیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ وہ تو شریف عوام کو

ایک حسین خواب دکھا کر ان کا ووٹ حاصل کر کے اپنی کرسی بچانے میں لگے ہوئے ہیں۔عدم کے درج ذیل اشعاران حالات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں:

جو ڈلہوجی نہ کر پایا وہ یہ حکمران کردیں گے
کمیشن دو تو ہندوستان کو نیلام کردیں گے

(ایضاً،ص40)

محض سڑکوں پر گڈھے ہیں نہ بجلی ہے نہ پانی ہے
ہمارے شہر گونڈہ کی فضا کتنی سہانی ہے

(ایضاً،ص42)

ایک جگہ اورطنزیہ انداز میں لکھتے ہیں:

ایک جن سیوک کو دنیا میں عدم کیا چاہیے
چار چھ چمچے رہیں، مائیک رہے مالا رہیں

(ایضاً،ص43)

1947 میں ملکی آزادی کے بارے میں کہتے ہیں کہ ابھی تک مکمل آزادی میسر نہیں ہوسکی ہے۔ کیوں کہ ہندوستان کے آدھے سے زیادہ لوگوں کی زندگی درد ومسائل سے بھری ہوئی ہے۔بھوک پیاس، آنسو، آہ، کراہ ومحرومی سے نجات نہیں مل سکی ہے۔وہ تو صرف ایک زندہ سانس لیتی ہوئی زندگیاں ہیں مگر ان کی زندگی کا کوئی معنی ہی نہیں ہے۔اسی لیے لکھتے ہیں:

سو میں ستر آدمی فی الحال جب ناشاد ہیں
دل پہ رکھ کے ہاتھ کہیے دیش کا کیا آزاد ہے

(ایضاً،ص48)

سرمایہ داراور پسماندہ لوگ ہندوستان میں کس کس طرح سے زندگی گزارتے ہیں۔اسی فرق کو عدم شاہی قوم، امیرزادوں اور پسماندہ ذاتوں کے بارے میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔صرف بلندعمارت سے کسی ملک میں معیاراوراس ملک میں رہنے والے کی ترقی کا اندازہ نہیں لگایاجاسکتا۔جبکہ ہندوستان میں ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جوفٹ پاتھ پراپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ وہ صرف اپنے پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے ہر وقت توڑ جوڑ میں لگا رہتا ہے۔ وہ کپکپاتی سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے، کانپتے ہوئے، فٹ پاتھ پر رات گزارنے کے لیے مجبور ہے۔صبح ہوتے ہی اپنے کام اور پیٹ بھرنے کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہے۔گرمی کے دنوں میں، تیز دھوپ میں گرم ہواؤں کا سامنا کرتے ہوئے پسینے میں بھیگے لباس کی بو، سوکھے ہوئے ہونٹ، مرجھائے ہوئے چہرے، پیاس کی تڑپ کو جھیلتے سہتے ہوئے کام کرتا رہتا ہے۔اسے اے سی، کولر، فین کی ہوائیں نصیب نہیں ہوتیں۔اس کے لیے سڑک پر چلتی ہوئی گاڑیاں اے سی، کولر، پنکھے کا کام کرتی ہیں جو ہواؤں کا جھونکا لیے ہوئے آتی ہیں اور پل بھر میں چلی جاتی ہیں۔ برسات کے موسم میں بارش سے بچنے کے لیے دکانوں کے سیڈس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ گیلی لکڑیوں وبھیگے کوئلوں سے چولہا جلاتے وقت خود دھوئیں کے غبار میں سماجاتا ہے اور ایک کراہ نکلتی ہے۔اس کے احساس کا اندازہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں لگاسکتا۔ اسے اپنی بھوک مٹانے کے لیے شدید حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔عدم ملک کے ان حالات پر پریشان نظر آتے ہیں اور آزادی پر سوال کرتے ہوئے سیاسی رہنماؤں سے پوچھتے ہیں کہ حکومت میں ہوتے ہوئے عوام کے لیے کیا کیا؟ جو وعدہ کیا تھا کیا اس پر ذرا بھی عمل کیا:

ان کا دعوی مفلسی کا مورچہ سر ہوگیا
پر حقیقت یہ کہ موسم اور بد تر ہوگیا

(ایضاً،ص51)

بھوک مری، تنگ دستی اور غریبی مٹانے کے لیے عدم عوام کو حکومتی نظام کے خلاف اکساتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہے ادھر فاقہ کشی سے رات کا کٹنا محال
رقص کرتی ہے ادھر اسکاچ کی بوتل میں شام
بم گائیں گے عدم دہقان گندم کے عوض
آپ پہنچادیں حکومت تک ہمارا یہ پیام

(ایضاً،ص73)

عدم کی ایک بہترین نظم پسماندہ ذاتوں اور دلتوں کی حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے۔یہ نظم سماج کی ان پسماندہ قوموں کی زندگی اوران کے رنج وغم کی سچی تصویر پیش کرتی ہے، ذلت بھری زندگی اور بھوک مری کے شکار دلت عوام نہ صرف پیٹ بھر کھانا پانے کے لیے کوشش کرتے ہیں بلکہ آدھا پیٹ کھانا کھانے پر مجبور ہیں اور انھیں سماج کا شکار بھی ہونا پڑتا ہے۔اس نظم میں ہرکھو کی بیٹی کرشنا کے کردار کو خاص موضوع بنایا ہے۔کرشنا ایک دن گھاس کا گٹھر لیے کھیت سے آرہی تھی تو موقع پاکر ٹھاکر بھیڑیا اس کی آبرو پر حملہ کر کے اسے لہولہان اور زخمی کردیتا ہے، عدم سماج کی اس سچائی کو پیش کرنے میں گریز نہیں کرتے۔گاؤں کے بڑے بزرگ جن پر تربیت دینے کی ذمے داری ہوتی ہے وہی اس حادثے پر نہ صرف ہنستے ہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں اور بدلے میں اس گھناؤنے حادثے کے لیے کرشنا کو ہی ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔ گونڈوی بدلتے زمانے وحکومت سے شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ان کے یہ اشعار:

کیا کہیں سرپنچ بھائی کیا زمانہ آگیا
کل تلک جو پاؤں کے نیچے تھا رتبہ پا گیا
کہتی ہے سرکار کہ آپس میں مل جل کر رہو
سور کے بچوں کو اب کوری نہیں ہریجن کہو
دیکھیے نا، یہ جو کرشنا ہے چماروں کے یہاں
پڑگئی ہیں سیپ کی موتی، گنواروں کے یہاں
جیسے برساتی ندی الھڑ نشے میں چور ہے
ہاتھ پٹھے پر نہ رکھنے دیتی ہے،مغرور ہے
بھیجتا بھی ہے نہیں سسرال اس کو ہرکھوا
پھر کوئی بانہوں میں اس کو بھینچ لے تو کیا ہوا

(ایضاً،ص100)

عدم گونڈی پولیس وانتظامیہ پر سوال اُٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ دلتوں ومظلوموں کوفرضی کیس میں پھنسا کر پولیس بھی دلتوں کا استحصال کرنے سے باز نہیں آتی۔ان پر ظلم وناانصافی کرتی ہے۔اسی لیے ٹھاکروں کو بچانے کے لیے پولس جب گاؤں میں آتی ہے تو داروغہ للکارتے ودہاڑتے ہوئے ٹھاکروں سے کہتا ہے کہ انھیں سبق سکھایا جائے گا۔کرشنا کے گھر پولس جاکر اس کے بھائی پر چوری کا الزام لگا کر اس کو بے رحمی سے مارتی ہے اور پھر ٹھاکر گرجتے ہوئے کہتا ہے کہ:

میرا منہ کیا دیکھتے ہو اس کے منہ پر تھوک دو
آگ لاؤ اور اس کی جھونپڑی کو پھونک دو
پھر دہاڑے ان کو ڈنڈوں سے سدھارا جائے گا
ٹھاکروں سے جو بھی ٹکرایا وہ مارا جائے گا
یہ سمجھتے ہیں کہ ٹھاکر سے الجھنا کھیل ہے
ایسے پاجی کا ٹھکانہ گھر نہیں ہے جیل ہے

(ایضاً،ص102)

عدم کی شاعری کے بارے میں صحیح تجزیہ کیا ہے کہ:

''عدم کی شاعری اپنی ہر غزل میں دلت پسماندہ ذاتوں پرظلم وستم، ہندوستانیوں کے رنج وغم کا بیان کرتی ہے۔ وہ ہمیں نہ تو 'واہ' کرنے کا موقع دیتی ہے اور نہ 'آہ' بھرنے کی مجبوری۔بجائے 'واہ' کو 'آہ' اپنے تخلیق کاروں، پڑھنے والوں میں انقلاب، جوش اور غصہ پیدا کرتی ہے، خاص طور سے بھوک، فرقہ واریت، گاؤں کا ہیرواور گوبر کا نت نیا استحصال، کسانی زندگی کی آزادی کے بعد کی مشکلیں وفکر شاعری کی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیتی ہے ان کا جہان شاعری دنیاوی نظام کی مصیبتوں سے گھر گیا ہے۔ جہاں نظام سے ٹکرانے کے علاوہ اور کوئی راہ بچی نہیں ہے۔'' (ایضاً،ص10-11)

■

Santosh Kumar Research Scholar
Department of Urdu, University of Delhi - 7
Email.:santsk7866@gmail.com

سلیم عنایتی

نواب محبت خاں محبت

1707 میں داؤد خاں (م 1726) علاقہ روہ (افغانستان) سے گھوڑوں کی تجارت کے سلسلے میں ہندوستان وارد ہوا۔ اس وقت شمالی ہند میں سیاسی اتھل پتھل اپنے عروج پر تھی۔ موقعے کو مناسب سمجھ کر وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ آنولہ (ضلع بریلی) کے علاقے میں جاپہنچا۔ آنولہ بشمول بدایوں، سنبھل، مرادآباد، بجنور، بریلی، شاہ جہانپور، پیلی بھیت کا علاقہ اس وقت کٹھیر کہلاتا تھا جو مقامی چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے زیرنگیں تھا۔ یہ راجگان ہوس حکمرانی کے باعث ہمیشہ آپس میں برسرپیکار رہتے تھے۔ داؤدخاں روہیلہ ہر وقت کسی نہ کسی راجہ کی جانب سے دوسرے راجہ کی فوج کشی پر بالمعاوضہ آمادہ رہ کر رفتہ رفتہ اپنی فوجی طاقت میں بھی اضافہ کرتا رہا۔ اس کے فوجی استحکام کے باعث علاقہ روہ سے اُس کے ہموطن بھی موقعے کا فائدہ اٹھانے کے لیے اس علاقے میں آنے لگے اور اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخرکار وہ کٹھیر کے علاقے پر قابض ہوگیا اور پھر یہ علاقہ روہیلکھنڈ کے نام سے مشہور ہوگیا۔ 1726 میں کمایوں کے راجہ کے ہاتھوں داؤدخاں قتل ہوگیا اور اس کا متبنی علی محمد خاں بعمر بیس سال روہیلکھنڈ کا سردار مقرر ہوا، جس نے آنولہ کو اپنا دارالریاست قرار دیا۔ اس وقت تک افغانستان سے بہت سے مشہور افغان (پٹھان) سردار روہیلکھنڈ میں داؤدخاں اور علی محمد خاں کے پاس آگئے تھے۔ جس میں دوندے خاں، پائندہ خاں، کبیر خاں، حافظ رحمت خاں وغیرہ چند انتہائی اہم اور جری سردار شامل تھے۔ ان سرداروں میں حافظ رحمت خاں شاہ عالم خاں کے صاحبزادے تھے۔ داؤد خاں دراصل انھیں سردار شاہ عالم خاں کا پروردہ تھا جن کے حسب ہدایت وہ گھوڑوں کی تجارت کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ حافظ رحمت خاں انتہائی دوراندیش سیاستداں، پاکباز اور بہادر انسان تھے جنھوں نے بعد میں شمالی ہند کی سیاست میں ایک اہم کردار ادا کیا اور 1774 میں لکھنؤ کے نواب شجاع الدولہ اور انگریزوں کی مشترکہ افواج سے لڑتے ہوئے میران پور کٹرہ (شاہجہاں پور) میں شہید ہوئے۔ نواب محبت خاں محبت انہی حافظ رحمت خاں کے چودہ صاحبزادگان میں دوسرے صاحبزادے تھے۔

علاقہ روہ کے آنے والے یہ روہیلے پٹھان اپنی طرزمعاشرت اور پشتو اور فارسی زبان بھی اپنے ساتھ لائے تھے جسے کافی عرصے تک اپنائے رہے لیکن طویل عرصے تک خودکومقامی تہذیب وتمدن اور زبان کے اثرات سے علیحدہ نہ کرسکے اور دیگر امور کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو بھی اپنانے لگے پھر بھی اپنی سرشت اور نسلی خصوصیات ان کے روزمرہ میں ان کے ساتھ رہیں جو کافی حدتک ہنوز ان کے ساتھ ہیں۔

روہیلکھنڈ کے علاقے میں مستند اردو شعروشاعری کا آغاز نمایاں طور پر قائم چاندپوری (1723-1794) اور مصحفی امروہوی (1747-1824) سے ہوتا ہے۔ جہاں تک افغانی روہیلوں میں اردوشاعری کا تعلق ہے وہ بھی لگ بھگ اسی عرصے میں شروع ہوتی ہے۔ اس سے قبل روہیلے اپنے ساتھ لائی فارسی اور پشتو زبانوں میں ہی شعروشاعری کرتے تھے۔ قائم اور مصحفی کے ہمعصر روہیلہ شعرا میں الف خاں ذوق، عزیزخاں ہیجان، نواب محبت خاں محبت اور محمد یارخاں امیر چند بنیادی افغان شعراء کے نام اہم ہیں۔

نواب محبت خاں محبت روہیلہ پٹھانوں کے بالکل ابتدائی شاعر ہیں۔ وہ لگ بھگ 1730 میں پیدا ہوئے۔ محبت روہیلوں میں نمایاں ترین محترم شخصیت حافظ رحمت خاں کے چودہ بیٹوں میں دوسرے بیٹے تھے۔ حافظ رحمت خاں 1774 میں نواب شجاع الدولہ اور انگریزوں کی مشترکہ فوج کے ہاتھوں میران پورکٹرہ میں شہید ہوگئے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد یہ خاندان خانہ خراب اور تتربتر ہوگیا۔ نواب محبت خاں اور ان کے چند دوسرے بھائیوں کو شجاع الدولہ معافی اور تھوڑی امداد دینے کے بھروسے پر اپنے ہمراہ لے گیا اور پھر اس خاندان کو الہ آباد اور دوسرے مقامات پر نظربند رکھا۔ ان کو ذلت آمیز قلیل وظیفے پر زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا۔ محبت اور ان کا خاندان کافی صعوبتوں کا شکار رہا۔ اپنے حق کی بازیابی اور شجاع الدولہ کے ایفائے وعدہ کے لیے نوابین اودھ اور انگریزوں سے کوششیں جاری رکھیں۔ محبت اس سلسلے میں کلکتہ بھی گئے۔ بالآخر لکھنؤ کے ریذیڈنٹ جان برسٹو کی مساعی سے شجاع الدولہ کے بیٹے نواب آصف الدولہ اور اس کے بعد نواب سعادت علی خاں کے دوراقتدار میں ان کو معاشی عافیت نصیب ہوئی۔ 1775 میں محبت لکھنؤ آکر مستقلاً رہائش پذیر ہوگئے۔ لگ بھگ 78 سال کی عمر میں 1808 میں انتقال کیا۔ لکھنؤ میں ہی تدفین ہوئی۔ محبت خاں کی شادی عبدالستار خاں کمال زئی (فرید پور) بریلی کی دختر سے ہوئی۔ وہ کثیرالاولاد تھے۔ پروفیسر خاں محمد عاطف کے مطابق لڑکیوں کے علاوہ ان کے 17 فرزند تھے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف 'تذکروں میں تذکرہ نگاری' میں 60 تذکروں کے حوالے شامل کیے گئے ہیں اور اس میں 30 تذکروں (تذکرہ شعرا اردو۔ میرحسن فارسی 1777 سے لے کر بزم سخن۔ سیدعلی شورش۔ فارسی 1880 تک) میں محبت خاں محبت کا تذکرہ اور ان کا نمونۂ کلام دیا گیا ہے۔ ان تمام تذکروں میں محبت کے کلام، شخصیت، کردار، وجاہت، حسن اخلاق، ادب پروری، اعلیٰ نسبی کو بھرپور سراہا گیا ہے۔ ایک تعجب خیز امر یہ ہے کہ انتخاب یادگار (امیر مینائی 1873) اور تذکرۂ شعرائے رام پور (صاحب جرجیس 1873) میں محبت کو بالکل نظرانداز کیا گیا ہے جبکہ یہ دونوں تذکرے رام پور سے شائع ہوئے اور عمومی طور پر روہیلکھنڈ کے شعرا پر زیادہ مشتمل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے حافظ رحمت خاں کی اولاد اور اس وقت کے نوابین رام پور کی سیاسی چشمک اس کا باعث رہی اور اس دور کے ان تذکرہ نگاروں کو اتنے اہم شاعر کو سیاسی مجبوریوں کے تحت نظرانداز کرنا پڑا۔

نواب محبت خاں محبت کس کے شاگرد تھے اس پر

مختلف تذکرہ نگاروں نے الگ الگ نام دیے ہیں۔منشی قدرت اللہ شوق (طبقات الشعراء)۔نجم الغنی خاں (اخبار الصنادید جلد اول) اور چند تذکرہ نگاروں نے محبت کو قلندر بخش جرأت کا شاگرد قرار دیا ہے جبکہ اسپرنگر (یادگار شعرا) مرزا علی لطف (تذکرہ گلشن ہند) خوب چند ذکا (عیارالشعرا) وغیرہ انھیں جعفر علی حسرت کا شاگرد بتاتے ہیں۔عبدالغفور ناسخ (سخن شعرا) نے تو حسرت کے ساتھ محبت کو میر درد کا شاگرد ہونا بھی لکھا ہے۔محبت چاہے جعفر علی حسرت کے شاگرد رہے ہوں یا جرأت کے لیکن ایک بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جرأت لکھنؤ میں کافی عرصہ محبت کی سرکار میں ملازم رہے ان کا مندرجہ ذیل شعر اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے:

بسکہ گل چیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے
ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

کڑا مانک پور کے شاہ محمد کمال (مجمع الانتخاب 1803) نے بتایا ہے کہ میاں جعفر علی حسرت کے شاگرد ہیں۔اب میاں جرأت کے شاگرد ہیں۔محبت اردو کے علاوہ عربی، پشتو اور فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ بقول مصحفی (تذکرہ ہندی گویان 1794) ''آخر فارسی شعر کہنے کی طرف مائل ہوئے اور جناب ارشاد مآب فاخر مکیں کے شاگرد ہوئے۔''

بقول مرزا علی لطف (تذکرہ گلشن ہند 1801) ''جمیع اقسام نظم میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے........ قصہ سسی پنوں کا فرمانے سے ممتاز الدولہ مسٹر جانسن بہادر کے انھوں نے نظم اور نام اس مثنوی کا 'اسرار محبت' رکھا ہے۔'' عبدالغفور نساخ (سخن شعرا 1864) اور محسن علی محسن (سراپا سخن 1853) نے محبت کے ایک خطاب 'شہباز جنگ' کا تذکرہ بھی کیا ہے جو غالباً ان کو دربار اودھ سے ملا تھا۔

جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے تمام تذکرہ نگاروں نے محبت کو بہت اچھے الفاظ میں یاد کیا ہے۔ میرحسن نے (تذکرہ شعرا 1777) ان کو 'نواب ذیشان' کے لقب سے یاد کیا ہے۔خوب چند ذکا 'عیارالشعراء 1798) نے ان کو ''عالی خاندان، بسیار حشمت وشوکت، خوبرو واہل سخاوت وبامروت ونیک نام قرار دیا ہے۔'' قطب الدین باطن 'گلستان بے خزاں 1845' رقم طراز ہیں کہ ''صاحب دانش وبینش فکر فارسی میں ہے شوق رسا اور اردو میں طبع ذکا ....کلام محبت آمیز، سخن نہایت دل آویز'' قدرت اللہ شوق نے (طبقات الشعرا 1774) ان کو ''ذہنش رسا وسلیم طبعش درست ومستقیم قرار دیا ہے۔ قابل توجہ ہے کہ اسی کے ساتھ شوق کہتے ہیں کہ ''غزلے تازہ مرثیہ نما کہ درمیان مفارقت اقربا وآوارگی وطن ومہاجرت خویشاں وحالت پرملامت خود مشتمل برغم والم داند وبلا بہ سرش کم از واقعہ کربلا نہ بود' غالباً یہ وہی دور تھا جب محبت اپنے اقربا کے ہمراہ در بہ بدر امن وسکون کے لیے سرگرداں پھر رہے تھے اور بقول خود:

وطن کو چھوڑ کے جاتے ہیں اس طرح مجبور
چلے تھے اہل حرم جس طرح مدینے سے

روھیلکھنڈ کے پٹھان شعرا نے جب پشتو اورفارسی میں شاعری کے علاوہ اردوزبان میں‌شاعری شروع کی تونہ اپنی نسلی خصوصیات سے دامن بچاسکے اورنہ پشتو زبان کی سلاست، لھجے کی مٹھاس اورصاف گوئی کوترک کرسکے۔ اس لیے سادہ بیانی، بے ساختگی، تعلّی، رجائیت، صاف گوئی، تیکھاپن اور چٹخارے کی گونج روھیلکھنڈ کی شاعری میں تب سے لے کر آج تک موجود ھے۔

محبت صاحب دیوان غزلیات ومثنوی تھے۔اس کے علاوہ ان کے دیوان میں نظم کی دوسرے اصناف بھی موجود تھیں مگر نہ وہ دیوان دستیاب ہے نہ اس کا نام معلوم ہے۔مرزا علی لطف نے (تذکرہ گلشن ہند 1801) میں تحریر کیا ہے کہ ''دیوان میں ان کی نظم کے سب اقسام ہیں'' اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1801 میں محبت کا دیوان کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا۔عبدالغفور نساخ نے بھی (سخن شعرا 1864) لکھا ہے کہ صاحب دیوان گزرے ہیں۔

روہیلکھنڈ کے پٹھان شعرا نے جب پشتو اور فارسی میں شاعری کے علاوہ اردو زبان میں شاعری شروع کی تو نہ اپنی نسلی خصوصیات سے دامن بچاسکے اور نہ پشتو زبان کی سلاست، لہجے کی مٹھاس اور صاف گوئی کو ترک کرسکے۔اس لیے سادہ بیانی، بے ساختگی، تعلّی، رجائیت، صاف گوئی، تیکھاپن اور چٹخارے کی گونج روہیلکھنڈ کی شاعری میں تب سے لے کر آج تک موجود ہے۔ بقول پروفیسر خان محمد عاطف (اردو شاعری میں افغانوں کی گلکاریاں) 'سادگی، روانی اور دوٹوک انداز میں بات کہہ دینا پٹھانوں کا فطری وصف ہے۔'' نواب محبت خاں محبت کی شاعری بھی ان تمام خصوصیات سے مملو ہے۔

محبت کے کلام میں جہاں پٹھانی لہجہ، طرز فکر اور پشتو زبان کی سلاست اور صلابت کا امتزاج نظر آتا ہے وہیں ان پر اوران کے خاندان پر گزری صعوبتوں کی شکایت اور گزرے مصائب کی گونج بھی سنائی دیتی ہے جن سے وہ کافی عرصے دوچار رہے۔ پروفیسر خان محمد عاطف کی یہ رائے قابل غور ہے کہ ''ان کے اپنے ماحول، خاندانی حالات اور تباہی وبربادی کے پس منظر میں ان کے کلام کو جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔

نواب محبت کے تلامذہ میں میر ضیاء الدین عبرت (م 1780) ایک انتہائی معتبر اور اہم نام ہے۔عبرت نے رام پور کے ایک رئیس نجو خان کی فرمائش پر ملک محمد جائسی کی پدماوت کا منظوم اردو ترجمہ کیا جو بدقسمتی سے ان کی حیات میں مکمل نہ ہو پایا اور 1796 میں میر غلام علی عشرت نے اس کی تکمیل کی۔

آخر میں محبت کا نمونۂ کلام ذیل میں تحریر کیا جاتا ہے:

دل ترا چشم تری جان وجگر تیرا ہے
جس جگہ چاہے تو رہ آن کے گھر تیرا ہے
وہ بت ہے میرے خانہ دل میں ہی جلوہ گر
ڈھونڈے ہے جس کو شیخ جدا برہمن جدا
آج پھر برہم ہے وہ کافر مزاج
اس کو شائد کچھ کوئی سکھلا گیا
بیٹھنے دیوے نہ وہ بزم میں اپنی تو مجھے
تُو اٹھا لیوے اسی وقت خدایا مجھ کو
محبت کے سبھی اسرار یارو
اگر چاہو محبت خاں سے پوچھو
نہ میں دل کی خبر پائی کہاں ہے
نہ اس کو میری یاد آئی کہاں ہے
دل جو جاتا ہے چلا جائے کہیں مجھ کو کیا
اس کی رسوائی کو کہتا ہوں نہیں مجھ کو کیا
جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہے گا
بالفرض جیا تو بھی وہ بیمار رہے گا
گالی کا انتظار تو حد سے گزر چکا
منھ کو کہاں تلک ترے دیکھا کرے کوئی
کوئی ڈھب بھی تجھے آتا ہے وفاداری کا
یا کہ سیکھا ہے یہی شیوہ ستم گاری کا
ترے بغیر تھی مجھ کو یہ بیقراری رات
کہ کل پڑی کسی کروٹ نہ مجھ کو ساری رات

■

Salim Inayati
40/75, Parade, Kanpur - 208001 (UP)
Mob.:9628122277

محمد وصی اللہ حسینی

قاضی عدیل عباسی کی صحافت

عظیم مجاہد آزادی قاضی عدیل عباسی اپنے معاصرین میں یوں تو کئی حیثیتوں سے ممتاز و منفرد شخصیت کے حامل تھے اور متعدد میدانوں میں انھوں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ کر اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے لیکن ان کے تمام کارناموں پر گہرائی سے نظر ڈالنے پر بحیثیت صحافی ان کا قد زیادہ بلند نظر آتا ہے۔ قاضی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ 'دینی تعلیمی کونسل' کا قیام تصور کیا جاتا ہے اور یہ سچائی ہے کہ اپنی اہمیت وافادیت کے اعتبار سے یہ تحریک ماضی قریب میں اپنی نظیر نہیں رکھتی لیکن اس کا دائرہ کار صرف اتر پردیش تھا۔ ان کی سیاسی، سماجی اور ملی خدمات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہیں لیکن ان شعبوں میں بھی ان کا میدان عمل عموماً ریاست تک ہی محدود تھا۔ اس کے مقابلے میں صحافت کے میدان میں ان کی حیثیت قومی سطح کی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ محض 23 سال کی عمر میں وہ اپنے وقت کے ہندوستان کے سب سے بڑے اردو اخبار 'زمیندار' لاہور کے چیف ایڈیٹر کے باوقار منصب پر فائز ہوئے۔ اپنے زمانے کے ممتاز اور انتہائی بے باک صحافی ظفر علی خاں کی جانشینی اپنے آپ میں خود ایک بڑا صحافتی کارنامہ ہے۔

یہ کوئی اتفاق نہیں بلکہ حسن اتفاق ہے کہ قاضی صاحب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ اس میدان میں انھوں نے اپنی صلاحیت وقابلیت کے ایسے جوہر دکھائے کہ بڑے بڑے انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان کا اشہب قلم صفحہ قرطاس پر ایسی بے خوفی سے دوڑتا کہ باطل طاقتیں لرزہ براندام ہو جاتیں۔ وہ حق بات کہنے میں نہ کسی کا خوف محسوس کرتے اور نہ ہی کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا۔ انھوں نے ہمیشہ وہی لکھا جو سچ سمجھا۔ علامہ اقبال کے کلام اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کے مطالعے نے اس ذوق کو جلا بخشی۔ مولانا حسرت موہانی ایسے جاں باز مجاہد آزادی اور بے باک صحافی کی صحبت نے حق گوئی وبے باکی کا نشہ دوآتشہ کردیا۔ انھوں نے پوری زندگی قلم کو تلوار کی طرح استعمال کیا۔

مجاہد اردو قاضی عدیل عباسی کی صحافتی صلاحیت اور اس میدان میں ان کے تجربات کے بڑے بڑے لوگ قائل تھے۔ جواہر لال نہرو اور رفیع احمد قدوائی جیسے سرکردہ رہنما بھی ان کو صاحب رائے صحافی سمجھتے تھے۔ روزنامہ 'قومی آواز' کے معرض وجود میں آنے میں قاضی عدیل عباسی کا بڑا کردار رہا ہے۔ اس اخبار کے محرک اور پہلے ایڈیٹر حیات اللہ انصاری 'کردار کے غازی: قاضی عدیل عباسی' میں لکھتے ہیں:

''اس فضا میں میں نے جواہر لال جی اور رفیع صاحب کے سامنے اپنی چار سال پرانی تجویز پر اصرار کیا کہ اردو کا روزنامہ نکالا جائے۔ ایک صاحب جو اخبار کے معاملے میں بہت تجربہ کار تھے ان کا خیال تھا کہ اخبار ایک ورقہ ہو اور ایک پیسہ قیمت ہو۔ سستا ہونے کی وجہ سے اس کو مسلمان خریدار مل جائیں گے۔ میرا خیال تھا کہ اخبار مکمل اخبار ہو یعنی چھ صفحہ کا جس میں پوری خبریں ہوں اور مسائل پر بحثیں ہوں۔ ایسا اخبار ضرور چلے گا۔ رفیع صاحب میری بات ماننے میں کچھ مذبذب تھے اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کا تذبذب کیونکر دور کیا جائے۔ اسی زمانے میں غیبی امداد یوں ہوئی کہ عجب طرح سے عدیل صاحب کی حمایت مل گئی... مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ظفر علی خاں صاحب کے ساتھ اخبار میں کام کر چکے ہیں اور رفیع صاحب ان کو صاحب رائے جرنلسٹ سمجھتے تھے۔ یہ تو اس وقت معلوم ہوا جب عدیل صاحب نے جا کر رفیع صاحب سے کہا: 'حیات اللہ جیسا کہتا ہے، ویسا ہی اخبار نکالیے، کامیاب رہے گا'... چند دنوں کے اندر اور حمایتی بھی رفتہ رفتہ مل گئے اور قومی آواز اسی انداز پر نکلا جیسا میں چاہتا تھا''۔

13 مارچ 1898 کو ضلع بستی کے 'بیارا' نامی گاؤں میں پیدا ہونے والے قاضی عدیل عباسی بہت ذہین تھے۔ ان کا شمار ممتاز طلبا میں ہوتا تھا۔ ابھی وہ سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور میں زیر تعلیم تھے کہ ان کو سیاست سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ کاروان آزادی داد شجاعت دیتا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ لوک مانیہ تلک کا پرجوش نعرہ 'سوراجیہ ہمارا حق ہے' اور حسرت موہانی کا ولولہ انگیز نعرہ 'آزادی کامل' پوری فضا میں گونج رہے تھے۔ انھوں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ وہ سرکاری ملازمت نہیں کریں گے بلکہ تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیں گے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے یونیورسٹی اسکول آف لا الہ آباد میں داخلہ لیا۔ 26 دسمبر 1920 کو تحریک ترک موالات منظور کی گئی اور قاضی صاحب نے فوراً کالج چھوڑ دیا۔ شیروانی، ترکی ٹوپی اور موزہ اتارا۔ کھدر کا کرتا پاجامہ پہن کر گلے میں جھولا ڈال کر میدان سیاست میں نکل پڑے۔ مولانا حسرت موہانی پہلے ہی انھیں کانپور بلا چکے تھے۔ ان کی سودیشی کپڑے کی دوکان تھی۔ انھوں نے دوکان پر کام کرنے کے لیے چالیس روپے پر رکھ لیا، لیکن دوکانداری ان سے نبھ نہ سکی۔

قاضی صاحب کا مدینہ بجنور میں رہتے ہوئے کانگریس کا کام کرنا منیجر مدینہ کو ناگوار لگتا تھا۔ اس کا اندازہ قاضی صاحب کو بخوبی تھا۔ اس کی وجہ سے انھوں نے 'زمیندار' لاہور سے رابطہ قائم کر کے وہاں چلے گئے اور زمیندار کے چیف ایڈیٹر ہوئے۔ غلام رسول مہر جوائنٹ ایڈیٹر، غلام مرتضیٰ میکش اور عزیز احمد ادارتی عملے میں تھے۔ حفیظ جالندھری کا نام اس وقت چمکا نہیں تھا وہ دفتر زمیندار میں کلرک تھے۔ قاضی صاحب پہلے سے ہی 'زمیندار' میں کام کرنے کے خواہش مند تھے اور موقع کی تلاش میں تھے، کیونکہ اس اخبار کی پالیسی قاضی صاحب کی حریت پسند طبیعت سے میل کھاتی تھی۔ زمیندار ہر موضوع پر بیباکی سے لکھتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ عوام میں مقبول تھا اور انگریزوں کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ اس اخبار کو بند کرنے کے لیے بار بار ضمانتیں طلب کی گئیں لیکن یہ اپنی شان وشوکت سے نکلتا رہا۔ زمیندار نے مجموعی اعتبار سے تین لاکھ روپے کی ضمانتیں ضبط کرائیں۔ انگریز مخالف پالیسی کے سبب چاروں طرف اسی اخبار کی دھوم تھی۔ قاضی صاحب کی دلی مراد بر آئی اور انھوں نے وہاں مناسب موقع پا کر بہت سے شعلہ بار مضامین اور اداریے لکھے، جس سے انگریزوں کے دل دہل گئے۔ آپ کا قلم بہت ہی بے باک تھا۔ آپ جو محسوس کرتے تھے اس کو من وعن

رعایت کرتے تھے اور نہ ہی کسی قسم کا خوف محسوس کرتے تھے۔ اس زمانے میں 'ہمدم' کے ایڈیٹر سید جالب دہلوی نے ایک اداریہ لکھا تھا جس میں گورنر یوپی بٹلر کے عہدے کی توسیع کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے جواب میں قاضی صاحب نے زمیندار میں ایک اداریہ 'ہمدم کی بٹلر پرستی' کے عنوان سے لکھا جس میں سید جالب دہلوی کی خوب کھنچائی کی۔ سید جالب دہلوی نے اس کا جواب دیا لیکن قاضی صاحب کی نظر میں وہ 'عذر گناہ بدتر از گناہ' کے مصداق تھا۔ قاضی صاحب نے 'بٹلر پرستی پر اصرار' کے عنوان سے ایک دوسرا اداریہ پھر لکھا جس کا جواب سید جالب دہلوی نہ دے سکے اور خاموش ہو گئے۔

چونکہ اس سے پہلے زمیندار کے تمام ایڈیٹر یکے بعد دیگرے گرفتار ہو چکے تھے، اس لیے شروع میں قاضی صاحب کا نام سرورق پر نہیں آیا تھا۔ لیکن بعد میں مجبوراً قاضی صاحب کے نام کا ڈکلریشن دینا پڑا۔ اس وقت فضا بہت خراب تھی۔ زمیندار کی بار بار ضمانتیں ضبط ہوئیں اور دفتر کی تلاشی بھی ہوئی۔ باہر فضا میں قاضی عدیل عباسی کے لفظوں میں 'بارود بھری ہوئی تھی'۔ ایسے حالات میں قاضی صاحب کو کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اور سخت محنت کرنی پڑی، جس کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہوگئی اور اگست 1922 کو وہ گھر تشریف لے آئے۔ تقریباً ایک مہینہ کے بعد حکومت کے خلاف مقالے اور اداریے لکھنے کی پاداش میں انھیں لاہور کے وارنٹ پر گرفتار کرلیا گیا۔ تعزیرات ہند کی دفعہ 124 (الف) کے تحت ان پر سات مقدمے قائم کیے گئے۔ ان میں سے چار ریزرو رکھے گئے اور تین چلائے گئے۔ ان کو ایک سال کی سزا ہوئی۔ جیل میں ایک وقت مسور کی دال اور دوسرے وقت بیگن کی ترکاری ملتی تھی۔ عجیب اتفاق کہ قاضی صاحب کو یہ دونوں سالن پسند نہ تھے۔ مجبوراً نمک اور گول مرچ سے یا تیل میں ڈبوئی ہوئی مرچوں سے روٹی کھالیا کرتے تھے۔ جیل میں انھیں یرقان پھر ملیریا کا سخت حملہ ہوا۔ اسی حالت میں ستمبر 1923 میں جیل سے رہائی ہوئی۔

قاضی صاحب نے 'مدینہ' بجنور اور 'زمیندار' لاہور میں کام کرتے ہوئے انگریزوں کے خلاف بہت سے ایسے شعلہ بار اداریے اور مضامین لکھے جن کی وجہ سے حکومتِ برطانیہ کے ایوان میں زلزلہ برپا ہوگیا۔ قاضی صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ ایسے موضوعات پر بھی لکھتے وقت جذبات سے زیادہ دلائل کو بروئے کار لاتے اور جوش کے بجائے ہوش سے کام لیتے۔ 'زمیندار' میں 6 مئی 1922 میں 'حریت کامل' کے عنوان سے شائع ان کے ایک افتتاحیہ مقالے کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''نئے زمانے کا رنگ بدلتا جارہا ہے۔ ارتقائے دماغی کی ہر منزل انسان کو مطلق العنانی کی طرف راغب کررہی ہے۔ انسان اپنی اصلیت کو سمجھنے، اپنی خودی اور خودداری کو منتہائے کمال تک پہنچانے میں شوخی تمکنت سے کام لے رہا ہے۔ روس کا بالشویک زار کا سرتن سے جدا کرنے کے بعد تمام دنیا سے بادشاہت اور انسان کی دوسرے انسان پر بزرگی و برتری کا منکر و باغی ہوگیا۔ انقلاب فرانس میں استبداد کے خلاف بغاوت کا پہلا علم بلند ہوا تھا۔ آج یورپ کی موجودہ جمہوریت سے بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔ چھوٹی قومیں اپنے حقوق کے مطالبے اور آزادی کی جدوجہد میں منہمک ہیں۔ ڈی ویلرا تمام دنیا کے فتویٰ کے خلاف، دوست و دشمن کی رائے کے خلاف اور کچھ عرصہ تک ملک کی اکثریت کے خلاف جمہوریت کامل کا مطالبہ کررہا ہے۔ اس کی پرجوش کوششوں سے آئرلینڈ کی آزاد حکومت سخت خطرے میں مبتلا ہوگئی ہے اور پہلے جو لوگ اسے توہم پرست کہتے تھے وہ اب اس کی خداداد قابلیت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ دنیا اور اہل دنیا کے خیالات روز بروز ترقی کررہے ہیں۔ کہیں یہ نہیں پایا جاتا کہ قومیں اپنے فطری حقوق کے مطالبہ میں عاجزی اور انکساری سے کام لیتی ہوں لیکن ہمارے ابنائے وطن اب تک اس درجہ پر نہیں پہنچے۔ ابھی تک انھوں نے یہ نہیں سیکھا کہ افراد کی جانب سے ایثار کا اظہار سب سے بڑی نعمت ہے لیکن قوموں کے حقوق کے معاملے میں ایثار کو دخل نہ دینے اور جواز سے کم کا مطالبہ نہ کرنے سے بڑھ کر کوئی لعنت بھی نہیں۔ یہی وہ چیز ہے جسے دنیا میں بزدلی اور نامردی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ وہی اخلاقی کمزوری ہے جس سے بڑھ کر کوئی بات کسی قوم کے لیے باعث ننگ و موجب عار نہیں ہوسکتی۔''

'تحریک خلافت' جیسے اہم موضوع پر منفرد کتاب لکھنے والے قاضی عدیل عباسی شوق، تفریح طبع اور نام و نمود کے لیے میدان صحافت میں نہیں آئے تھے، بلکہ ان کے ضمیر، حب الوطنی کے جذبے، ملی تڑپ اور مقاصد کے تقاضے نے انھیں اس میدان میں کودنے پر مجبور کیا تھا۔ ان کے پاس افکار و نظریات اور جذبات کا وہ آتش فشاں تھا جو پھٹنے کے لیے بے چین تھا۔ احساسات کا ایک ایسا بحر بیکراں جس کی موجیں باطل کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جانا چاہتی تھیں۔ عزائم کا ایک طوفان تھا جو دشمن کو برباد کرنے پر آمادہ تھا۔ ان کا وجود انقلاب کی روح کا بے حجاب مشاہدہ اور کردار و عمل کا وہ نمونہ تھا جس کی آگ کی روشنی میں حرص، بزدلی، موقع پرستی، خودنمائی اور خوف کے حقیر جذبات کوڑھ کی مانند قابل نفرت دکھائی دینے لگتے ہیں اور ایثار، غیرت، خدمت، ستائش و صلے سے بے پرواہوکر کام کرنے کی ہمت کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ ملک وملت کے حالات کے پیش نظر اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے صحافت کا میدان منتخب کیا تو کچھ غلط نہیں کیا کیوں کہ وہ اس کا حق رکھتے تھے اور اس وقت جنگ جیتنے کا یہی سب سے کارگر ہتھیار تھا۔ کسی نے خوب کہا بھی تو ہے:

جب توپ مقابل ہوتو اخبار نکالو

قاضی صاحب اس وقت خود اخبار تو نہ نکال سکے لیکن اس مقصد کے تحت نکل رہے دوسرے اخباروں سے وابستہ ہوکر انگریزوں کی توپوں کا مقابلہ کیا اور یہ روشن حقیقت آج سب کے سامنے ہے کہ قاضی صاحب کو فتح حاصل ہوئی اور انگریزوں کو شکست۔ آج انگریزوں کی توپوں کے نام کوئی نہیں جانتا لیکن 'مدینہ' بجنور اور 'زمیندار' لاہور کے نام سے ہر شخص واقف ہے۔ انگریز بھی ان کی طاقت کے معترف ہیں۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ قاضی صاحب کا میدان صحافت میں آنے کا مطمح نظر نہ تو شہرت و ناموری کا حصول تھا اور نہ ہی اپنا صحافتی جوہر دکھانا ان کا نصب العین۔ بلکہ ملک وملت کی رہنمائی کے لیے انھوں نے یہ میدان منتخب کیا تھا۔ ان کے لیے صحافت حصول دولت کا ذریعہ نہیں، بلکہ وطن کی خدمت کا ایک وسیلہ اور دشمن کو شکست دینے کا ایک حربہ تھی۔ اسی نیک نیتی اور بے لوث خدمت کا نتیجہ تھا کہ ان کے دل میں حرص وطمع نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اور یہ سچائی ہے کہ جب کوئی انسان اخلاص اور خاص مقصد کے تحت قدم آگے بڑھاتا ہے تو دیگر انسانی کمزوریاں خود بخود پیچھے چھوٹ جاتی ہیں اور کامیابی کی منزل اس کا قدم چومتی ہے۔ وہ اپنے عزم وحوصلے کی بدولت ایک بلند مقام پر نظر آتا ہے۔ اس کا کردار بے داغ ہوتا ہے۔ قاضی صاحب بھی انھیں خصوصیات کے حامل تھے۔ قاضی صاحب کانگریس کے پرانے اور سرکردہ رہنما تھے۔ کئی بار رکن اسمبلی منتخب ہو چکے تھے۔ اپنی سماجی اور فلاحی سرگرمیوں کی وجہ سے عوام میں کافی مقبول تھے۔ اگر وہ مصلحت سے کام لیتے تو سیاسی واقتصادی اعتبار سے 'مقام بلند' پر فائز ہوتے لیکن انھیں مصلحت پسندی اور مصلحت پسندوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ خلوص، محبت، عزیمت اور استقامت کی علامت تھے۔

■

Mohd Wasiullah Husaini 56/11 Ka, Bagh Aina Bibi, Husain Ganj, Lucknow - 226001 (UP)

موبائل اور ایس ایم ایس صحافت

تنزیل اطہر

آج موبائل فون کے بغیر زندگی کا تصور بھی مشکل ہے۔ موبائل فون کے ذریعے ہم کیا نہیں کر سکتے۔ باتیں کرتے ہیں، ایس ایم ایس کے ذریعے پیغام بھیجتے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ تصویر اور ویڈیو شیئر کرتے ہیں۔ موبائل میں انٹرنیٹ کا استعمال کر کے فیس بک، ٹویٹر اور دوسری سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے ذریعے ہمہ وقت دنیا کے رابطے میں رہ سکتے ہیں۔ موبائل فون انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن گیا ہے۔ ہم گھر سے نکلتے وقت کوئی ضروری سامان بھول سکتے ہیں لیکن موبائل ایک ایسی ضرورت بن گئی ہے جسے ہر لمحہ ہم اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ موبائل فون استعمال کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چین کے بعد ہندستان میں موبائل فون استعمال کرنے والوں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ TRAI کے مطابق 2014 میں ملک میں موبائل فون استعمال کرنے والوں کی تعداد 92 کروڑ تھی۔

انفارمیشن (موبائل) ٹکنالوجی کے شعبے میں ہندستان تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ جس کا میڈیا پر بھی خاصہ اثر پڑ رہا ہے۔ ہندستانی میڈیا نے اپنا کام پرنٹ سے شروع کیا تھا جو الیکٹرانک میڈیا سے ہوتے ہوئے ویب میڈیا اور اب اس سے بھی آگے بڑھ کر موبائل اور ایس ایم ایس صحافت کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ آج اسمارٹ فون نے خبروں کی دنیا ہی بدل دی ہے۔ لوگوں کو اب اطلاعات و معلومات حاصل کرنے کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ ہندستان میں موبائل فون کا بڑے پیمانے پر استعمال کا ہی نتیجہ ہے کہ صحافت کی دنیا میں آج موبائل فون اطلاعات اور معلومات حاصل کرنے کا سب سے آسان اور تیز ذریعہ بن چکا ہے۔

موبائل اور ایس ایم ایس صحافت پر گفتگو کرنے سے پہلے موبائل فون کے سفر کی کہانی جان لینا ضروری ہے۔ 40 سال قبل جب موبائل فون کی شروعات ہوئی تھی تب سے لے کر آج تک اس کا سفر کافی اتار چڑھاؤ بھرا رہا ہے۔ 3 اپریل 1973 کو موٹورولا کمپنی کے ملازم مارٹن کوپر نے پہلا فون لانچ کیا تھا۔ انجینئر مارٹن نے اپنی حریف کمپنی کے ملازم کو فون کر کے موبائل فون پر بات چیت کی شروعات کی تھی۔ موٹورولا کے اس پہلے سیل فون کی لمبائی 10 انچ اور وزن 1 کلو تھا۔ اس کے قریب دس سال بعد موٹورولا نے پہلا موبائل ہینڈ سیٹ بازار میں اتارا تھا۔ اس وقت اس کی قیمت دو لاکھ روپے تھی۔ 1973 سے لے کر آج تک موبائل فون میں لگاتار کچھ نہ کچھ فیچر جڑتے جا رہے ہیں۔

پہلی جنریشن موبائل فون موٹورولا کمپنی کی طرف سے 1983 میں شروع کیا گیا تھا۔ یہ فون کافی بڑا اور وزنی ہوا کرتا تھا۔ Analog Technology پر چلنے والے اس فون میں آواز کی بہت دقت تھی۔ پولیس اور ٹریفک محکمے میں اس فون کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔ دوسری جنریشن کے موبائل کی شروعات 1990 میں ہوئی۔ اس دور میں موبائل کا استعمال خاص طور پر بات کرنے اور ایس ایم ایس کرنے کے لیے ہوتا تھا۔ اس دور میں جرمن انجینئر فریڈیلہم ہیلی برانڈ نے 160 الفاظ کے ٹیکسٹ میسج کی شروعات کی تھی۔ تیسری نسل کے موبائل کی شروعات 2005 میں ہوئی۔ 2G نیٹ ورک کے ساتھ الارم، گھڑی، کیمرہ اس کے خاص فیچر تھے۔۔ چوتھی جنریشن موبائل فون کی شروعات 2010 میں ہوئی۔ یہ 3G موبائل فون زندگی کا ایک اہم حصہ بن گیا۔ اس موبائل فون میں ویڈیو کالنگ، جی پی آر ایس، بلوٹوتھ، وائی فائی، انٹرنیٹ کے علاوہ دیگر فیچر شامل کیے گئے۔ اب تو تمام خوبیوں والے 4G موبائل فون کی آمد ہو چکی ہے۔

ہندستان میں پہلی موبائل فون سروس 15 اگست 1995 میں دہلی میں غیر تجارتی طور پر شروع کی گئی تھی۔ آج ملک میں 4G 2G, 3G, ہر طرح کی موبائل سروس موجود ہے۔ ہندستان میں موبائل نیٹ ورک کی پہنچ 97 فیصدی علاقے تک ہے۔ آج گاؤں گاؤں میں موبائل فون پہنچ چکا ہے۔ اس کی رسائی ایسے علاقوں تک ہے جہاں ماس میڈیا کے دیگر ذرائع ... اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی پہنچ نہیں کے برابر ہے۔ ایسے میں خبریں اور دیگر معلومات کے لیے موبائل صحافت کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

موبائل فون نے صحافت کے پیشے کو بھی آسان بنا دیا ہے۔ اس کے ذریعے نہ صرف رپورٹر دور دراز کی خبروں کو ایس ایم ایس کے ذریعے بریک کروا سکتا ہے بلکہ اپنے اسمارٹ فون سے تصویر اور ویڈیو بنا کر جلد از جلد نیوز روم بھیج سکتا ہے۔ وار زون میں یا ایسی جگہ جہاں بھاری بھرکم کیمرے اور دیگر آلات کے ذریعے رپورٹنگ نہیں ہو سکتی۔ جہاں جان کو خطرہ ہے ایسے حالات میں موبائل فون ہی صحافی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ عرب بہاریہ کے دوران پوری دنیا کے لوگوں کو موبائل اور ایس ایم ایس کے ذریعے ہی جمہوریت کی جدو جہد کی کہانی سنائی دی۔ حال ہی میں اتراکھنڈ اور کشمیر میں قدرتی آفات نے زبردست تباہی مچائی، لوگوں کے پاس سر چھپانے کے لیے جگہ نہیں تھی اور نہ کھانے کے لیے نوالہ، سڑکیں ٹوٹ چکی تھی، آمد و رفت پوری طرح بند تھی۔ لیکن ان حالات میں بھی صحافتی وسائل بخوبی کام کر رہے تھے۔ دور دراز کے گاؤں میں صحافتی برادری کے لوگ ہر دن واٹس اپ پر تصویریں بھیج رہے تھے، ویڈیو بھیج رہے تھے اور ہر پل کی خبریں ایس ایم کے ذریعے لوگوں تک پہنچ رہی تھیں۔

موبائل ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے خبروں کو سننے اور دیکھنے کا نظریہ ہی بدل دیا ہے۔ موبائل اور ایس ایم ایس

صحافت کا یہ فائدہ ہے کہ آپ کو ریڈیو کی خبریں سننے کے لیے ٹرانزسٹر اور ٹی وی چینلوں کی خبریں دیکھنے کے لیے ٹی وی سیٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس آپ کا موبائل فون ہی کافی ہے۔ FM ریڈیو سے لیس موبائل فون پر مختلف ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام 24 گھنٹے سنا جا سکتا ہے۔ آپ خاص موبائل اپلیکشن کے ذریعے دنیا جہان کے ٹی وی چینلس موبائل پر دیکھ سکتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اپنے اسمارٹ فون پر آپ ٹی وی کے پروگرام ریکارڈ بھی کر سکتے ہیں۔ ہندستان کے تقریباً سبھی بڑے چینل مثلاً آج تک، این ڈی ٹی وی، اے بی وی پی، انڈیا ٹی وی وغیرہ موبائل فون پر بھی دستیاب ہیں۔ موبائل ٹی وی کا جس طرح رجحان بڑھ رہا ہے۔ آنے والے دنوں میں سبھی چینلس مفت فون پر دستیاب ہوں گے۔

حالیہ دنوں میں موبائل پر انٹرنیٹ کا استعمال تیزی سے بڑھا ہے۔ اس کا فائدہ اٹھا کر موبائل صارفین کسی بھی وقت مختلف خبر یا ویب سائٹ پر خبریں پڑھ سکتے ہیں۔ موبائل پر سوشل میڈیا کا چلن بھی بڑھ رہا ہے۔ سوشل میڈیا کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملک میں انٹرنیٹ استعمال کرنے والے کل 25 کروڑ لوگوں میں ایک چوتھائی لوگ سماجی رابطے کی سائٹ پر اپنا وقت گزارتے ہیں۔ اب تو کئی موبائل کمپنیاں اور خبروں کے پورٹل صارفین کو ایس ایم ایس کے ذریعے تازہ ترین خبریں پہنچا رہے ہیں۔ آپ کہیں بھی ہوں، بس ایک ایس ایم ایس کے ذریعے دنیا جہان کی خبریں اپنے موبائل پر اختصار کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں دیکھ سکتے ہیں اور سن بھی سکتے ہیں۔

اتنے برسوں میں صحافت شاید نہیں بدلی ہے لیکن ٹکنالوجی نے صحافت کرنے کے طور طریقوں میں کافی تبدیلی لا دی ہے۔ یہ فطری بھی تھا کیونکہ ٹکنالوجی کی وجہ سے خبروں کے ساتھ لوگوں کا رشتہ بھی مسلسل بدلتا رہا ہے۔ موبائل نے اب ہر شخص کو Citizen Journalist بنا دیا ہے۔ موبائل جیسے ذرائع ابلاغ کا استعمال کر کے صرف صحافی ہی نہیں بلکہ عام شہری بھی آئے دن ہونے والے حادثات اور واقعات کی خبریں دیش دنیا میں پہنچا سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص انڈمان نکوبار میں رہتا ہے۔ اس کے علاقے میں نہ تو بجلی ہے اور نہ ہی ذرائع ابلاغ کے دوسرے طریقے۔ اگر اس کو اپنے علاقے میں ہوئے کسی حادثے کے بارے میں دنیا کو بتانا ہے تو اس کا آسان طریقہ موبائل فون ہی ہے۔ جس کے ذریعے وہ ایس ایم ایس یا تصویریں بھیج کر اپنی باتیں دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ موبائل میڈیا کے ذریعے نہ صرف اطلاعات و معلومات لوگوں تک پہنچائی جاتی ہے بلکہ اس سے بدعنوانی اور انسانی حقوق کی پامالی کو روکنے کے علاوہ ترقیاتی کاموں میں بھی تیزی لائی جا سکتی ہے۔ کئی حکومتوں نے بدعنوانی کو روکنے اور ترقیاتی کاموں پر نظر رکھنے کے لیے موبائل اور ایس ایم ایس کا سہارا لیا ہے۔ منریگا، مڈڈے میل اسکیم اور کسان کال سینٹر اس کی عمدہ مثال ہیں۔ ملک کی سیاسی، سماجی اور معاشی ترقی میں موبائل فون اہم رول ادا کر رہا ہے۔ موبائل نہ صرف لوگوں کو نزدیک لے آیا ہے بلکہ اس سے طلاعات اور معلومات کا Democratisation بھی ہوا ہے۔

موبائل اور ایس ایم ایس صحافت، جرنلزم کی دنیا میں ایک نئی تکنیک کے روپ میں ابھر رہی ہے۔ ایس ایم ایس کے طریقے سے خبروں کو لکھنا اور اسے ایڈٹ کرنا، موبائل کے لیے ویڈیو بنانا بڑی مہارت کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موبائل خدمات فراہم کرانے والی کمپنیوں اور دیگر اداروں نے ایسے تربیت یافتہ صحافیوں کی خدمات لینا شروع کر دی ہیں جنہیں موبائل اپلیکیشن کی اچھی جانکاری ہو جو خبروں کو اختصار اور دلچسپ انداز میں پیش کرنے کا ہنر بھی جانتے ہوں۔ موبائل صحافت کی وجہ سے صحافت کے شعبے میں روزگار کے مواقع بھی بڑھے ہیں۔ بریکنگ نیوز کے اس دور میں نیوز بریک کرنے کا سب سے پہلا وسیلہ موبائل فون ہی بن گیا ہے۔ اس کے ذریعے ہی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا خبریں جٹانے کا کام کرتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں کئی میڈیا آرگنائزیشن موبائل صحافت کو فروغ دے رہے ہیں۔ امریکہ کی Gannett Inc. کمپنی اس کی عمدہ مثال ہے۔ یہ امریکہ کی سب سے بڑی اخبار شائع کرنے والی کمپنی ہے جو USA Today جیسا نامی اخبار بھی چھاپتی ہے۔ اس کمپنی نے اپنے صحافیوں اور فوٹوگرافروں کو iphone دے رکھے ہیں۔

اب ایک نظر ڈالتے ہیں کچھ موبائل اپلیکیشن پر جن کا استعمال کر کے کوئی بھی شخص صحافت کے کام کو بہتر طریقے سے انجام دے سکتا ہے۔

Clipboard۔ یہ اپلیکیشن ملک اور بیرون ملک کے اخبار اور رسائل کی خبریں، سوشل میڈیا اپڈیٹ کو ایک خوبصورت اور واضح طریقے سے موبائل اسکرین پر پیش کر دیتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس میں کتاب کی طرح صفحات پلٹنے کا مزہ لیا جا سکتا ہے۔

Camera+۔ یہ موبائل اپلیکیشن آپ کے موبائل کی تصویر کے معیار کو بہتر بناتا ہے۔ اس میں تصویر کھینچتے وقت آپ اسٹیبلائزر یا ٹائمر کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد تصاویر کو ایڈٹ یا کاٹ چھانٹ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس اپلیکیشن کے ذریعے تصاویر کو الگ الگ طریقے سے فریم بھی کیا جا سکتا ہے۔

Audioboo۔ یہ ایک آڈیو اپلیکیشن ہے۔ جو آپ کو ریکارڈ، اپلوڈ اور آڈیو اشتراک کرنے کی سہولت دیتا ہے۔ صارفین کی ایک بڑی تعداد اپنی آواز لوگوں تک پہنچانے کے لیے اس کا استعمال کرتی ہیں۔ آپ اس میں آواز کے ساتھ ایک تصویر بھی اپلوڈ کر سکتے ہیں۔

Evernote۔ اس میں آپ تصویریں، نوٹس، آڈیو فائل اور ویب لنکس محفوظ کر سکتے ہیں۔ اور ان تمام چیزوں کو دوسری Devices میں بھی منتقل کر سکتے ہیں۔ یہ ٹرین اور ہوائی سفر میں رپورٹ تیار کرنے میں بہت مددگار ہے۔ اس اپلیکیشن کو انسان کا دوسرا دماغ بھی کہا جاتا ہے۔

Google Translate۔ اس ایپ کی مدد سے آپ انگریزی سے ہندی، اردو یا دنیا کی دیگر زبانوں کا کسی بھی زبان میں ترجمہ کر سکتے ہیں۔ اردو صحافت میں اس اپلیکیشن کی بہت مدد لی جاتی ہے۔

Google Map۔ اس میں قریب دنیا کے تمام ممالک کے نقشے آپ کو مل جائیں گے۔ ساتھ ہی آپ سیٹلائٹ اور ٹریفک کی بنیاد پر بھی نقشے دیکھ سکتے ہیں۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں اس اپلیکیشن کا بھی خوب استعمال کیا جاتا ہے۔

Whatsapp۔ اس موبائل اپلیکیشن کے ذریعے آپ گروپ چیٹ کر سکتے ہیں۔ فوٹو، ویڈیو اور آڈیو بھی بھیج سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی سیکڑوں موبائل اپلیکیشن ہیں۔ جن کے ذریعے صحافت کے پیشے کو آسان بنایا جا سکتا ہے۔

موبائل پر خبروں اور پروگراموں کی دستیابی کی اہمیت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ آنے والا وقت موبائل اور ایس ایم ایس صحافت کا ہے۔ جب ہر فرد کے ہاتھ میں موبائل ہوگا اور لوگوں کو رنگین اسکرین پر چلتے پھرتے اطلاعات و معلومات کا خزانہ ملتا رہے گا تو لوگ روایتی میڈیا کی طرف کم رجوع ہوں گے۔ ظاہر ہے ایسی سہولیات ملنے کے بعد اخبار پڑھنے یا ٹیلی ویژن دیکھنے کی زحمت کون گوارہ کرے گا۔ یہ دیکھنا دلچسپ ہوگا کہ آنے والے دنوں میں موبائل فون کا یہ انقلاب کیا گل کھلاتا ہے۔

Mr. Tanzeel Athar, 269, Sabarmati Hostel, JNU
New Delhi - 110025
Email.:tanzeeljnu@gmail.com

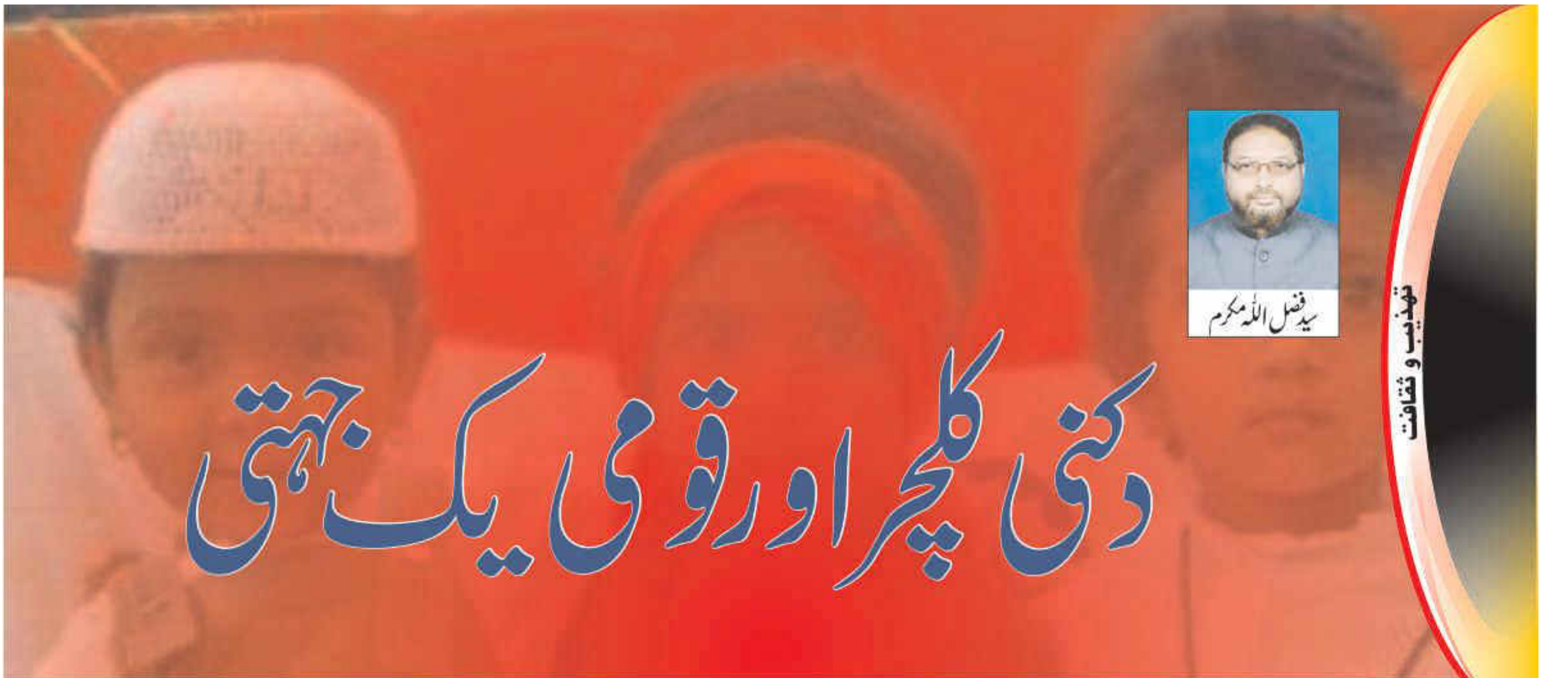

سید فضل اللہ مکرم

دکنی کلچر اور قومی یک جہتی

قومی یکجہتی میں ہی ہندوستانی تہذیب کی بقا ہے کیونکہ جتنے مذہب، طبقات، فرقے، زبان اور بولیاں اس ملک میں ہیں وہ دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ہیں۔

ہندوستانی سماج ایک زندہ اور متحرک سماج ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کو نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ آپس میں تہذیب، تمدن، ثقافت اور علم وادب کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔ تب کہیں اتحاد، اخوت اور قومی یکجہتی کے سوتے پھوٹنے لگتے ہیں۔ سچ کہا جائے تو ہندوستانی ہمیشہ سے سیکولر رہے ہیں۔ کئی بیرونی اقوام یہاں آئیں اور ہر کسی کو ہندوستانیوں نے خوش آمدید کہا۔ ان سے گھل مل کر رہے کچھ انھیں سکھایا کچھ ان سے سیکھا جس سے یہاں ملاجلا کلچر فروغ پاتا رہا۔ اس قومی یک جہتی کو فروغ دینے میں جنوبی ہندوستان خصوصاً دکنی کلچر کا نمایاں رول ہے کیوں کہ دکنی حکمراں نے اپنی حکومت کی بنیاد ہی قومی یک جہتی پر رکھی تھی۔

فیروز شاہ بہمنی جو بہمنی خاندان کے آٹھویں فرماروا گزرے ہیں، نے پہلی مرتبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اسی نہج پر مغل حکمراں اور قطب شاہی سلاطین نے ان دو بڑے طبقات کے درمیان یکجہتی اور رواداری پیدا کرنے کی تحریک چلائی جو برسوں کامیاب رہی۔ بہمنی دور میں ہندو مسلم یک جہتی کی کئی ایک مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہاں کی معاشرت، طرز تعمیر، ادب و آرٹ اور زبان و ادب سے قومی یک جہتی کی تصویر روشن ہوتی ہے۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ''ایک دفعہ وجیا نگر کے حکمراں دیویارایا نے امرا اور عمائد کو طلب کیا اور ان سے دریافت کیا کہ گو ہماری سلطنت کا رقبہ بہمنی سلطنت کے رقبے سے کہیں زیادہ ہے اور آبادی کی بھی فراوانی ہے، تا ہم جب کبھی جنگ ہوتی ہے تو بہمنیوں کی فتح کا ڈنکا بجتا ہے اور ہمارے ملک کو خرچۂ جنگ اور خراج ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں کئی ایک رائیں دی گئیں۔ کسی نے کہا کہ مسلمان گھڑ سواری اور تیر اندازی میں یکتا ہوتے ہیں اور اگر ہمیں جنگ میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی فوج میں مسلمانوں کو بھرتی کریں۔ راجا نے اس فریق کی رائے تسلیم کر لی اور فوج میں مسلمان سپاہیوں اور افسروں کو بھرتی کرنے کا حکم نافذ کر دیا۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی دے دیا کہ مسلمان سپاہیوں کے لیے ایک مسجد کی تعمیر کی جائے اور ان کے نماز روزے اور دوسرے اسلامی ارکان میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔'' (مشمولہ دکنی کلچر، ہارون خان شروانی، ص 28)

وجیا نگر کے حکمراں کی یہ سیاسی مجبوری تھی کہ اس نے اپنی فوج میں مسلمانوں کی بھرتی کی لیکن مسلمانوں کے لیے مسجد بنانا اور ان کے دیگر اسلامی ارکان کی ادائیگی میں مداخلت نہ کرنے کا حکم جاری کرنا، ان حکمراں کی مذہبی رواداری ہے۔ یہاں کے ہندو حکمراں نے مسلمانوں کے ساتھ مذہبی رواداری برتی تو مسلم حکمراں نے یہاں کی ہندو رعایا کو نہ صرف گلے لگایا بلکہ انھیں دربار میں عہدے اور منصب بھی عطا کیے۔ قومی یک جہتی دو طرفہ عمل ہے اور یہ عمل دکنی کلچر کا ہمیشہ سے جُز رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شہر ناسک میں سری رام چندر جی نے اپنے بن باس کے دوران قیام کیا تھا اور یہ مقدس مقام بہمنی دور میں بھی ہندو یاتریوں کا مرکز رہا ہے۔ اس کے علاوہ اولیاء اللہ نے رشد و ہدایت کے ذریعے مختلف مذاہب کے پیروؤں کو جوڑے رکھا آج بھی یہ مزار و مقبرے نہ صرف تعمیر و تزئین کے لحاظ سے ایران وعرب و ہندوستانی آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں بلکہ عقیدت کے اعتبار سے قومی یک جہتی کا پیکر ہیں۔ حد تو یہ ہے احمد شاہ ولی بہمنی کا عرس اب بھی قدیم آب و تاب سے منایا جاتا ہے اس عرس کا آغاز ایک برہمن انجام دیتا ہے وہ عرس کے تینوں دن علی الصبح مقبرے میں داخل ہوتا ہے، ناریل پھوڑتا ہے قبر پر پھول چڑھاتا ہے ان ہندو رسوم کے بعد ہی مسلمانوں کو عرس کا جائزہ دیتا ہے۔ بھلا قومی یک جہتی کی ایسی مثالیں دنیا کے کس کلچر میں ملتی ہیں؟

پروفیسر ہارون خان شروانی دکنی کلچر کی ایک مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یوں تو جتنے مزار بزرگانِ دین کے دکن میں ہیں وہ سب مرجع خاص و عام ہیں لیکن گلبرگہ میں ایک مزار ایسا ہے جو اپنی نوع میں یکتا ہے اور جو ایک اعتبار سے دکنی کلچر کا مرقع ہے۔ یہ حضرت رُکن الدین تولہ کا مزار ہے جو گلبرگہ سے چار میل فاصلہ پر واقع ہے۔ حضرت نے اپنے وصال سے پہلے یہ وصیت کی کہ جو شخص میرے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے آئے، اس پر لازم ہے کہ آنے سے ایک دن ایک رات پہلے کسی قسم کا گوشت نہ کھائے۔ چنانچہ حضرت کے وصال کے ساڑھے چار سو برس بعد بھی اس وصیت کی پابندی کی کوشش کی جاتی ہے'' (دکنی کلچر ص 30)

بیجا پور کا عادل شاہی دور بھی مختلف اقوام میں اتحاد اور قومی یک جہتی کا مظہر تھا۔ عادل شاہی حکمرانوں کو اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کی سلطنت میں ہندو، مسلمان، مرہٹے، کنڑ، دکنی، ایرانی، حبشی غرض مختلف قومیں آباد تھیں۔ اس لیے ان سلاطین نے ہمیشہ قومی اتحاد کے فارمولے پر عمل کیا۔ جس طرح راجپوتوں نے مغلوں کا ساتھ دیا اسی طرح مرہٹوں سرداروں کی عادل شاہی حکمرانوں سے وفاداری اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں بھی ہندو مسلم آپس میں شیر و شکر کی طرح رہتے تھے۔ بقول پروفیسر

شروانی شیواجی کے دادا مالوجی کو جب اولادنہیں ہوئی تو انھوں نے پیر و مرشد حضرت شاہ شریف سے دعا کی درخواست کی۔ حضرت کی دعا قبول ہوئی اور مالوجی کو ایک کے بجائے دو بیٹے ہوئے۔ انھوں نے مرشد کے نام پر اپنے بچوں کے نام شاہ جی اور شریف جی رکھا اور شاہ جی کے بیٹے شیواجی ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی، عوام میں بہت مقبول تھے عوام انھیں 'ابلا بلی' اور 'محافظ غربا' کے نام سے یاد کرتی تھی۔ اس کی مشہور تصنیف 'نورس' ہندی گیتوں کی کتاب ہے جس کے ہر گیت کے آغاز میں 'سُر اور لے' کا تعین کیا گیا ہے۔ بعض گیت ہندو معبودوں کے لیے گائے جاتے ہیں۔

قطب شاہی درباروں نے فارسی اور اردو ادب کو فروغ دیا تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے لیکن ان مسلم درباروں نے مقامی اور علاقائی زبان و ادب اور ان کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کو جو ترقی دی ہے وہ یقیناً حیرت کی بات ہے۔

قطب شاہی دور کے سلاطین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ مذہب کو ریاست سے الگ رکھا اور اپنے عقائد کو کبھی بھی امور سلطنت پر مسلط نہیں کیا۔ وہ انتہائی روادار اور روشن خیال تھے۔ اس ضمن میں ہندوستان کا کوئی بھی مسلم بادشاہ قطب شاہیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تبھی تو انھیں آندھراپردیش سے اس قدر ذہنی وابستگی اور جذباتی لگاؤ تھا کہ انھوں نے آندھرا کی تہذیب و ثقافت تلگو زبان و ادب اور رقص و موسیقی کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان حکمرانوں میں اہم نام ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ نے دکن کی سیاست اور تہذیب پر ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ مشہور مورخ ڈاکٹر وینکٹ رمیا 'سلاطین قطب شاہی کی رواداری' میں رقم طراز ہیں:

''انھوں نے ہندوؤں کی مذہبی تعلیم، پوجا پاٹ اور مندروں کی نگہداشت کے لیے بڑے بڑے گاؤں وقف کر کے اپنی ہندو رعایا کا دل موہ لیا تھا۔ آج بھی دریائے کرشنا کے ساحل پر عبداللہ کے عہد کا ایک کتبہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک گاؤں کسی ویدک برہمن کے نام وقف کردیا تھا تاکہ اس کی آمدنی سے پوجا پاٹ، قربانی اور وید شاستر کی تعلیم کے اخراجات کی پابجائی ہوسکے۔''

سلطان قلی کی شہادت اور جمشید کی تخت نشینی کے بعد ابراہیم قطب شاہ نے وجیانگر ریاست میں سات سال تک پناہ لی اور اس دوران اس نے تلگو زبان و ادب اور تہذیب وتمدن کو نہایت قریب سے دیکھا بلکہ تلگو تہذیب اس کی روح میں رچ بس گئی تھی اور ان ہی لوگوں کی اخلاقی تائید سے گولکنڈہ پر قابض ہوا۔ مذہب و مسلک کے لحاظ سے اس نے بڑی وسیع النظری سے کام لیا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

''اس کی اولاد بھی مختلف زبانیں بولنے والی اور مختلف مذہبوں کے ماننے والی عورتوں سے تھی۔ اس کا بڑا شہزادہ شاہ عبدالقادر کی ماں بیدر کے ایک مشہور مشائخ خاندان سے تھی۔ شہزادہ محمد قلی اور شہزادہ خدابندہ کی ماں ایک آندھرا خاتون بھاگیہ رتی تھیں۔ شہزادہ محمد امین کی والدہ ایران کے سادات سے تھیں اور شہزادہ حسین قلی ایک شیعہ خاتون کے بطن سے تھا۔ اس نے آندھراؤں، حبشیوں، دکنی مسلمانوں اور ایرانیوں کو اپنے دربار میں مساوی ترقی کے مواقع دیے۔'' (مضامین ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، جلد سوم، زیر ترتیب سید رفیع الدین قادری، ص25)

ابراہیم قطب شاہ کے بعد محمد قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا اور اس کے دور میں بھی علم و ادب کی سرپرستی برقرار رہی۔ ویسے یہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے لیکن اس نے تلگو زبان و ادب کے فروغ میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اس کے دربار میں فارسی اور دکنی کے شاعروں کی طرح تلگو شعرا بھی باریاب ہوتے تھے۔ وہ خود بھی اپنے باپ ابراہیم کی طرح تلگو کا شاعر تھا مگر دونوں کا تلگو کلام ابھی تک دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر' محمد قلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''محمد قلی قطب شاہ اپنے باپ، دادا اور چچا کی روش سے ہٹ کر اپنے آپ کو دکن کی جغرافیائی خصوصیات سے اس طرح ہم آہنگ کرلیا تھا کہ وہ تلنگانہ کا راجہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے آباواجداد کے ترکستانی لباس کو ترک کر کے مقامی لباس وضع قطع اور طور طریق اپنائے۔ یہاں تک کہ مقامی زبان تلگو پر بھی عبور حاصل کیا۔ قطب شاہی سلاطین میں وہ پہلا اور آخری بادشاہ ہے جس نے داڑھی کے بجائے مونچھ رکھی اور اپنے کندھوں پر مقامی راجاؤں کی طرح 'انگ وسترم' کپڑا یا چادر اوڑھا اور ایرانی وضع کے کوٹوں اور قاقم وسنجاب کے نیمچوں اور شملوں کے بجائے دکن کی آب وہوا کے مطابق دیسی ململ کے ہلکے پھلکے اور مہین کپڑے زیب تن کیے۔'' (تحقیقاتِ اثر از پروفیسر محمد علی اثر، 2005، ص 14,15)

سلاطین گولکنڈہ نے سارے علاقے کو اتحاد، اخوت اور بھائی چارگی کا مرکز بنادیا تھا۔ انھوں نے نہ صرف اردو، فارسی اور تلگو شعر و ادب کی سرپرستی فرمائی بلکہ خود بھی ان زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ وہ علم پرور سلاطین تھے جنھوں نے مقامی تہذیب و معاشرت کو گلے لگایا اور اسلامی روایتوں کے ساتھ ساتھ ان کو بھی پروان چڑھایا۔ شعر و ادب، موسیقی، رقص، تعمیرات میں نہ صرف اسلامی ثقافت کا عکس ملتا ہے بلکہ مقامی تہذیب وتمدن کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ بلکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ ''قطب شاہی بادشاہوں کی ایک مشترک خصوصیت یہ تھی کہ وہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ انھوں نے ایک طرف اپنے نسلی خصائل باقی رکھے اور اسلامی علوم کو ترقی دی اور دوسری طرف اپنے ملک کے تہذیب و تمدن کو اپنا کر ایک 'تیسرا کلچر' پیدا کیا جس میں دونوں کلچر کے صحت مند عناصر موجود تھے۔''

(تاریخ ادب اردو (جلد اول)، از ڈاکٹر جمیل جالبی، 2004، 382)

ہندوستان کے کسی شاہی دربار نے اس قدر فیاضی اور علم پروری کا مظاہرہ نہیں کیا جتنا قطب شاہی درباروں نے انجام دیا ہے اور یہ سارے عالم کے لیے ایک آئیڈیل شاہی دربار ہیں۔ جن کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے وہ کم ہے۔

دکنی تہذیب وتمدن کا قومی یک جہتی کلچر آصف جاہی حکمرانوں میں بھی برقرار رہا گو کہ اب اس کلچر پر ایرانی اور شمالی ہند کلچر کے اثرات بھی مرتب ہونے لگے۔ یہاں کے لباس، طرز تعمیر اور دیگر فنون لطیفہ پر مغلوں کی تہذیب و ثقافت کے واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔ آصف جاہی حکمرانوں نے ملکی معاملات میں ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے اور منصب عطا کیے اور قومی یک جہتی کے کلچر کو مرنے نہیں دیا۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نے جامعہ عثمانیہ (جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا) قائم کر کے اردو دوستی کی ایک یادگار قائم کردی۔

آج بھی دکن کے علاقے میں قومی یک جہتی اپنی مثال آپ ہے۔ اب بھی شادی بیاہ کے بیشتر رسومات ہندو تہذیب کی ہیں مگر مسلمانوں نے اپنالی ہیں حتیٰ کہ مرنے کے بعد کی مختلف رسومات بھی مسلمانوں نے ہندووں سے مستعار لے لی ہیں۔ طرز معاشرت پر دیگر اقوام کے معاشرتی اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ آج بھی اردو زبان و ادب نے یہاں کی مختلف اقوام کو آپس میں جوڑے رکھا ہے۔ بہمنی دور ہو کہ پھر اس کی پانچ ریاستیں، سلطنتِ گولکنڈہ ہو کہ ریاست حیدرآباد دکن، آندھرا پردیش ہو یا تلنگانہ... ہم نے سیاسی سطح پر بہت کچھ کھویا مگر سماجی سطح پر ہم نے کبھی قومی یک جہتی کے دامن کو نہیں چھوڑا اور نہ ہی کبھی چھوڑ پائیں گے۔

■

Dr.Syed Fzlullah Mukarram
H.No. 16-9-537 , Near Water Tank
Old Malakpet,Hyderabad 500036

کوکن کے اردو لوک گیت

محمد دانش غنی

ہندوستان کی تمام ریاستوں میں ریاستِ مہاراشٹر اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے مغرب میں بحرِ عرب کا وسیع ساحل ہے جو اسے انگنت فائدے بخشتا ہے اور اس کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ شمال مغرب میں گجرات کی ریاست، شمال مشرق میں مدھیہ پردیش، جنوب مشرق میں آندھرا پردیش اور جنوب میں کرناٹک اور گوا کی ریاستیں واقع ہیں۔ ان ریاستوں سے مہاراشٹر کے سیاسی وتہذیبی، تجارتی ومعاشی، اقتصادی اور لسانی تعلقات ایک طویل عرصے سے قائم ہیں۔ طبعی لحاظ سے مہاراشٹر دو حصوں میں منقسم ہے۔ یعنی سہیادری کے پہاڑی سلسلے کی بدولت اس کا مشرقی حصہ سطح مرتفع کا علاقہ یا گھاٹ ماتا کہلاتا ہے اور مغربی حصے کو خطۂ کوکن کہتے ہیں۔

خطۂ کوکن تھانے، رائے گڈھ، رتناگری اور سندھو درگ نامی چار اضلاع پر مشتمل ہے جس میں ہزاروں گاؤں اور سیکڑوں شہر آباد ہیں۔ زمانۂ قدیم سے یہاں پر مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی موجود ہے۔ کوکن کے مسلمان مقامی زبان مراٹھی سے اچھی طرح واقف ہیں، اردو زبان ان کی تعلیمی اور علمی و ادبی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ انگریزی وقت کے تقاضے کے تحت زندگی میں داخل ہوچکی ہے۔ یہاں کے مسلمان کوکنی بولی کو بطور مادری زبان استعمال کرتے ہیں۔ البتہ کوکن میں معاشرتی، مذہبی اور عوامی اسباب کی بنا پر اردو جیسی مخلوط زبان نے ایک اہم حیثیت حاصل کرلی ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ زبان یہاں ذریعۂ تعلیم بھی ہے اور اس میں نثر اور شاعری کی تخلیق بھی ہوتی رہی ہے اس لیے یہاں کے مسلمانوں نے اپنے جذبات واحساسات کی ادائیگی کے لیے جن لوک گیتوں کو جنم دیا وہ اردو میں ہی ہیں۔

لوک گیتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک طرف یہ ہمارے دلی جذبات اور احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں تو دوسری طرف ہماری تہذیب یعنی رسم و رواج کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ کبھی سخت محنت ومشقت کے دوران تھکن دور کرنے کے لیے اور کبھی وقت کی طوالت کے احساس سے گریز کے لیے بھی یہ نغمے ہماری مدد کو آن حاضر ہوتے ہیں۔ ہمارا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لیے یہ گیت موسیقی کا نقاب اوڑھ کر نہایت مہارت اور لطافت سے پیغامبری کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور تنقیدی نظر سے مطالعہ کرنے والوں کے لیے لوگوں کی نفسیات اور ان کے لسانی تنوعات کو پہچاننے میں بھی رہنمائی کرتے ہیں۔ کوکن کے اردو لوک گیتوں میں دکنی اور کوکنی بولی کی آمیزش پائی جاتی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کوکن اور دکن کی سرزمین کئی خصوصیات کی یکساں طور پر حامل ہیں اس لیے ان کے گیت، لب و لہجے اور ذخیرۂ الفاظ ایک دوسرے سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ بہرحال ان گیتوں میں فنکارانہ ذہانت اور مہارت کی کمی کے باعث کہیں قواعد وزبان کی غلطیاں پائی جاتی ہیں تو کہیں بے وزن و بے بحر مصرعوں کی تک بندی بھی ملتی ہے جو برسہا برس کے تصرف اور عمومیت کے عمل کا

نتیجہ ہے۔ ان گیتوں کو خواہ وقتی جذبات و احساسات کی قلمرو میں بہنے والے چشموں سے تعبیر کریں جو اپنی روانی کے آپ مالک ہوتے ہیں یا طبیعت کی آزاد روی اور مزاج کی بے ساختگی کے پرچموں سے تشبیہ دیں جو اپنی آن بان اور شان سے لہراتے ہیں مگر پھر بھی فکر و خیال کے ان مرقعوں میں عوامی زندگی، طرزِ معاشرت اور سماجی شعور کے گہرے پھیکے، کچے پکے رنگ ضرور نظر آتے ہیں۔ ان گیتوں میں غضب کی موسیقی بھی پائی جاتی ہے اور میرے خیال سے یہ موسیقی ہی ان کی ایک بڑی شناخت ہے۔ چونکہ ان کے موضوعات بھی انسانی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں اس لیے ان گیتوں میں موضوع کا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان میں مذہبی گیت بھی شامل ہیں اور ہندوستانی اساطیر کا غیر فانی کردار بھی۔ صوفیوں اور درویشوں کے اپدیش بھی ہیں تو شجاعت اور بہادری کا ذکر بھی۔ موسموں کی تبدیلی بھی موجود ہے تو بیج بونے اور فصل کاٹنے کے ساتھ شادی بیاہ کے گیت بھی ملتے ہیں اور یہی مختلف النوع موضوعات کوکن کے اردو لوک گیتوں کی اہم خصوصیات ہیں۔

کوکن کے اردو لوک گیتوں میں جو گیت آج بھی بکثرت و بہ آسانی دستیاب ہوتے ہیں ان میں ڈھولک کے گیت نہ صرف بڑے دلچسپ اور پر لطف ہوتے ہیں بلکہ عوامی زندگی کے رسم و رواج کے ایک لازمی جزو کے طور پر بھی دیکھے جاتے رہے ہیں۔ دکھ درد کی حالتوں میں اظہارِ ہمدردی اور اظہارِ غم کرنا، نشاط اور انبساط کے موقعوں پر اظہارِ مسرت کرنا فطرتِ انسانی کا خاصہ رہا ہے۔ خوشیوں کی ہر تقریب مثلاً شادی بیاہ، بسم اللہ خوانی، عقیقہ، گل پوشی اور عید و تہوار وغیرہ میں ڈھولک کے گیتوں کا رواج عام ہے۔ طبقۂ امرا و نوابین میں یہ خوش گوار فریضہ مراثیوں کے حصے میں آتا تھا جو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ مفقود ہو چکا ہے۔ مگر عام گھرانوں میں خاص کر قصبات اور دیہاتوں میں آج بھی ڈھولک بج اٹھتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان گیتوں کا سلسلہ کم عمر بچیوں سے شروع ہو کر شادی شدہ، غیر شادی شدہ، بوڑھی اور بیوہ خواتین کے بھی ذوق و شوق اور ان کی گہری دلچسپیوں کی وجہ سے رات رات بھر چلتا رہتا ہے۔ مثلاً:

لاگی ہے لگن تم سے چھڑا کون سکے گا
ساڑی ہے میری زر میں بھری نظر نہ مارو
ائے بی بو تیرا پلو پکڑ کون سکے گا
اماں کا وطن ہم سے چھڑا کون سکے گا
باوا کا وطن ہم سے چھڑا کون سکے گا

چلی ناؤ میری کنارے کنارے
سونے روپے کا میں چوسر بچھائی
چلو چل کے کھیلیں گے دریا کنارے
چلی ناؤ میری کنارے کنارے

ڈوپٹہ میلا ہوا ہم نے دھوبی کو دیا
کوئی دھلا کے منگا دے ڈوپٹہ میرا
ڈوپٹہ پھٹ گیا ہم نے درزی کو دیا
کوئی سلا کے منگا دے ڈوپٹہ میرا
ڈوپٹہ پھیکا پڑا ہم نے رنگنے کو دیا
کوئی رنگا کے منگا دے ڈوپٹہ میرا

احسان میرے سر پہ تمھارا ہے امی جان
یہ دل تمھارے پیار کا مارا ہے امی جان
امی نے میرے واسطے شیفون لائے تھے
ابا نے میرے ضد پہ بھی کچھ کم نہیں کیے
احسان میرے سر پہ تمھارا ہے چچی جان
یہ دل تمھارے پیار کا مارا ہے چچی جان
چچی نے میرے واسطے بندیا جو لائے تھے
چچا نے میرے واسطے اس دم دعا مانگے تھے

ڈھیلا پاجامہ، ریشم کا کمر بند، بولو کہاں گئے تھے
جب میں نے دیکھا، گوشت کی دکان پر
ہاتھوں میں نلی، نلی میں گودا بند، بولو کہاں گئے تھے

آج رنگیلی گھر رنگ ہے، جی رنگ ہے
تم نہ سمجھو، ہم بھو کے آئے،
لکھنؤ کا بھٹیاری میرے سنگ ہے
جی سنگ ہے
آج سہیلی گھر رنگ ہے، جی رنگ ہے
تم نہ سمجھو، ہم پیدل آئے، کمشنر کی موٹر میرے سنگ ہے
جی سنگ ہے

شادی بیاہ کے ایسے سیکڑوں گیت کوکن کے اردو لوک گیتوں میں مروج ہیں جن کا پیرایۂ اظہار دل کش، اسلوبِ بیان خوبصورت اور غنائیت سے پر کیف ہوتے ہیں۔ پھر ڈھولک کی تھاپوں کا زیر و بم، جوان دلوں کی آرزوؤں و امنگوں کی سریلی رس بھری آوازیں، ایک مسحور کن ماحول پیدا کر دیتی ہیں۔ ڈھولک کے گیتوں میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ خاص کر سمدھنوں کا ایک دوسرے پر حملہ کرنا، مصرعوں مصرعوں میں طعنہ دینا، سالیوں اور بہنوئیوں کے مذاق و دل لگی کی باتیں اور بہت ساری دلچسپیاں مختلف تشبیہات و استعارات کے سہارے بیان کی جاتی ہیں۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے کوکن کے دیہی علاقوں میں رات گئے تک صبح سویرے سکوت اور سناٹے کے عالم میں آبادیوں کے مختلف خاموش گوشوں سے چکی پیسنے کی مخصوص و مستقل آوازوں کے ساتھ جفاکش عورتوں کے میٹھے میٹھے بول بھی سنائی دیتے تھے۔ یہ میٹھے میٹھے بول جو گیت کی صورت میں ان محنتی عورتوں کی زبان سے نکلتے تھے انھیں چکی کے گیت کہا جاتا تھا۔ لیکن شاید ہی اب کسی گاؤں میں چکی کے گیت گائے جاتے ہوں کیونکہ سائنسی ترقیات کے اس ہوش ربا دور میں کوکن کے ہر گاؤں اور ہر شہر میں مشینی چکیاں لگا دی گئیں جن میں آٹا پیسنے اور دھان صاف کرنے کا کام ہوتا ہے۔ مگر ایسا دیکھا گیا ہے کہ آج بھی کوکن کی بڑی بوڑھیوں کے سینوں میں چکی کے گیت محفوظ ہیں اور ان گیتوں کو سننے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ کوکن کی عورتیں کتنی محنت و مشقت کیا کرتی تھیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ چکی کے ان گیتوں کو اُن بڑی بوڑھیوں کے سینوں سے نکال کر صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ترقی یافتہ دور میں مختلف رنگوں اور مزاجوں کے چکی نامے یا چکی کے گیت اسلافِ عہدِ رفتہ کی یادگار بن کر رہ جائیں۔

ڈھولک کے گیتوں اور چکی ناموں کے بعد کوکن کے اردو لوک گیتوں کی ایک قابلِ ذکر صنفِ سخن لوریوں پر مشتمل ہے۔ ان کا بنیادی موضوع محدود ہونے کی وجہ سے ان میں دیگر لوک گیتوں کا سا تنوع اور تعدد نہیں پایا جاتا اور اس وجہ سے ان کی بازیافت بھی نسبتاً کم ہی رہی ہے۔ ان کے اظہارِ بیان کا موضوع بچپن اور نیند ہی ہوتا ہے۔ یہ ممتا کے گہرے سمندر اور میٹھے سروں کی دھیمی لہروں پہ ڈولنے والے سپنوں کے سفینوں کے لیے مخصوص ہیں۔ فی الحال کوکن میں مروجہ لوریوں کے چند ٹکڑوں کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

جھو جھو آؤ میرے پاس تو موتیوں کی راس
جھو جھو
جھو جھو چاندی کی کپی تو واری جائے گی پھوپھی
جھو جھو
جھو جھو ریشم کا ماچا تو واری جائیں گے چاچا
جھو جھو
نیند آئی رے تانے نیند کے کرتے بہانے

آلو لَو لُو آئی ماں، آلو لَو لُو آئی ماں
پیلے پیلے دھوپاں پیپل کے جھاڑاں پر
پیپل پان ڈالیں گے جمال بالاں پر

آلو لَو لُو آئی ماں، آلو لَو لُو آئی ماں
گہوارے میں تانا، گھر دستا نورانہ
اللہ کی درگاہ میں بھیجوں گی شکرانہ

کوکن کے گاؤں میں رہنے والی بعض خواتین اور خاص طور سے اپنی دادی اور امی کی زبانی میں نے چند ایسی لوریاں اور جھولے کے گیت سنے ہیں جن میں بڑی ادبیت موجود ہے۔ یہ مثالیں دیکھیے:

جھولو رے تانے، گن کے سیانے
شیر مہر کے ماں کے دیوانے
واروں تیرے پر، موتیوں کے دانے
گلے رکھوں اور ہیرے سرہانے
جھولو رے تانے، لاڈلے جھولو
اپنے خدا کو ہرگز نہ بھولو
او ترا زمیں پر تختِ سلیماں
نغمہ سرا ہیں زہرہ جبیناں
جلوہ نما ہے ماہِ درخشاں
پھونکو جی پڑھ پڑھ کے سورۂ رحماں
آؤ سہاگن جھولا جھلائے
نورِ نظر کو اپنے منائے

ان لوریوں میں ماں کی محبت، آرزوؤں وارمانوں کی چھٹکی چاندنی اور اس کے خوابوں کی رنگین بہاریں نظر آتی ہیں۔ بعض ایسی لوریاں بھی ملتی ہیں جو لوری کے بنیادی موضوع سے ہٹ کر کہی گئی ہیں۔ اسی طرح کوکن کے اردو لوک گیتوں کی اور بھی بہت سی قسمیں ہیں جیسے زچہ گیریاں، بسم اللہ خوانی، عقیقہ، ہدیہ، بچوں کے کھیل کود، منگنی کے گیت، چوک بھرائی، ہلدی کے گیت، دلہن سنوارتے وقت کے گیت، چوڑیاں پہناتے وقت کے گیت، سہرے، مبارکبادیاں، جلوہ اور رخصتی وغیرہ۔

کوکن کے اردو لوک گیتوں کو سننے اور پڑھنے کے بعد یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان میں وہ چستی یا وہ موزونیت نہیں ہے جو اردو شاعری کی جان سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ان کی تخلیق کسی اصول یا نظریے کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ مختلف حالات کی وجہ سے پیش آنے والے غم و خوشی کے جذبات کی صرف ترجمانی کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جب غم اور خوشی کے جذبات امڈتے ہیں تو لوک گیت جنم لیتے ہیں۔ یہ غیر شعوری طور پر خواتین کے ذہنوں میں پیدا ہوکر ان ہی کی یادداشت اور زبان میں محفوظ ہوجاتے ہیں۔ اسی لیے ان میں عام طور پر وزن یا بحر کی کوئی قید نہیں ہے۔ گیت گاتے وقت جو حالت یا کیفیت ہوتی ہے یہ اسی کے مطابق ڈھل جاتے ہیں۔ ان

ایک لوک گیت میں پیش کیے گئے انسانی جذبات دوسری قوموں یا دوسرے علاقوں کے لوک گیتوں میں بھی ہوتے ہیں کیونکہ بنیادی طور پر یہ گیت انسانی تہذیب اور تجربوں کی بڑھتی ہوئی سطح سے نکلے ہوئے ہیں۔ ان گیتوں کی تہذیبی شناخت انسان سے انسان اور تہذیب سے تہذیب تک کا سفر کرتی ہے۔ انسان آگے بڑھنے کے لیے سماج کا سہارا لیتا ہے۔ جب سماج میں کوئی نئی چیز ایجاد ہوتی ہے تو اس کا اثر تہذیب پر پڑتا ہے اور اس سے لوک گیت بھی متاثر ہوتے ہیں۔ سماجی اور تہذیبی زندگی کے بدلتے ہوئے رجحان سے کوکن کے اردو گیت میں بھی مختلف تبدیلیاں در آئی ہیں۔

میں استعمال ہونے والی تشبیہات عام فہم اور سیدھی سادی ہوتی ہیں جو ان گیتوں کو شاعرانہ حسن سے آراستہ کرتی ہیں۔ گلوکارہ اپنے گلے کو کھینچ تان کر ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ سروں کو پورا کرتی ہے جس سے اس کا ترنم ایک خاص کیفیت طاری کردیتا ہے۔ دراصل کوکن کے اردو لوک گیتوں کا خاص مقصد تفریح طبع ہے لیکن ان میں چھیڑ چھاڑ کے ساتھ ہنسی ہنسی میں نصیحتیں بھی ہوتی ہیں۔ خود نمائی، تکلف اور تصنع کا ان گیتوں میں کوئی گزر نہیں ہوتا۔

ان گیتوں کی کوئی تاریخ نہیں ملتی کہ کون سا گیت کب لکھا گیا ہے اور نہ ہی کوئی حوالہ ملتا ہے۔ ان کا سفر انسانی زندگی کی طرح جاری وساری ہے۔ ایک لوک گیت میں پیش کیے گئے انسانی جذبات دوسری قوموں یا دوسرے علاقوں کے لوک گیتوں میں بھی ہوتے ہیں کیونکہ بنیادی طور پر یہ گیت انسانی تہذیب اور تجربوں کی بڑھتی ہوئی سطح سے نکلے ہوئے ہیں۔ ان گیتوں کی تہذیبی شناخت انسان سے انسان اور تہذیب سے تہذیب تک کا سفر کرتی ہے۔ انسان آگے بڑھنے کے لیے سماج کا سہارا لیتا ہے۔ جب سماج میں کوئی نئی چیز ایجاد ہوتی ہے تو اس کا اثر تہذیب پر پڑتا ہے اور اس سے لوک گیت بھی متاثر ہوتے ہیں۔ سماجی اور تہذیبی زندگی کے بدلتے ہوئے رجحان سے کوکن کے اردو گیت میں بھی مختلف تبدیلیاں در آئی ہیں۔ چونکہ یہ ایک نسل کو اپنی پیشتر نسل سے ورثے میں ملتے ہیں اسی لیے اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

آج بھی کوکن کے گاؤں اور دیہاتوں میں دھوم دھام سے رسومات کی پابندی اور تقریبات کے انعقاد کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ شہروں میں جاکر آباد ہونے والے اکثر اہلِ کوکن اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں یا بلڈنگ کی ٹیرس پر یا کمپاؤنڈ میں بنے ہوئے منڈپ میں تمام رسوم پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور مسرت آمیز گیتوں سے تقریب کی رونق دوبالا کردیتے ہیں۔ لیکن ملک کی معاشی ومعاشرتی اور علمی وادبی ترقیات کے ساتھ ہمارے تہذیب وتمدن کے دھاروں کی رفتار و روش میں بھی زبردست تبدیلیاں پیدا ہورہی ہیں۔ شہری اور دیہی زندگی کے ہر شعبۂ حیات میں انقلابی تغیرات ظہور پذیر ہورہے ہیں۔ اشاعت، صحافت کی ترقی، ٹیلی ویژن، اسمارٹ فون، ٹیب وموبائل، انٹرنیٹ، فیس بک اور واٹس ایپ جیسی نت نئی ایجادات اور ہماری تہذیبی ومعاشرتی زندگی کے مختلف رسوم ورواجوں اور تفریحات پر بھی فلمی گیتوں اور نئے نئے ذرائع ابلاغ وترسیل کے اثرات سے کوکن کے اردو لوک گیتوں کا سلسلہ بھی متاثر ہورہا ہے۔ تعجب نہیں کہ مزید چالیس پچاس برسوں میں ان کے سرچشمے پوری طرح خشک ہی ہوجائیں۔ اس لیے جیسے بھی، جہاں کہیں بھی اور جس قدر بھی لوک گیتوں کا یہ گراں بہا سرمایہ مل جائے اسے محفوظ کرلیا جانا ضروری ہے۔ ورنہ اردو زبان وادب اور اس کی لسانی وتہذیبی تاریخ کو ایک اہم بنیادی کڑی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوجانا پڑے گا۔

کتابیات:

1. مہاراشٹر کی تہذیبی وادبی قدریں، بدیع الزماں خاور، نقشِ کوکن پبلی کیشنز ٹرسٹ، ممبئی 1982
2. کوکن میں اردو تعلیم (حصہ اول)، ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی 1996
3. کوکن میں اردو تعلیم (حصہ دوم)، ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی 1999
4. کوکن اور ممبئی کے لوک گیت، ڈاکٹر میمونہ دلوی، پرنٹ اینڈ آرٹ کنسلٹنسی، ممبئی 2001
5. اردو میں لوک گیت، مرتبہ پروفیسر قمر رئیس، کتابی دنیا، نئی دہلی 2003

Mohd Danish Gani Dept. of Urdu, Gogate Jogalekar College, Ratnagiri - 415612 (M.S)
Mob.:9372760471

صحت

باہر کے کھانوں سے بچیے

شمس الاسلام فاروقی

ہوٹل بازی ایک ایسی لت ہے جس میں اکثر و بیشتر لوگ مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ یہ عادت صرف اُن ہی لوگوں میں زیادہ پائی جاتی ہے جن کے گھروں میں اچھا اور مزیدار کھانا نہیں پکتا۔ بلکہ اس لت میں وہ لوگ بھی مبتلا ہوجاتے ہیں جن کے گھر لذیذ کھانوں کے لیے مشہور ہوتے ہیں۔ باہر کے کھانے کے بارے میں اگر سوال پوچھا جائے تو عموماً لوگ یہی جواب دیتے ہیں کہ بھئی جو مزا فلاں جگہ کے کھانے میں ہے وہ بھلا گھر کے کھانے میں کہاں! یقین نہ آئے تو کوئی مخصوص کھانا گھر میں تیار کراکے دیکھ لیجیے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ گھر کی خاتون کا دور دور شہرہ ہے، کھانے والوں سے یہ جواب ملے گا کہ بھائی اچھا ہے مگر فلاں ہوٹل والی بات کہاں، وہ تو بس وہیں ملتی ہے۔ انتہائی حیران کن بات تو یہ ہے کہ اگر آپ کسی مخصوص ریسٹورینٹ یا ہوٹل کی کسی مخصوص اپنی پسندیدترین ڈش کو پکانے کی صحیح صحیح ترکیب بھی معلوم کرلیں اور پھر اُسی کے مطابق گھر میں اس ڈش کو تیار کرائیں تب بھی آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ان کوششوں کے باوجود آپ کے گھر میں ہوٹل والی بات پیدا نہ ہوسکی۔ دراصل بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ذائقے کا یہ کمال کیمیکل کا ہے جسے مونوسوڈیم گلیوٹامیٹ کہتے ہیں جس کا مخفف ایم ایس جی (MSG) ہے کیونکہ آپ کا باورچی خانہ ایم ایس جی سے محروم ہے اسی لیے آپ کے گھر کے کھانے میں ہوٹل جیسا مزا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

ایک جاپانی بائیوکیمسٹ کے اِکیڈا نے 1908 کے دوران جاپان کی امپریل یونیورسٹی میں ایک سمندری گھاس سے پہلی بار گلیوٹامک ایسڈ کشید کیا جو باوجود اس حقیقت کے کہ اس کا کوئی مخصوص مزا نہیں تھا، ایک ذائقہ بخش شے تصور کی گئی۔ بعد میں جب اس ایسڈ کا سوڈیم، پوٹاشیم اور کیلشیم جیسی اشیا سے تعامل کرایا گیا تو مختلف قسم کے نمکیات حاصل ہوئے۔ ان سب میں سوڈیم گلیوٹامیٹ (Soduim glutamate) سب سے زیادہ آسانی سے حل ہوجانے والا نمک تھا۔ اس کا ذائقہ سب سے منفرد تھا جسے سائنسی طریقے سے بیان کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ ذائقہ نہ تو میٹھا تھا نہ نمکین اور نہ ہی اُسے کھٹا یا کڑوا کہا جاسکتا تھا۔ اس عجیب وغریب ذائقے کو اومامی ذائقے کا نام دیا گیا۔ اس نمک کو کشید کرنے والے سائنسداں اِکیڈا نے اس کا سائنسی نام مونوسوڈیم گلیوٹامیٹ (Monosoduim glutamate) اور اُسے پیٹینٹ کرالیا۔ صنعتی طور پر اس نمک کی تیاری 1910 میں شروع اور غذاؤں میں شامل کرنے پر اس کی تاثیر دیکھتے ہوئے عام زبان میں اسے اجنیوموٹو کہہ کر پکارا گیا جس کے معنی ہیں 'ذائقے کا جوہر'۔

مونوسوڈیم گلیوٹامیٹ یا ایم ایس جی ایک سفید رنگ کا پاؤڈر ہے جو نہ تو کھانے کو زیادہ عرصے تک خراب ہونے سے بچانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہی اس میں خود کسی قسم کے تغذیات موجود ہوتے ہیں یہاں تک کہ اس کا اپنا کوئی مزا بھی نہیں ہوتا۔ البتہ یہ جس کھانے میں ملا دیا جائے اُسے کھانے والے کے دماغ پر اثر انداز ہوکر یہ محسوس کرانے کی خاصیت ضرور رکھتا ہے کہ جو کھانا وہ کھا رہا ہے وہ بے حد ذائقے دار ہے۔ چائنیز کھانوں یا مختلف مشروبات میں تو اس کی آمیزش لازماً ہوتی ہے مگر بہت سے کھانوں جن میں اب دیسی کھانے بھی شامل ہونے لگے ہیں، اس کی آمیزش عام ہوتی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ جنوب کے بعض ہوٹلوں میں تو اسے سانبھر جیسی ڈش میں بھی ملایا جارہا ہے۔ ایم ایس جی کی کھانوں میں شمولیت محض عادتاً، کم علمی یا پھر لالچ کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے۔ بعض ہوٹل والے اپنی مخصوص ڈشز میں اسے ملا کر آپ کو اپنا مستقل گاہک بنا لیتے ہیں۔ آپ اُن ڈشز کے اتنے متوالے ہوجاتے ہیں کہ کسی دوسری جگہ جانا پسند ہی نہیں کرتے اور بار بار بس کسی شرابی کی طرح اسی ہوٹل کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔

ایم ایس جی جسے خاموش قاتل بھی کہا جاتا ہے وہ ایک سفید رنگ کا باریک سفوف ہوتا ہے جو دیکھنے میں نمک جیسا لگتا ہے۔ اعصاب سے جڑے سائنس داں اسے ایکسی ٹوکسن (excitoxine) یا نیوروٹاکسن (Neurotoxine) کا نام دیتے ہیں کیونکہ یہ جب کھانے کے ساتھ منہ اور گلے سے گزرتے وقت وہاں موجود باریک جھلیوں سے جذب ہوکر خون میں شامل ہونے کے بعد دماغ کے عصبی خلیوں میں پہنچتا ہے تو انھیں اس حد

تک متحرک اور ہیجان انگیز کردیتا ہے کہ وہ تھک کر چور ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں موجود تمام تر توانائی زائل ہونے لگتی ہے اور بالآخر وہ مردہ ہونے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کیفیت بے حد ہلاکت خیز ہوتی ہے۔

امریکہ کے ایک بااختیار ادارے کی رپورٹ کے بموجب ایم ایس جی کے استعمال سے لوگوں کی ایک خاطرخواہ تعداد متاثر ہوسکتی ہے اور ان میں حسب ذیل علامات پیدا ہوجاتی ہیں:

- دل کے دھڑکنے کی رفتار میں اضافہ ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی سانسیں چھوٹی اور مختصر ہوجاتی ہیں۔
- دمے کے حملے میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔
- لوگوں میں غیر معمولی طور پر غنودگی کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔
- پسینے کی زیادتی اور کمزوری میں اضافہ ہوجاتا ہے۔
- گھبراہٹ اور خوف زدہ ہونے کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔
- غصے پر قابو نہیں رہتا۔
- پیٹ میں مروڑ کا درد ہوتا ہے۔
- طبیعت میں ناگواری کا احساس بڑھتا ہے۔
- سینے میں درد محسوس ہوتا ہے۔
- جگر میں سوزش پیدا ہوجاتی ہے۔
- طبیعت میں سستی رہنے لگتی ہے۔
- نیند نہ آنے کی شکایت پیدا ہوجاتی ہے۔
- وزن میں اضافہ ہوجاتا ہے اور آدمی مٹاپے کا شکار ہوجاتا ہے۔
- اعصابی بیماریاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔
- جلن میں اضافہ ہوتا ہے اور پیٹھ اور گردن کے پچھلے حصے میں بے حسی لگتی ہے۔
- چہرے، کنپٹی، پیٹھ کے اوپری حصے، گردن اور بازوؤں میں سنسناہٹ کے ساتھ گرمائش کا احساس ہوتا ہے۔
- چہرے پر دباؤ اور سختی کا احساس ہونے لگتا ہے۔
- سر میں مسلسل درد یا آدھا سیسی درد رہتا ہے۔

ایم ایس جی کے استعمال سے بالخصوص بچوں میں ڈسلیکسیا (Dyslexia) کا عارضہ پیدا ہوجاتا ہے جس میں الفاظ کو درستگی کے ساتھ سیکھنے، لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے۔اس کے علاوہ اوٹزم (Autism) کی کیفیت بھی پیدا ہوجاتی ہے جس میں مبتلا شخص اپنے آپ ہی میں مگن رہتا ہے اور بیرونی دنیا سے اپنا رابطہ منقطع کرلیتا ہے۔ ایک اور نفسیاتی عارضہ شیزوفرینیا (Shizophrenia) بھی پیدا ہوتا ہے جسے اردو میں انشقاق نفسی کہتے ہیں۔اس کی وجہ سے لوگوں میں ذہنی پراگندگی پیدا ہوجاتی ہے اور ایک شخص کے خیالات، جذبات اور افعال میں ہم آہنگی قائم نہیں رہتی۔ ایسے مریضوں میں وہم، وسوسے اور سماجی علیحدگی جیسی کیفیات پیدا ہوجاتی ہیں۔ان لوگوں کا برتاؤ پرتشدد ہوجاتا ہے، ان پر گھبراہٹ اور خوف کے حملے ہوتے ہیں اور طبیعت پر بے حد پژمردگی طاری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ان پر دماغی فالج کا حملہ تک ہوسکتا ہے۔ایم ایس جی کے استعمال سے حمل کے ابتدائی ادوار میں بعض جینی خرابیاں جنین ہی میں پیدا ہوجاتی ہیں جن کے زیراثر بچوں کی دماغی نشو ونما متاثر ہوتی ہے اور ان میں اوپر بیان کی گئی بیماریاں جیسے ڈسلیکسیا، اوٹزم اور

شیزوفرینیا پیدا ہوجاتی ہیں۔

باہر کی اشیا بالخصوص پیکٹ بند چپس وغیرہ کے ذریعے بچوں میں ایم ایس جی مہلک اثرات پیدا کرتا ہے اور ان میں جذباتی بگاڑ، نشو ونما میں رکاوٹ، ذہنی صلاحیتوں میں کمی، طبیعت میں بے چینی اور غیر معمولی چلبلاپن پیدا ہونا بہت عام ہوتا جارہا ہے۔

بے شمار قسم کی ڈبہ بند غذائی اشیا جیسے ادرک، لہسن کا پیکٹ، سالن میں ڈالنے والے مسالوں کا پیسٹ، مرچ کا ساس، اچار مربے، مختلف قسم کے سوپس، ٹماٹر ساس، چپس، گریکرس وغیرہ میں ایم ایس جی کا خوب استعمال کیا جاتا ہے جن سے بچنا چاہیے۔

لوگ خاص طور بچوں کے دماغی خلیوں پر ایم ایس جی کے بہت مضر اثرات ہوتے ہیں جن کے زیراثر ان میں جذباتی قسم کی خرابیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ان کی عام نشو ونما پر برا اثر پڑتا ہے اور ذہنی صلاحیتیں انحطاط کا شکار ہوجاتی ہیں جن کی وجہ سے بچے پڑھنے، لکھنے اور کچھ سیکھنے میں بہت کمزور رہ جاتے ہیں۔

مونوسوڈیم گلیوٹامیٹ کا استعمال ذیابیطس کے مریضوں کے لیے خاص طور پر بے حد خطرناک ثابت ہوتا ہے۔خون اور دماغی رکاوٹوں کو پار کرتا ہوا یہ کیمیکل دماغ کے عصبی خلیوں کو تباہ کردیتا ہے جس کے باعث مریض میں انتہائی افسردگی کی کیفیت، پاگل پن کے دورے، فالج کے حملے یا پھر طبیعت میں جھنجھلاہٹ اور بے قابو غصہ پیدا ہوسکتا ہے۔

اس مہلک کیمیکل کے دوسرے اور بھی بہت سے نام ہیں جنھیں عام لوگوں کے لیے جاننا بے حد ضروری ہے تاکہ وہ حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کرسکیں۔

گلوٹامک ایسڈ، گلوٹامیٹ (ای۔ 620)
کیلشیم گلوٹامیٹ
میگنیشیئم گلوٹامیٹ
نیٹریم گلوٹامیٹ
ایس ایکسٹریکٹ
کیلشیم یا سوڈیم کیسی نیٹ
ایسٹ فوڈ، ایسٹ نیوٹری اینٹ
اوٹولائزڈ ایسٹ
جیلاٹین
ٹیکسچرڈ پروٹین
سوئے پروٹین، سوئے پروٹین کنسنٹریٹ
اجینوموٹو، ویٹس
بالسامک وینیگر۔

آپ کی صحت دراصل آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ اگر آپ باہری کھانوں کے بارے میں محتاط رہیں، ان سے نہ صرف خودکو بچائیں بلکہ اپنے بچوں کو خصوصیت کے ساتھ باہری غذاؤں جیسے پیکٹ بند مختلف قسم کے چپس اور ڈبہ بند غذاؤں سے محفوظ رکھیں تو یقیناً خودکو اور اپنے بچوں کو ایک بڑی ہلاکت خیزی سے دور رکھ سکتے ہیں۔

■

Dr. Shamsul Islam Farooqui, 90-B/1, Ahata Talib, Gai No.1, Noor Nagar, Jamia Nagar, New Delhi-110025

شمیم احمد صدیقی

آلودگی کنٹرول میں خواتین کا کردار

خالق کائنات نے اپنی اشرف ترین مخلوق یعنی انسان کو دنیا میں وجود بخشنے سے بہت پہلے اُس کی مختلف ضروریات کی کفالت کے لیے وافر مقدار میں تمام چیزیں پھیلا دی تھیں۔ مزید یہ کہ انسانوں کے استعمال کے بعد اُن چیزوں میں آئی کمی یا نقص کو دور کرنے کا بھی بڑا جامع نظام قائم کیا تھا۔ مثلاً انسان کی غذائی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سیکڑوں قسم کی سبزیاں، پھل اور اناج نیز دودھ اور گوشت دینے والے جانور پیدا کیے اور ان کی آئندہ افزائش کا انتظام بھی کیا۔ پانی انسانی زندگی کی بقا کے لیے لازمی شے ہے۔ چنانچہ خالقِ ارض وسما نے کرۂ ارض کے 71% فی صد حصے پر پانی پھیلا رکھا ہے جس کا ایک بڑا حصّہ نمکین بنا کر سمندر اور جھیلوں کی شکل میں محفوظ کر دیا جس کو آسانی سے استعمال میں لا کر ضائع نہیں کیا جا سکتا نیز خاصا حصّہ گلیشیر اور زیر زمین صاف ستھرے پانی کی شکل میں، جو پینے کے لیے اور نہانے دھونے کے لیے استعمال میں آتا ہے، محفوظ کر دیا۔ اتنا ہی نہیں استعمال شدہ پانی کو دوبارہ قابلِ استعمال بنانے نیز سمندر اور جھیلوں کے کھاری پانی کو قابلِ استعمال بنانے کے لیے بادلوں اور بارش کا نظام بھی قائم کیا۔ سواری اور بار برداری کے لیے نیز زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے لیے مختلف قسم کے چوپائے، ہاتھی، اونٹ، گھوڑا، بیل، خچر وغیرہ مہیا کیے۔ انسان اور اس کے خادم جانوروں کے سانس لینے کے لیے آکسیجن شامل کی ہوئی ہوا کو تمام عالم میں پھیلا دیا اور سانس لینے کے بعد خارج ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ کو دوبارہ آکسیجن میں تبدیل کرنے کے لیے بے شمار قدرتی فیکٹریوں کو پیڑ پودوں کی شکل میں پیدا کیا۔ ہمارے گرد و پیش کی یہ تمام چیزیں جب تک فطری انداز میں رہیں تمام دنیا کا نظام معمول کے مطابق یعنی چُست اور دُرست رہا اور انسان اپنی ضروریات کو بخوبی پورا کرتا رہا۔ لیکن سائنس وٹکنالاجی کے فروغ کے ذریعے جو نئی نئی ایجادات ہوئیں انھوں نے انسانی فکر اور طرز حیات پر ایسے منفی اثرات مرتب کیے کہ انسان نے محنت اور جفاکشی سے جی چرانا شروع کر دیا۔ سہولت پسندی وعیش پرستی اور بناوٹی ونمائشی چیزوں کی طمع نے قدرت کے نظام میں دخل اندازی پر ابھارا جس کے نتیجے میں پورا ماحول متاثر ہوا اور پانی، ہوا اور مٹی جن پر تمام جانداروں کی زندگی کا انحصار ہے، پراگندگی کا شکار ہوتی گئیں۔ ظاہر ہے کہ جب ان ضروری اشیا میں بگاڑ پیدا ہوا جن پر زندگی کا دارومدار ہے

تو بشمول انسان تمام جانداروں کی صحت متاثر ہوئی اور نازک جانداروں کا وجود ہی دنیا سے ختم ہونے لگا۔ چنانچہ گزشتہ چند دہائیوں میں سیکڑوں نباتات اور نازک قسم کے حیوانات دنیا سے نا پید ہو گئے ہیں۔ فی الوقت اس کائنات کی اشرف ترین مخلوق یعنی حضرتِ انسان اس قدر پریشانیوں کا شکار ہے کہ بہت سی جگہوں پر اس کو پینے کے لیے صاف ستھرا پانی بھی بمشکل دستیاب ہو پاتا ہے اور اس کو قیمتاً خریدنا پڑ رہا ہے۔

ہم اپنے اصل موضوع پر آنے سے قبل اُن عوامل کا مختصر جائزہ پیش کر رہے ہیں جن کی بنا پر انسان نے اس کرۂ ارض پر اپنی زندگی کو اجیرن بنا کر رکھ دیا۔ جب تک انسانوں کی بیشتر تعداد گاؤں دیہات کے کچے مکانات میں رہتی تھی جن کی چھت بنانے کے لیے قدرت کے مہیا کردہ بانس، بلّی اور پھوس وغیرہ ہی درکار تھے، اُس وقت تک پختہ تعمیرات میں استعمال ہونے والے لوہے اور سیمنٹ کو فراہم کرانے کے لیے ان اشیا کے کارخانے قائم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح جب تک انسان کنواں بنا کر ڈول اور رسّی سے پانی کو نیچے سے اوپر لا کر استعمال کرتا تھا اس وقت تک نہ تو اس کو ہینڈ پمپ تیار کرنے کے لیے اور نہ ہی ٹیوب ویل کا موٹر بنانے کے لیے کسی کارخانے کو وجود میں لانے کی ضرورت تھی۔ جب تک انسان اپنی سواری اور بار برداری کے لیے قدرتی سواریوں یعنی جانوروں کو استعمال میں لاتا رہا اس وقت تک اس کو سائیکل، موٹر سائیکل اور کار یا بس بنانے کے لیے کسی کارخانے کی بنیاد ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔ جب تک انسان نے قدرت کی مہیا کی ہوئی کپاس اور بھیڑ کی اون سے تیار کیے گئے ریشے اور کپڑوں پر اکتفا کی اس وقت تک اس کو مصنوعی دھاگے اور اون تیار کرنے کے لیے کسی کارخانہ لگانے کے لیے زمین گھیرنے کی ضرورت نہ تھی۔ جب تک ہماری عورتوں نے قدرت کے بنائے ہوئے رنگوں ہلدی، رتن جوت، زعفران وغیرہ سے اپنے کھانوں کو دلکش اور دیدہ زیب بنانے پر اکتفا کی تھی اور اپنی آرائش و زیبائش کے لیے آنولہ، شکاکائی، ملتانی مٹی بیسن، مہندی، لیمو، عرقِ گلاب اور بالچھڑ جیسی قدرتی چیزوں پر اکتفا کی تھی اس وقت تک ہم کو کیمیاوی رنگ، شیمپو، نیل پالش، لپ اسٹک، ہیئر ڈائی وغیرہ کو بنانے کے لیے کوئی کارخانہ لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ جب تک ہم اپنی قابل کاشت زمینوں میں فصل اُگانے کے لیے انسان و جانوروں کے فضلات اور گھاس پھوس سے تیار کی ہوئی کھاد کو استعمال کرتے رہے اس وقت تک ہم کو کیمیاوی کھاد کے کارخانوں کو قائم کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ جب تک ہم نے سادگی اور مجاہدانہ زندگی اختیار کر رکھی تھی اس وقت تک ہم کو ریفریجریٹر اور ایر کنڈیشنر کی ضرورت نہ پیش آئی تھی اور اُن میں استعمال ہونے والی فلورو ہائیڈرو کاربن گیسوں کے رساؤ کے نتیجے میں ہماری فضا میں موجود اوزون کی پرت کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔ الغرض زندگی کو زائد سے زائد پر تعیش بنانے اور نمائشی چیزوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر نے لاتعداد کارخانوں کو وجود بخشا جن کو قائم کرنے کے لیے بہت سے جنگلوں کا صفایا کرنا پڑا اور جن سے خارج ہوئی زہریلی گیسوں اور زہریلے سیّال مادّوں نے ہوا، پانی اور مٹی سب کو آلودہ کر دیا۔ آج ہم نہ صرف صاف ستھرے پانی کی کمی کو جھیلنے پر مجبور ہیں بلکہ آلودہ ہوا میں سانس لینے اور آلودہ مٹی میں پیدا ہوئی اجناس کھانے کے لیے مجبور ہیں۔ فصلوں کو کیڑوں مکوڑوں اور جرثوموں سے بچانے کے لیے زہریلے کیمیاوی سیال کے چھڑکاؤ کی وجہ سے آج تمام اناج، سبزیاں اور پھل وغیرہ بھی آلودگی زدہ ہی دستیاب ہوتے ہیں جبکہ قدرت نے ہم کو نیم کی شکل میں لاجواب جراثیم کش اور کرم کش قدرتی ہتھیار دستیاب کرایا تھا۔ ہم نے قدرتی فیکٹریوں میں تیار ہونے والی جڑی بوٹیوں کی ادویات کے ذریعے علاج معالجہ کو ترک کر کے کیمیاوی مادوں سے تیار ایلو پیتھک دواؤں کو ترجیح دی تو ان ادویات کی تیاری کے لیے فیکٹریاں بھی قائم کرنا پڑیں نیز ایلو پیتھک دواؤں کے اندھا دُھند استعمال سے مختلف قسم کے نئے عوارض سے بھی الجھنا پڑا۔ ہوا اور پانی کی آلودگی نے نئے قسم کے وائرس، بیکٹیریا وغیرہ کو جنم دیا جن کی بنا پر ہیپا ٹائٹس بی اور سی، ایڈس، سوائن فلو، ایبولا جیسی نئی نئی خطرناک بیماریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ الغرض محنت اور جفاکشی کی زندگی کو ترک کرنے اور عیش پرستی اور نمائشی چمکدار چیزوں کو اپنانے کے غیر دانشمندانہ اقدام نے ہی انسان کی زندگی کو بے حد مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب ہر جگہ ماحولیات کو سدھارنے، آلودگی کو کنٹرول کرنے اور قدرتی وسائل کے اندھا دھند استعمال پر روک لگانے کی فکریں کی جا رہی ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ آلودگی کنٹرول یا ماحول کو سدھارنے کے کام میں خواتین کس قدر مددگار ہو سکتی ہیں اور اس کا طریقۂ کار کیا ہوگا۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ غرض کرنا ہے کہ دنیا کی مجموعی آبادی میں عورتوں کا تناسب مردوں سے قدرے زیادہ ہی ہے اور بچوں کی تعداد عورتوں سے بھی زائد ہے لہٰذا اگر ہم اپنی عورتوں کو ماحولیات کی ضروری تعلیم دے کر اُن کو پراگندگی سے بچاؤ پر آمادہ کریں اور وہ ابتداً ہی سے یہی باتیں اپنے بچوں کو ذہن نشین کرانے لگیں تو ہم اپنی آبادی کے بڑے حصّے کو ماحول سدھار کے اہم کام پر لگا سکتے ہیں۔ اس لیے ہم کو مُلکی سطح پر تعلیمی پالیسیاں مرتب کرنے والے اربابِ حل و عقد کو متوجہ کر کے کم از کم ثانوی تعلیم کے نصاب میں یعنی درجہ چھ تا دس تک کے نصاب میں ماحولیات پر مبنی تعلیم کو لازمی مضمون کے طور پر داخل کرانا ہوگا۔ اسکولی نصاب میں ماحولیات کی لازمی تعلیم کے علاوہ اُن خواتین کو بھی جو پختہ عمر کو پہنچ چکی ہیں یعنی اُن کی عمر روایتی تعلیم کی نہیں رہی، اُن کو مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعے پراگندگی سے متعلق اہم امور کی واقفیت کرا کر ماحول سدھار کے کام پر آمادہ کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنا پڑے گی تاکہ وہ خود بھی ماحول سدھار پر کمر بستہ ہوں اور اپنے بچوں کو بھی ضروری ہدایات دیتی رہیں۔ ہم بڑی عمر کی خواتین کو متوجہ کرنے کے لیے چند امور اور تجاویز ذیل میں پیش کر رہے ہیں تاکہ خواتین کو اُن کے اپنانے کی ترغیب دی جائے۔

(1) جسمانی صفائی ستھرائی، کپڑوں اور برتنوں وغیرہ کی دھلائی میں پانی کا کم سے کم استعمال کرنا۔ واشنگ مشین سے نکلے ہوئے پانی کو فرش کی دھلائی یا چھڑکاؤ کے کام

جب تک ہماری عورتوں نے قدرت کے بنائے ہوئے رنگوں ہلدی، رتن جوت، زعفران وغیرہ سے اپنے کھانوں کو دلکش اور دیدہ زیب بنانے پر اکتفا کی تھی اور اپنی آرائش و زیبائش کے لیے آنولہ، شکاکائی، ملتانی مٹی بیسن، مہندی، لیمو، عرق گلاب اور بالچھڑ جیسی قدرتی چیزوں پر اکتفاکی تھی اس وقت تک ہم کو کیمیاوی رنگ، شیمپو، نیل پالش، لپ اسٹک، ہیئر ڈائی وغیرہ کو بنانے کے لیے کوئی کارخانہ لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ جب تک ہم اپنی قابل کاشت زمینوں میں فصل اُگا نے کے لیے انسان و جانوروں کے فضلات اور گھاس پھوس سے تیار کی ہوئی کھاد کو استعمال کرتے رہے اس وقت تک ہم کو کیمیاوی کھاد کے کار خانوں کو قائم کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔

میں استعمال میں لانا۔ سبزیاں دھونے کے بعد پانی کو نالی میں بہانے کے بجائے گملوں یا کیاریوں میں ڈالنے کا اہتمام کرنا۔

(2) اگر موٹر کے ذریعے پانی کو کسی ٹنکی میں اسٹور کرنا ہے تو اس بات پر توجہ دینا کہ ٹنکی بھرتے ہی موٹر کا سوئچ فوراً آف کر دیا جائے اور پانی بہتا نہ رہے۔ اسی طرح کوئی ٹونٹی واشر خراب ہونے یا چوڑیاں مرجانے کی بنا پر ٹپک رہی ہو تو اس کو جلد سے جلد تبدیل کرنے کا اہتمام کرنا۔

(3) نیا مکان تعمیر کراتے وقت اس طرح کا صحن رکھنا کہ بارش کا پانی بہہ کر ضائع نہ ہو بلکہ زائد سے زائد پانی زمین میں جذب ہو جائے۔ مکان کی چھت کو ڈھال دار رکھ کر بارش کے پانی کو زمین کے نیچے پہنچانے کا اہتمام کرنا۔

(4) غذاؤں کو خوش رنگ بنانے اور ہولی و نوروز جیسے تیوہار منانے کے لیے کیمیاوی رنگوں کے استعمال کے بجائے قدرتی رنگوں کا استعمال کرنا مثلاً غذاؤں کو رنگین بنانے کے لیے ہلدی، رتن جوت، زعفران یا لاکھ ڈائی (Lac dye) جیسے رنگین مادوں کا استعمال اور ہولی کھیلنے کے لیے ٹیسو کے پھول کا محلول استعمال کرنا۔

(5) جسمانی آرائش و زیبائش کے لیے نیل پالش، لپ اسٹک، ہیئر ڈائی، فیشیل شیمپو جیسی چیزوں کے استعمال سے گریز کرنا۔ آنولہ، ہلدی ایلوا، شکاکائی، بیسن، لیموں، عرق گلاب، شہد، پپیتا، کھیرا، ٹماٹر، سرسوں کی کھلی وغیرہ کا زائد سے زائد استعمال کرنا۔ نیم کے پھولوں سے تیار کیا گیا کاجل آنکھوں کی زیبائش کے ساتھ امراض چشم میں بھی مفید ہوتا ہے۔

(6) جس قدر ممکن ہو ایندھن کے طور پر پتھر کے کوئلے، مٹی کے تیل اور گوبر کے اپلوں کو استعمال میں نہ لایا جائے کیونکہ ان سے خارج ہونے والا دھواں ماحول کو بیحد پراگندہ کرتا ہے۔ اگر گوبر کی خاصی مقدار دستیاب ہے تو اس کو انسانی فضلہ کے ساتھ ملا کر بایوگیس (Biogas) بنا کر روشنی پیدا کرنے اور کھانا پکانے میں استعمال کیا جائے۔ سرکار کی جانب سے کم قیمت پر بایوگیس پلانٹ مہیا کرائے جاتے ہیں۔ ایندھن کی بچت کے لیے کوشش کی جائے کہ شمسی توانائی (Solar energy) سے بجلی بنا کر اس کو استعمال میں لایا جائے۔

(7) بجلی کی بچت کے لیے نئی طرز کے ایل ای ڈی (LED) بلبوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال میں لایا جائے۔

(8) مچھروں اور دیگر کیڑے مکوڑوں کو بھگانے یا مارنے کے لئے زہریلے کیمیاوی محلول کی جگہ نیم کی پتیوں اور نمکولیوں کے جوس کو پانی میں ملا کر چھڑکاؤ کیا جائے۔

(9) لیپ ٹاپ، موبائل فون اور ٹی وی جیسے الکٹرانک آلات کا استعمال کم سے کم اور انتہائی ضرورت کے وقت ہی کیا جائے کیونکہ اُن آلات سے نکلنے والی برقی مقناطیسی لہریں (electro magnetic rays) دماغ، آنکھ اور اعضائے رئیسہ کے لیے انتہائی مضر ہوتی ہیں۔

(10) پلاسٹک کے کیری بیگ، کپ، پلیٹ، گلاس وغیرہ کے استعمال سے انتہائی گریز کیا جائے۔ ان کی تیاری میں جو کیمیکل مادّے استعمال ہوتے ہیں وہ ان اشیا کے ساتھ تھوڑے بہت لگے رہ جاتے ہیں اور اُن میں رکھی گئی اشیائے خوردنی میں شامل ہو کر ہمارے جسمانی نظام کو بیحد متاثر کرتے ہیں۔

(11) اگر گھر میں تھوڑی سی بھی کچی زمین دستیاب ہے تو نیم کا درخت لگانے کا اہتمام کیا جائے ورنہ گملوں میں ایلوا، تلسی، جرام کش، پودینہ، سدا بہار یا دیگر دوائی پودوں کو اگانے کا اہتمام کیا جائے۔ ان کی دوائی افادیت سے واقفیت حاصل کر کے بوقت ضرورت استعمال میں لائیں۔ ایلوپیتھک دوائیں صرف ناگزیر (Emergency) حالات میں ہی استعمال کی جائیں۔

(12) قصبات اور دیہات کے مکانات عموماً بڑے ہوتے ہیں اور اُن میں صحن بھی خاصے بڑے ہوتے ہیں۔ ایسے مکانات میں بکری، مرغی، بطخ پالنے کا اہتمام کیا جائے تاکہ ضرورت کے وقت تازہ دودھ اور صاف ستھرا گوشت اور انڈا دستیاب ہو سکے۔

(13) صحن کا کچھ حصہ کچا ہو تو اس میں دو تین گڑھے کھود لیے جائیں۔ کسی ایک گڑھے میں روزمرّہ اکٹھا ہوئے جانوروں کے فضلات، استعمال شدہ چائے کی پتی، سبزیوں کے چھلکے اور پتے وغیرہ ڈالے جائیں اور اوپر سے تھوڑی مٹی ڈالی جائے۔ ایک گڑھا بھر جانے کے بعد یہی عمل دوسرے گڑھے میں کیا جائے۔ چھ ماہ بعد پہلے گڑھے میں تیار ہو چکی کھاد کو گملوں اور کیاریوں میں استعمال کیا جائے۔

(14) تیوہار اور شادی بیاہ کے موقعوں پر آتش بازی اور پٹاخوں وغیرہ کے استعمال سے بچا جائے۔ یہ ہوا کو بے حد پراگندہ کرتے ہیں اور صوتی آلودگی کا بھی سبب بنتے ہیں۔ آتش بازی کے ساز و سامان کبھی کبھار آگ لگنے کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔

(15) پہننے، اوڑھنے اور بچھانے کے لیے سوتی کپڑوں کو ہی زیادہ سے زیادہ استعمال میں لایا جائے۔ کھادی کے استعمال کو فروغ دیا جائے۔

(16) ایک دو کلومیٹر فاصلہ طے کرنے کے لیے پیدل چلنا ہی بہتر ہے۔ جو لوگ پیدل چلنے کے عادی ہوتے ہیں وہ بڑھاپے میں بھی صحت مند رہتے ہیں۔ اسکوٹر اور موٹر کی سواری کم فاصلوں کے لیے استعمال نہ کی جائے۔ ایندھن کا استعمال کم ہوگا تو فضائی آلودگی بھی کم ہوگی۔

ہم کو یقین ہے کہ اگر مندرجہ بالا باتوں کو احسن طریقے سے گھریلو عورتوں کو سمجھایا جائے اور وہ ان پر خود عمل کرنے کے ساتھ اپنی اولادوں کو بھی اپنے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب دیتی رہیں تو اُن کے ذریعے ماحول کی پراگندگی کو بڑی حد تک کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

■

Dr. Shamim Ahmad Siddiqui , C-2, Naseem Manzil, Madh Ganj, Police Chowki Seetapur Road, Lucknow - 226020 (UP)

ایک عظیم فلم ساز وہدایت کار

رشی کیش مکھرجی

انیس امروہوی

بنگال کی راجدھانی کلکتہ کے ایک متوسط خاندان میں 30 ستمبر 1922 کو رشی کیش مکرجی کا جنم ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے رشی کیش مکرجی نے سائنس بایولوجی کے مضامین کے ساتھ گریجویشن کیا اور لڑکیوں کے ایک اسکول میں ٹیچر ہو گئے۔ اُن کے دادا کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اُن کا خیال تھا کہ لڑکیوں کی قربت سے رشی کیش بگڑ جائے گا اور اس کا مستقبل ختم ہو جائے گا۔

لہٰذا داداجی کا حکم مانتے ہوئے انھوں نے ملازمت ترک کر دی اور وہ فری لانس جرنلسٹ کے طور پر آل انڈیا ریڈیو کے لیے لکھنے کا کام کرنے لگے۔ اُدھر داداجی بھی اُن کے لیے زور شور سے ملازمت کی تلاش کر رہے تھے۔ چھ ماہ کے بعد ہی انہوں نے کلکتہ کے 'نیو تھیٹر' میں رشی کیش کے لیے ملازمت تلاش کر لی اور ایسے وقت میں جب فلموں سے وابستگی کو معیوب سمجھا جاتا تھا خود اُن کے داداجی نے رشی کیش سے اسکول کی باعزت ملازمت چھڑوا کر فلم اسٹوڈیو کی لیب میں ملازم کروا دیا۔

یکم اپریل 1945 کو رشی کیش مکرجی نیو تھیٹر میں لیب اسسٹنٹ بنے اور فلمی دُنیا کا اُن کا پچاس سال کا لمبا سفر شروع ہو گیا۔ نیو تھیٹر کے لیب اسسٹنٹ کے بطور ساٹھ روپے ماہوار کی ملازمت کے ساتھ فلم ایڈیٹر بی این سرکار کے ساتھ انھوں نے ایڈیٹنگ کا کام بھی سیکھا اور دو برس بعد ہی 1947 میں اُنھیں آزادانہ طور پر ایک بنگالی فلم تتھاپی (Tathapi) کی ایڈیٹنگ کا موقع ملا اور وہ مقبول ہدایتکار بمل رائے کے معاون اور اُن کی فلموں کے مستقل ایڈیٹر بن گئے۔ 1951 میں جب بمل رائے کلکتہ سے بمبئی آئے تو رشی کیش مکرجی بھی بمبئی آ گئے۔ یہاں سب سے پہلے بمبئی ٹاکیز کی فلم 'ماں' بمل رائے کو ملی اور اُس کی ایڈیٹنگ رشی کیش مکرجی نے کی۔ اس کے بعد فلم 'دو بیگھہ زمین' کی اسکرپٹ انھوں نے لکھی۔ اس فلم کی تکمیل کے دوران وہ ہدایتکار بمل رائے کے چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی تھے اور فلم کے ایڈیٹر بھی۔ اسی دوران وہ بمل رائے کے ساتھ ایک فلمی تقریب میں سوویت یونین بھی گئے۔ اس کے بعد فلم 'مدھومتی' تک بمل رائے کی تمام فلموں کی ایڈیٹنگ رشی کیش مکرجی نے ہی کی۔ خود بمل رائے بھی کیمرہ مین سے ہدایتکار بنے تھے اور رشی کیش مکرجی لیب اسسٹنٹ سے ایڈیٹر اور پھر ہدایتکار اور فلمساز بنے۔ راجندر سنگھ بیدی بھی اپنی فلموں کی ایڈیٹنگ رشی کیش مکرجی سے ہی کراتے تھے۔

رشی کیش مکرجی بمبئی کے اندھیری علاقے کے ایک کمرے کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ اُس وقت وہ صرف بمل رائے کے معاون ہوا کرتے تھے۔ بمبئی میں اُن کی دوستی دلیپ کمار سے ہو گئی جو عمر میں اُن سے صرف

دوسال چھوٹے تھے اور اکثر رشی کیش کے اندھیری والے کرایہ کے کمرے پر آیا کرتے تھے۔ 1957 میں دلیپ کمار کے مشورے پر ہی انھوں نے فلم 'مسافر' کی ہدایتکاری کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس فلم میں دلیپ کمار نے لتا منگیشکر کے ساتھ ایک گیت بھی گایا تھا اور بغیر کوئی معاوضہ لیے کام کیا تھا۔

فلم 'مسافر' کی نمائش کے ساتھ ہی اِس نوجوان ہدایتکار کے الگ طرز و انداز کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس فلم میں اُنھوں نے الگ قسم کا ایک تجربہ کیا تھا۔ تین مختصر کہانیوں کو جوڑ کر یہ فلم بنائی گئی تھی۔ تینوں کہانیوں کے موڑ الگ الگ تھے مگر ایک ہی لوکیشن تھی جو ایک کرایہ کا مکان تھا۔ تینوں کہانیاں اس ایک مکان میں ایک کے بعد ایک رونما ہوتی ہیں۔ ہدایتکار نے اس لوکیشن کو ایک وسیع استعارے کے طور پر اس دُنیا کی علامت بنا کر پیش کیا تھا اور کرایہ دار اِس دُنیا میں آتے جاتے انسان تھے جو دُکھ سکھ، خوشی اور غم ہر طرح کے احساسات سے گزرتے ہیں۔ رشی کیش مکرجی کا اپنی بات کو سمجھانے کا انداز بالکل آسان تھا مگر اثر دار بھی تھا جو لوگوں کو ہنساتا بھی تھا اور رُلاتا بھی تھا۔ اس فلم میں دلیپ کمار کے ساتھ سچترا سین ہیروئن تھی ساتھ ہی اوشا کرن، ڈیزی ایرانی، کشور کمار، نروپا رائے اور نذیر حسین بھی خاص کرداروں میں تھے۔ یہ فلم اور اِس کا پیش کرنے کا انداز فلم شائقین کو بہت پسند آیا۔ اس فلم کو نیشنل فلم فیسٹیول میں 'سرٹیفکیٹ آف میرٹ' ملا تھا۔

> **رشی کیش مکرجی بمبئی کے اندھیری علاقے کے ایک کمرے کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ اُس وقت وہ صرف بمل رائے کے معاون ہوا کرتے تھے۔ بمبئی میں اُن کی دوستی دلیپ کمار سے ہو گئی جو عمر میں اُن سے صرف دو سال چھوٹے تھے اور اکثر رشی کیش کے اندھیری والے کرایہ کے کمرے پر آیا کرتے تھے۔ 1957 میں دلیپ کمار کے مشورے پر ہی انھوں نے فلم 'مسافر' کی ہدایتکاری کی ذمہ داری سنبھالی۔**

اس کے بعد رشی کیش مکرجی نے دلیپ کمار کے اصرار پر ہی راجکپور کی فلم 'اناڑی' کی ہدایت کی۔ بعد میں رشی دا اور راجکپور کی دوستی کا یہ عالم تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی راجکپور کو اپنی فلم 'آنند' میں نہیں لے پائے کیونکہ وہ اپنے دوست کو فلمی زندگی میں بھی مرتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ فلم 'اناڑی' 1959 میں ریلیز ہوئی اور اس فلم کو بہترین ہندی فلم کا نیشنل ایوارڈ ملا۔ امیر ہیروئن اور غریب ہیرو نوتن اور راجکپور کی پریم کہانی کو رشی کیش مکرجی نے کئی نئے انداز دے کر ایک الگ ہی قسم کی فلم بنائی تھی۔ کرداروں کے آپسی تعلقات، سچائی، ایمانداری اور انصاف کے پہلوؤں کو نہایت سادگی اور دلچسپی سے پیش کیا گیا تھا۔

فلم 'اناڑی' کی کامیابی کے بعد انھیں کئی بڑے بجٹ کی فلموں کے آفر آئے مگر وہ فلمیں اُن کے ذہن سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ انھوں نے کلکتہ واپس جانے کے بارے میں بھی سوچا مگر بلراج ساہنی نے انھیں روک لیا اور اُن سے اپنی فلم 'انورادھا' ڈائریکٹ کرائی۔ اس طرح 1960 میں رشی کیش مکرجی نے فلم 'انورادھا' پیش کی۔ ایک عورت کے ایثار اور جذبۂ قربانی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنے کے ساتھ موسیقار روی شنکر کی موسیقی کی وجہ سے بھی اس فلم کو بہت پسند کیا گیا۔ اب رشی کیش مکرجی کی ہدایتکار کے طور پر ایک خاص پہچان بن گئی تھی اور اُن کے انداز اور طرز کو لوگ پہچاننے لگے تھے۔ اس درمیان انھوں نے اشوک کمار پروڈکشن کی فلم 'پرنیتا' کی ایڈیٹنگ بھی کی۔ اس فلم میں اشوک کمار کے ساتھ مینا کماری نے اپنی جذباتی اداکاری سے اس فلم کو بے مثال بنایا تھا۔

دلیپ کمار اور راجکپور کے بعد رشی کیش مکرجی نے 1962 میں دیو آنند کے ساتھ اداکارہ سادھنا کو لے کر فلم 'اصلی نقلی' بنائی۔ اس فلم میں اداکارہ سندھیا رائے نے بھی اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس طرح رشی کیش مکرجی نے اپنے زمانے کے فلمی دُنیا کے تین اہم ستون، دلیپ، راج اور دیو کو اپنی ہدایتکارانہ صلاحیتوں سے فیضیاب کیا۔

اس کے بعد فلم 'چھایا'، 'میم دیدی'، 'عاشق'، 'سانجھ اور سویرا' اور 'دو دل' کے بعد رشی کیش مکرجی نے 1966 میں فلم 'انوپما' پیش کی۔ اس فلم میں مکالمے کم تھے مگر دھرمندر کا الگ قسم کا کردار بھی اس فلم کی خصوصیت تھی اور باپ بیٹی کے درمیان کی نفسیاتی اُلجھنیں سلجھانے کی دلچسپ اور آسان سی کوشش کی گئی تھی۔ اس فلم کو سلور میڈل عطا کیا گیا۔ فلم 'انوپما' کے بعد 'بیوی اور مکان' اور پھر منشی پریم چند کے مشہور ناول پر مبنی فلم 'غبن' اور اس کے بعد فلم 'منجھلی دیدی' رشی کیش مکرجی نے پیش کیں۔ 1968 میں رشی کیش مکرجی کی ایک اہم فلم 'آشیرواد' نمائش کے لیے پیش کی گئی اور اس فلم کو بھی سلور میڈل عطا کیا گیا۔ یہ فلم شاعرانہ انداز کے باپ اور اُس کی بیٹی کے حساس رشتوں کی سچائی کا احساس کراتی ہے۔ اس کے فوراً بعد 1969 میں فلم 'ستیہ کام' اور 1970 میں فلم 'آنند' کو بھی سلور میڈل عطا کیا گیا۔

> **اسی طرح فلم 'آنند' میں کینسر کا مریض راجیش کھنہ اپنی جلد آنے والی موت سے واقف ہوتے ہوئے بھی خوشیاں بانٹتا پھرتا ہے اور اُمید پر قائم رہنے کا پیغام دیے جاتا ہے۔ اس فلم میں رشی کیش مکرجی نے جذبات کی ایسی عکاسی کی تھی کہ جب یہ فلم راجیش کھنہ کی ماں نے دیکھی تو وہ فلم میں راجیش کھنہ کی موت کے منظر کو برداشت نہ کر سکیں اور بیہوش ہو گئیں۔ بعد میں انہیں اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ فلم 'آنند' سے امیتابھ بچن پر بابو موشائے کی ایسی مہر ثبت ہوئی کہ لوگ آج بھی امیتابھ بچن کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔**

فلم 'ستیہ کام' کا ہیرو دھرمندر نہ صرف اپنی بدچلن بیوی کے کردار کی اصلاح کرتا ہے بلکہ سماج میں ہر طرف بڑھتی ہوئی بدعنوانیوں کے خلاف بھی لڑتا ہے۔ رشی دا خود بھی آزادی کے بعد معاشرے میں پھیلتی بدعنوانیوں سے بہت فکرمند رہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے دل کی وہ سب باتیں دھرمندر کے کردار کے ذریعہ سماج کے سامنے رکھی ہیں۔ دھرمندر نے بھی اس کردار میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کر کے الگ انداز سے فلم بینوں کو اپنی موجودگی کا احساس کرایا ہے۔

اسی طرح فلم 'آنند' میں کینسر کا مریض راجیش کھنہ اپنی جلد آنے والی موت سے واقف ہوتے ہوئے بھی خوشیاں بانٹتا پھرتا ہے اور اُمید پر قائم رہنے کا پیغام دے جاتا ہے۔ اس فلم میں رشی کیش مکرجی نے جذبات کی ایسی عکاسی کی تھی کہ جب یہ فلم راجیش کھنہ کی ماں نے دیکھی تو وہ فلم میں راجیش کھنہ کی موت کے منظر کو برداشت نہ کر سکیں اور بیہوش ہو گئیں۔ بعد میں انہیں اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ فلم 'آنند' سے امیتابھ بچن پر بابو موشائے کی

ایسی مہر ثبت ہوئی کہ لوگ آج بھی امیتابھ بچن کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ فلم 'آنند' کے اسی خیال کو فلم 'ملی' میں رشی کیش مکرجی نے اداکارہ جیہ بھادری کے ذریعہ مختلف انداز میں پیش کیا۔ فلم 'ستیہ کام' نے دھرمندر اور فلم 'آنند' اور 'نمک حرام' نے راجیش کھنہ اور امیتابھ بچن کو مقبولیت اور شہرت کے سنہرے دروازے پر لاکھڑا کیا۔

رشی دا کے ساتھ خاص بات یہ تھی کہ ہدایتکاری کرتے وقت انھوں نے اپنی تہذیب، خیالات اور رسم ورواج کے ساتھ کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں ہونے دیا اور نہ ہی کبھی ان سے کوئی بے جا فائدہ اُٹھایا۔ انھوں نے ہمیشہ سادگی کے ساتھ جذباتی فلمیں بنائیں جن میں وہ زمین سے جڑے ایک عام آدمی کے مسائل کو اُٹھاتے تھے۔

1971 میں رشی کیش مکرجی نے ایک اور بہترین فلم 'گڈی' کے ذریعہ فلم انڈسٹری میں جیہ بھادری جیسی مکمل اداکارہ کو روشناس کرایا۔ طالب علمی کے زمانے میں فلموں اور فلمی اداکاروں کے لیے نوجوانوں میں جو دیوانگی ہوتی ہے، اُس کو موضوع بناکر بڑی آسانی سے انھوں نے یہ پیغام عوام تک پہنچا دیا کہ یہ لوگ بھی ہماری اور آپ کی طرح عام انسان ہی ہوتے ہیں۔ اس کے بعد رشی کیش مکرجی نے نئے زمانے کے ازدواجی رشتوں میں فنکارانہ 'اَنا' کو موضوع بناتے ہوئے 1973 میں فلم 'ابھیمان' پیش کی، جس میں امیتابھ بچن اور جیہ بھادری نے اپنے بہت ہی جذباتی اور غیرت مند کرداروں کے ذریعہ اس نفسیاتی مسئلہ کو بہت ہی حساس انداز میں پیش کیا۔ مگر یہ انداز خود رشی کیش مکرجی کا پیدا کردہ ہے۔ انھوں نے عام فلم بینوں کے جذبات کی ہمیشہ قدر کی اور ان کی دلجوئی کو بھی ملحوظ رکھا۔

سال 1973 میں رشی کیش مکرجی نے عالمی شہرت یافتہ ناٹک 'بیکٹ فرم' (Baket Firm) پر اپنی فلم 'نمک حرام' بنائی جس میں زندگی کی دو سچائیوں کے درمیان سنگھرش کی داستان بیان کی گئی ہے۔ 'مالک اور نوکر' یہ ایسی دو سچائیاں ہیں جن میں دوستی اور محبت کے جذبے بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح سماجواد اور سرمایہ دارانہ نظام کی بڑی عمدہ عکاسی اس فلم میں ہوئی ہے۔ امیتابھ بچن اور راجیش کھنہ کی اسٹار ویلیو کو بھی اس فلم میں تولا گیا تھا۔

1973 میں ہی رشی کیش مکرجی نے اداکارہ ریکھا کو لے کر فلم 'نمک حرام' پیش کی اور فلم بین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ 'سیکس بم' کہی جانے والی ریکھا کو انھوں نے بالکل نئے انداز میں پیش کیا اور اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کو نکھار کر بعد میں فلم 'آلاپ' (1977) اور 'خوبصورت' (1980) میں بھی اُس کے بہترین کردار پیش کیے۔ فلم 'خوبصورت' کی شوٹنگ انھوں نے اپنے گھر میں ہی کی تھی تاکہ فنکاروں کو گھر کا سا ماحول میسر ہو اور وہ اپنی بہترین اداکارانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر سکیں۔ ریکھا کو وہ چنا پٹو یعنی چھوٹی بیٹی کہہ کر بلاتے تھے۔ ریکھا نے باصلاحیت فنکارہ کے بطور اپنی پہچان رشی دا کی فلموں سے ہی بنائی تھی۔

اس کے بعد ہلکی پھلکی خوشگوار کامیڈی کے ساتھ رشی کیش مکرجی کی ایک اور فلم 'چپکے چپکے' 1975 میں پردۂ سیمیں کی زینت بنی۔ یہ فلم رشی کیش مکرجی کی اُسی روایت پر مبنی تھی جو وہ 'گول مال، رنگ برنگی' اور 'خوبصورت' جیسی فلموں میں پیش کر چکے تھے۔ مگر یہاں ایک بہت سنجیدہ معاملے کو انہوں نے بہت سلیقے سے مزاح کے روپ میں پیش کیا تھا۔ رشی کیش مکرجی نے اپنی لمبی فلمی زندگی میں کئی اداکاروں کو ایک نئی سمت و رفتار عطا کی ہے۔ راجیش کھنہ کے فلم 'آنند، باورچی' اور 'نمک حرام' جیسے کرداروں کو پیش کرنے میں رشی کیش مکرجی کا ہی کمال ہے۔ فلم 'آنند' کے زمانے سے ہی رشی دا نے راجیش کھنہ کا نام پنٹو بابا رکھ دیا تھا اور آخر تک انہیں اسی نام سے پُکارتے رہے۔

اسی طرح ایکشن فلموں میں ضائع ہو رہے سنجیو کمار کی صلاحیتوں کو انہوں نے فلم 'آشیرواد' کے چھوٹے سے کردار میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا۔ آگے چل کر سنجیو کمار کی ان ہی صلاحیتوں کو فلمساز وہدایتکار گلزار نے فلم 'کوشش، پریچے، آندھی' اور 'موسم' میں اور رمیش سپی نے فلم 'شعلے' میں استعمال کرکے فائدہ اُٹھایا۔ فلم 'ارجن پنڈت' میں سنجیو کمار کے لیے جو گنجائش رشی کیش مکرجی نے پیدا کی ہے وہ یادگار بن گئی ہے۔

دھرمندر جو کبھی اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے نہیں پہچانے جاتے تھے اُن کو بھی رشی کیش مکرجی نے فلم 'انوپما، ستیہ کام' اور 'چپکے چپکے' میں اُجاگر کیا ہے۔ رشی کیش مکرجی نے فلم 'ستیہ کام' میں اشوک کمار کے کردار کو جس بلندی پر پہنچایا ہے وہ بھی اُن کی ہدایتکارانہ صلاحیت کا کمال ہے۔ جیہ بھادری کے کردار کو ایک خاص امیج سے نکال کر جس طرح ایک نئی امیج 'گڈی' میں رشی کیش مکرجی نے پیدا کی ہے اس کی یادیں آج بھی فلم بینوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ اُن کے ساتھ کام کرنا کبھی فنکار اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے کیونکہ اُن کے کردار زندگی سے بھرپور ہوتے تھے۔

> **رشی کیش مکرجی نے نئے زمانے کے ازدواجی رشتوں میں فنکارانہ 'اَنا' کو موضوع بناتے ہوئے 1973 میں فلم 'ابھیمان' پیش کی، جس میں امیتابھ بچن اور جیہ بھادری نے اپنے بہت ہی جذباتی اور غیرت مند کرداروں کے ذریعہ اس نفسیاتی مسئلہ کو بہت ہی حساس انداز میں پیش کیا۔ مگر یہ انداز خود رشی کیش مکرجی کا پیدا کردہ ہے۔ انھوں نے عام فلم بینوں کے جذبات کی ہمیشہ قدر کی اور ان کی دلجوئی کو بھی ملحوظ رکھا۔**

یہی وجہ ہے کہ سپر اسٹار سے لے کر قطار کے آخر میں کھڑا ہوا کوئی بھی فنکار اُن کی فلم میں کام کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔

رشی کیش مکرجی نے ہمیشہ لیک سے ہٹ کر ہی فلمیں بنائیں۔ مگر کئی بار انھوں نے فلمساز کی مرضی کے مطابق بھی فلمیں بنائیں، جن میں اُن کا اپنا رنگ کہیں گم سا ہو گیا۔ اس بات کا اعتراف وہ خود بھی کھلے دل سے کرتے تھے کہ اُن کی اس طرح کی فلمیں ناکام ہوئیں اور ان کے نام اور کام کو نقصان پہنچا۔ اُن کا ماننا تھا کہ اپنی پہلی ہی فلم 'مسافر' سے انہوں نے الگ قسم کی فلمیں بنانے کی ٹھان لی تھی، لیکن بیچ بیچ میں انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ فلمسازی کی بے مقصد اور بیہودہ دوڑ میں خود بھی شامل

> **رشی کیش مکرجی نے اپنی تقریباً پچاس سالہ فلمی زندگی میں کل 42 فلموں کی ہدایت دی اور کئی فلموں کا اسکرپٹ بھی خود ہی تیار کیا۔ رشی کیش مکرجی نے دور درشن کے لیے بھی کئی سیریل بنائے یا اُن کی ہدایت کی ہے۔**

ہو گئے ہیں اور جب بھی انہیں ایسا لگا۔ انھوں نے خود کو سنبھالا اور اپنی مرضی کے مطابق فلموں کی تشکیل کی۔ رشی کیش مکرجی نے 1975 میں فلم 'جھوٹی' پیش کی اور اس کے بعد اپنی مسلسل بیماری کے سبب وہ کوئی فلم نہ بنا سکے۔ 1998 میں انھوں نے انل کپور اور جوہی چاولہ کو لے کر فلم 'جھوٹ بولے کوا کاٹے' پیش کی مگر یہ فلم باکس آفس پر ناکام ہو گئی۔ اپنے استاد بمل رائے کے نقش قدم پر چلتے ہوئے رشی کیش مکرجی بھی اپنی فلموں کے ذریعہ ہندوستانی عوام کو کوئی پیغام یا تحریک دینے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے آرٹ اور کمرشیل سنیما کو درمیان کا ایک ایسا راستہ دکھایا جو کامیاب بھی رہا اور مقبول بھی۔

اپنی آخری فلم 'جھوٹ بولے کوا کاٹے' سے پہلے انہوں نے دھرمندر کے ساتھ ایک فلم 'لاٹھی' بنانے کا اعلان کیا تھا۔ اس فلم کے ایک یا دو شیڈیول کی شوٹنگ بھی کی گئی تھی مگر اس کے بعد کچھ وجوہات سے یہ فلم ڈبوں میں بند ہو کر رہ گئی۔

رشی کیش مکرجی نے اپنی تقریباً پچاس سالہ فلمی زندگی میں کل 42 فلموں کی ہدایت دی اور کئی فلموں کا اسکرپٹ بھی خود ہی تیار کیا۔ رشی کیش مکرجی نے دوردرشن کے لیے بھی کئی سیریل بنائے یا اُن کی ہدایت کی ہے۔ 'ہم ہندوستانی، دھوپ چھاؤں، تلاش، رشتے' اور 'اُجالے کی اور' ایسے ہی چند پروگرام ہیں جن میں زمانے کے ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے اپنی چھاپ بھی چھوڑی ہے۔ دراصل سستی شہرت اور تجارتی مقابلے کے اس دور میں جس قسم کے سیریلس کی روایت قائم ہو گئی ہے۔ رشی کیش مکرجی جیسے باصلاحیت ہدایتکار کی آج بھی ضرورت ہے جن کا مقصد صرف پیسہ کمانا نہیں بلکہ جو معاشرے کے لیے بھی اپنے ذہن و دل میں ایک ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ رشی کیش مکرجی ایک نیک دل انسان تھے اور اپنی ذاتی زندگی میں وہ شروع سے آخر تک ایک جیسے رہے اور وقت کے نشیب و فراز بھی اُن میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر

سکے۔ اُن کی فلمیں بھی ان کی ذاتی زندگی کی طرح صاف ستھری اور بامقصد ہی رہیں۔

رشی کیش مکرجی نیشنل فلم ڈولپمنٹ کارپوریشن (NFDC) اور سینٹرل بورڈ آف فلم سرٹیفکیشن (CBFC) کے چیئرمین بنائے گئے اور فلم فائنس کارپوریشن (F.F.C.) کے ڈائریکٹر کے عہدے پر بھی فائز رہے اور ان کے دور میں متذکرہ اداروں میں بڑی خوبی سے کام چلا۔ حالانکہ بعد میں ان کو کئی فلمی عہدوں کے لیے پیش کش کی گئی مگر انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ مسترد کر دیا۔ 1966 میں رشی کیش مکرجی کی فلم 'انوپما' کو پریسیڈینٹ کا گولڈ میڈل ملا۔ 1968 میں فلم 'آشیرواد' اور 1969 میں فلم 'ستیہ کام' اور پھر 1971 میں فلم 'آنند' کو بہترین علاقائی فلم کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فلم 'انورادھا' کو بھی پریسیڈینٹ گولڈ میڈل کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ 18 ستمبر 2000 کو سال 1999 کا فلمی دُنیا کا سب سے بڑا سرکاری اعزاز 'دادا صاحب پھالکے ایوارڈ' اُس وقت کے صدر جمہوریۂ ہند جناب کے آر نارائنن کے ہاتھوں رشی کیش مکرجی کو پیش کیا گیا۔ 2001 میں سرکاری طرف سے اُن کو 'پدم وبھوشن' کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اُن کی 14 فلموں نے سلور جوبلی منائی۔

اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں رشی دا ممبئی کے اپنے گھر پر تقریباً اکیلے ہی رہتے تھے۔ سب سے پہلے اُن کی اہلیہ نے داغ مفارقت دیا۔ پھر اُن کا ایک بھائی چل بسا اور جون 2000 میں رشی دا کا چھوٹا بیٹا سندیپ مکرجی جو چھوٹی کارپوریٹ اور دستاویزی فلمیں بناتا تھا، کے اچانک انتقال کی وجہ سے وہ ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ سندیپ ٹرین سے دہلی جا رہا تھا کہ راستے میں دمہ کا حملہ ہوا اور وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اُن کا بڑا بیٹا امریکہ میں سائنسداں ہے۔ رشی دا اپنی طویل بیماری، خاص طور پر گھٹنوں کے درد کی وجہ سے لمبے عرصے تک فلم میکنگ سے دور رہے۔ مگر وہ کچھ ایسا کرنا چاہتے تھے جو اُن کی زندگی کا ماحصل ہو اور صدیوں تک کے لیے یادگار بن جائے۔ وہ اپنی طرز اور اپنے معیار کے مطابق ہی نئے زمانے کے طور طریقوں سے جڑنا چاہتے تھے۔

رشی کیش مکرجی کو 5 جون 2006 کو ممبئی کے لیلاوتی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ وہ کئی ماہ سے بیمار چل رہے تھے اور جگر کی خرابی کی وجہ سے اُن کے گردے بھی متاثر ہو گئے تھے اور وہ مستقل بیمار تھے۔ 27 اگست 2006 کی شام اسپتال میں ہی رشی کیش مکرجی نے چار بج کر چالیس منٹ پر آخری سانس لی اور بہت سی کامیاب اور بامقصد فلموں کا یہ خالق اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ اُن کا بیٹا امریکہ میں تھا۔ لہٰذا اس کے آنے کے بعد ہی 29 اگست کو ہزاروں پُرنم آنکھوں کی دھندلکی چھاؤں میں اُن کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔

■

Anees Amrohvi
F - 5, First Floor, Jawahar Park (W)
LAXMI NAGAR, DELHI - 110092
Ph: 98116 12373, 886 009 6473
Email:- qissey@rediffmail.com

ہندوستانی سنیما اور اردو ناول

احمد خاں

ہندوستانی سنیما، ایک ایسے دور کی پیداوار ہے، جب ہندوستان کی سیاست برطانوی حکومت کی غلامی کے جوئے کو اپنے کندھے سے اتار پھینکنے کے لیے بے قرار تھی۔ گاندھی جی کی سیاسی مداخلت سے حکومتِ برطانیہ متزلزل تھی۔ تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔ نابرابری، چھوا چھوت اور طبقاتی استحصال کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ملک کے اسی سیاسی و سماجی پس منظر میں سنیما نے جنم لیا۔ سنیما، دورِ غلامی سے قدم تال کرتے ہوئے معاشرتی اصلاح اور تحریک آزادی کے شانہ بہ شانہ پروان چڑھتا رہا۔ ملک جب آزاد ہوا تو سنیما نے بھی اس خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے دیکھا۔ زخمی معاشرے کے درد کو محسوس کیا۔ تقسیم ہند اور فسادات کی گونج جس طرح ادب میں گونجتی رہی، ہندوستانی سنیما بھی اس سے متاثر رہا۔ ملک کے سیاسی، سماجی، اشتراکی، طبقاتی اور اقتصادی نظریات کو ہندوستانی سنیما میں خصوصی طور پر پیش کیا گیا۔

ہندوستانی سنیما کے فروغ میں رزمیہ داستانیں جیسے مہابھارت اور رامائن، پنچ تنتر کی کہانیاں، سنسکرت ڈرامے، لوک تھیٹر، رہس، جلسہ، رام لیلا (اتر پردیش)، یاترا (مغربی بنگال)، یکشا نگنا (کرناٹک)، چنڈو ناٹکم (آندھرا پردیش)، تیرو کٹو (تمل ناڈو) وغیرہ کی مستحکم روایتیں کارفرما رہی ہیں۔ علاوہ ازیں ہندوستانی سنیما نے ابتدا میں پارسی تھیٹر اور علاقائی ڈراموں سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے مغربی موسیقی، رقص اور جدید تکنالوجی سے اثرات قبول کیے۔ ہندوستانی سنیما کی ابتدا فلم ساز لوئی لومیئر اور آگسٹ لومیئر کی فلم 'مارویل آف دی سنچری' سے ہوئی۔ جس کی پہلی بار نمائش بمبئی کے واٹسن ہوٹل کے ہال میں 7 جولائی، 1896 میں کی گئی۔ سنیما نے ہندوستانی اساطیری و دیومالائی داستانیں، تاریخی کارنامے، پریوں کی داستانیں اور لوک کہانیاں وغیرہ کی ہندوستانی روایتوں کو بڑی فراخ دلی سے اپنے اندر انگیخت کیا۔ ہندوستانی سنیما کو سب سے زیادہ ہندوستانی ادب نے متاثر کیا ہے۔ جس میں سنسکرت ڈرامے، ہندی اردو فکشن، داستان اور ڈرامے وغیرہ شامل ہیں۔

فکشن اور فلم کے مابین گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ باوجود اس کے ان کی اپنی منفرد شناخت ہوتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے معاون تو ہیں لیکن ایک دوسرے کے متبادل نہیں ہیں۔ فکشن کی طاقت تحریری ترسیل ہے اور فلم کی طاقت سمعی و بصری ترسیل ہے۔ تحریر میں صنعتوں، علامتوں اور لفظیات کی بازی گری ہوتی ہے تو فلم میں فکشن کے ساتھ تصویری تخیلات کی سحر سازی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ سنیما میں مکالموں کی اہمیت مسلّم ہے۔ لیکن تصویر کی زبان اس قدر طاقتور ہوتی ہے کہ ایک چھوٹا سا 'سین' بھی ہزاروں الفاظ پر بھاری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فکشن اور فلم کے تقاضے اور لوازمات ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ ناظرین فلم کو کیمرے کی نظر سے دیکھتے ہیں جبکہ ادب میں قاری صنعتوں اور علامتوں کے پابند ہوتے ہوئے بھی تفہیم کے لیے آزاد ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر مذکورہ دونوں اصناف آزادانہ تشخص رکھتی ہیں۔ فلم کی تشکیل میں متعدد شعبے معاون ہوتے ہیں۔ فلم میں کہانی کوئی اور لکھتا ہے تو اسکرین پلے اور مکالمہ کوئی اور۔ اسکرپٹ جب تیار ہو جاتی ہے تو ہدایت کار کا کام شروع ہوتا ہے۔ ہدایت کار کے علاوہ سنیما ٹوگرافی کا بھی دخل ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ جس طرح سے کہانی کار سوچتا ہے اسی طرح ہدایت کار اور کیمرہ مین بھی عمل پیرا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اصل کہانی پر جب فلم تیار ہوتی ہے تو وہ کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ لیکن مرکزی خیال کسی نہ کسی شکل میں قائم رہتا ہے۔ باوجود اس کے فلم کی مقبولیت اور اس کے اثرات میں کمی نہیں آتی ہے۔

سنیما بنیادی طور پر ایک تفریحی میڈیم ہے۔ جس کا مقصد ناظرین کو ذہنی آسودگی فراہم کرنا ہوتا ہے۔ فلم ایک ایسا میڈیم ہے جس کے اپنے ٹولس ہوتے ہیں۔ زبان بھی ایک ٹول ہے، جسے میڈیم خود پیدا کرتا ہے۔ مثلاً ادب، فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور تھیٹر بحیثیت میڈیم اپنے تقاضے کے پیشِ نظر زبان کا تعین کرتے ہیں۔ پرفارمنگ آرٹ میں زبان کے استعمال میں عوامی دلچسپی اور ترسیل کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ میڈیم اپنی زبان کے ساتھ اپنے کردار بھی خود پیدا کرتا ہے۔ مثلاً فلم اور تھیٹر کے آرٹسٹ اپنی تربیت اور پیشکش کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ دراصل میڈیم اتنا طاقتور ہو چکا ہے کہ اب میڈیم ہی پیغام اور ترسیل ہے۔ کنیڈین ماہر ترسیل پروفیسر مارشل میک لوہان نے اپنی کتاب 'انڈر اسٹینڈنگ میڈیا: دی ایکسٹینشن آف مین' (1964) میں ذرائع ابلاغ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "the medium is the message" یعنی میڈیم ہی پیغام ہے۔ اس طرح ذرائع ابلاغ میں فلم کی بحیثیت میڈیم اہمیت انتہائی بڑھ جاتی ہے۔

سنیما اور اردو کے رشتے کو متعدد صورتوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اول، اردو داستان، ڈرامہ، ناول اور افسانے پر مبنی فلمیں۔ جیسے انارکلی، مغلِ اعظم (1960)، شطرنج کے کھلاڑی (1977)، پنچ پرمیشور (1955)، منڈی (1983)، گرم کوٹ) (1955)، دھرتی کے لال (1946) وغیرہ۔ دوم، اردو ادبا اور شعرا کے ذریعے لکھی گئیں کہانیاں، اسکرین پلے اور مکالمے پر مبنی فلمیں۔ جیسے مزدور (1934)، گرم ہوا (1973)، مرزا غالب (1954)، داغ (1973)، ہمراز (1967) وغیرہ۔ سوم، اردو ادبا کے ذریعے بحیثیت فلم ساز بنائی گئیں فلمیں۔ جیسے خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، جاں نثار اختر وغیرہ۔ چہارم، مسلم سماج و تہذیب پر مبنی فلمیں۔ جیسے میرے محبوب، میرے حضور، محبوب کی مہندی (1971)، چشم بد دور، پاکیزہ (1972)، بہو بیگم (1978)، چودھویں کا چاند (1961)، صاحب بیوی اور غلام، جہاں آرا (1964)، بازار (1982)، نکاح (1982)، فضا، مقبول، سرداری بیگم (1996) اور غلام مصطفےٰ وغیرہ۔

سنیما اور اردو کا رشتہ روزِ اول سے ہے۔ خاموش

سنیما کا دور 1896 سے 1931 تک رہا۔اس دور کی خاموش فلموں میں لیلی مجنوں (1922، 1927)، شیریں فرہاد (1926)، انار کلی (1928)، حاتم طائی (1929)، بلبلِ پرستان (1926) اور گلِ صنوبر (1928) وغیرہ اہم ہیں۔ ہندوستانی سنیما کی پہلی متکلم فلم کا اعزاز 'عالم آرا' (1931) کو حاصل ہے، جو اردو زبان میں ہے۔یہ فلم جوزف ڈیوڈ کے پارسی ڈرامے پر مبنی ہے۔ جسے منشی ظہیر نے اردو میں لکھا تھا۔یہ فلم امپیریل مووی ٹون کے بینر تلے آردشیر ایرانی کی ہدایت میں بنی تھی۔فلم میں مرکزی کردار ماسٹر وٹھل (پرنس)، زبیدہ (عالم آرا) پرتھوی راج کپور (وزیراعظم جنرل عادل) وغیرہ نے ادا کیے۔فلم میں کل 22 نغمے فلمائے گئے ہیں۔ ان میں 'دے دے خدا کے نام پر' (گلوکار۔ وزیر محمد خان) اور 'بدلہ دلوائے گا یا رب' (گلوکارہ۔زبیدہ) بہت مقبول ہوئے۔موسیقی فیروز شاہ مستری اور بی۔ایرانی نے دی۔ بقول پریم پال اشک:

''14مارچ 1931 کو امپیریل کمپنی کے جھنڈے تلے اور خان بہادر آردشیر ایرانی کی زیرِ ہدایت ریلیز ہونے والی اولین متکلم فلم 'عالم آرا' ہماری پہلی اردو فلم تھی... عالم آرا اپنے زمانے کے نامور ڈراما نگار جوزف ڈیوڈ کے اردو ڈرامے عالم آرا پر مبنی تھی۔'' (ہندوستانی سنیما کے پچاس سال، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ص 40-139)

ہندوستانی سنیما کی ابتدا سے ہی اردو کے اکثر نامور فکشن نگار، ڈراما نگار، شعرا اور بالخصوص ترقی پسند ادبا، فلم انڈسٹری سے کسی نہ کسی شکل میں وابستہ رہے۔ جن میں پریم چند، آغا حشر کاشمیری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، اپیندر ناتھ اشک، اختر الایمان اور جاں نثار اختر وغیرہ کے نام اہم ہیں۔اردو ناول نگاروں کے فلمی سفر اور ان کے شاہکار ناولوں پر مبنی فلموں کا جائزہ حسبِ ذیل ہے۔

پریم چند، فلم انڈسٹری میں اپنی قسمت آزمائی کے لیے 31 مئی، 1934 میں بمبئی پہنچے۔انھوں نے 'اجنتا سینے ٹون' نامی پروڈکشن ہاؤس میں اسکرپٹ رائٹر کی نوکری کر لی۔انھیں امید تھی کہ آٹھ ہزار سالانہ تنخواہ سے مالی پریشانی دور ہوسکتی ہے۔ انھوں نے اپنے فلم کیریئر کا آغاز فلم مزدور (1934) کی اسکرپٹ لکھ کر کیا۔اس فلم کی ہدایت موہن بھونانی نے کی۔ یہ فلم مزدور طبقے کے افلاس کی عکاس ہے۔پریم چند نے اس فلم میں مزدور لیڈر کا چھوٹا سا رول ادا کیا تھا۔پریم چند کو فلم انڈسٹری کا غیرادبی اور تجارتی ماحول پسند نہیں آیا۔لہٰذا انھوں نے پروڈکشن ہاؤس سے ایک سالہ معاہدہ مکمل ہونے سے قبل ہی ممبئی چھوڑ کر 4اپریل، 1935 کو واپس آ گئے۔'بمبے ٹاکیز' کے ہمانشو رائے نے پریم چند کو رضامند کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

پریم چند کے اردو ناول بازارِ حسن اور ہندی میں 'سیوا سدن' پر مبنی پہلی فلم 'سیوا سدنم' (1938) تمل زبان میں بنائی گئی تھی۔ جس کی ہدایت کے۔سبرامنیم نے کی تھی۔یہ فلم جسم فروشی اور عورت کے سیاسی و سماجی حقوق اور جنسی آزادی کی بے باکانہ تصویر پیش کرتی ہے۔فلم میں ایم ایس سبالکشمی نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ سیتا لکشمی ایک برہمن بیوہ 'گنڈما' کے کردار کو انتہائی مضبوطی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے علاوہ ایف.جی ناتیشا ائیر اور جیالکشمی نے بہترین اداکاری کا نمونہ پیش کیا ہے۔

پریم چند کے ناول 'بازارِ حسن' پر مبنی فلم 'بازارِ حسن' 2014 میں اجے مہرا کی ہدایت میں بنائی گئی۔ اسکرین پلے دھنن جے نے لکھا۔فلم میں سمن کے کردار کو ریشمی گھوش نے ادا کیا۔ علاوہ ازیں اوم پوری (کشن چند)، جیت گوسوامی (سدن) اور ریش پال شرما (گجادھر) وغیرہ نے کردار ادا کیے۔

پریم چند کے ناول 'چوگانِ ہستی' پر مبنی فلم 'رنگ بھومی' (1946) موہن بھونانی کی ہدایت میں بنائی گئی۔ اداکارہ نگار سلطانہ کی بحیثیت لیڈ رول یہ پہلی فلم تھی۔علاوہ ازیں ان کے شاہکار ناول 'گئو دان' پر مبنی فلم 1963 میں ترلوک جیٹلی کی ہدایت میں بنی تھی۔اس فلم میں راج کمار، ششی کلا، محمود، شبھا کھوٹے، مدن پوری، ٹن ٹن اور کامنی کوشل وغیرہ نے کردار ادا کیے۔روی شنکر نے موسیقی دی تھی۔فلم ڈائریکٹر گلزار نے 26 اپیسوڈ کی ٹی وی سریز بعنوان 'تحریر... پریم چند کی' 2004 میں بنائی تھی۔جس میں ناول 'گئو دان' اور ناول 'نرملا' بھی شامل ہیں۔جنھیں ٹیلی فلم کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

پریم چند کے ناول غبن پر مبنی فلم 'غبن' (1966) رشی کیش مکھرجی اور کرشن چوپڑا کی ہدایت میں بنائی گئی۔فلم کا مکالمہ اردو کے نامور شاعر اختر الایمان نے لکھا۔مرکزی کردار سنیل دت (رام ناتھ) اور سادھنا (جلپا) نے ادا کیے۔موسیقی شنکر جے کشن نے تیار کی۔لتا منگیشکر اور محمد رفیع نے گیتوں کو اپنی آواز سے سنوارا۔اس فلم کے گیتوں میں 'احسان میرے دل پر تمہارا ہے'، 'میں نے دیکھا تھا سپنوں میں' اور 'تم بن ساجن برسے نین' بہت مقبول ہوئے۔

مرزا ہادی رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' پر ہندو پاک میں چار فلمیں بنائی گئی ہیں۔ہندوستان میں مذکورہ ناول پر مبنی پہلی فلم 'مہندی' (1958) ایس۔ایم یوسف کی ہدایت میں بنی تھی۔فلم سازی اے۔اے۔نادیادوالا نے کی۔فلم میں لیڈ رول اجیت اور جے شری نے ادا کیے۔ان کے علاوہ وینا سپرو، للتا پوار، انوری بائی اور کرشن کانت وغیرہ نے کردار ادا کیے۔فلم کے موسیقار روی اور نغمہ نگار کمار بارہ بنکوی اور کامل راش تھے۔

دوسری فلم 'امراؤ جان ادا' 1981 میں بنی تھی۔جس کی ہدایت، فلم ساز مظفر علی نے کی۔ مکالمہ اور اسکرین پلے مظفر علی، جاوید صدیقی اور شمع زیدی نے مشترکہ طور پر لکھے۔اس فلم کے موسیقار خیام اور نغمہ نگار شہر یار تھے۔ 'امراؤ جان ادا' کے کردار کو بالی ووڈ کی نامور اداکارہ ریکھا نے بڑی حسن وخوبی سے نبھایا ہے۔نواب سلطان کے کردار کو فاروق شیخ اور گوہر مرزا کے کردار کو نصیر الدین شاہ نے زندہ کر دیا ہے۔ان کے علاوہ سیما ستیھو (امیرن)، ستیش شاہ (دلاور خان)، شوکت صدیقی (خانم جان)، راج ببر (فیض علی) وغیرہ نے اچھی اداکاری کی ہے۔ یہ فلم اتنی کامیاب ہوئی کہ اسے نیشنل فلم ایوارڈ (1981) کے تحت چار ایوارڈ: بہترین اداکارہ (ریکھا)، بہترین گلوکارہ (آشا بھونسلے)، بہترین موسیقار (خیام) اور بہترین آرٹ ڈائریکشن (منظور) حاصل ہوئے۔اور فلم فیئر ایوارڈ (1982) میں تین ایوارڈ: بہترین اداکارہ (ریکھا)، بہترین موسیقار (خیام) اور بہترین ہدایت کار (مظفر علی) سے نوازا گیا۔

تیسری فلم 'امراؤ جان ادا' 2006 میں جے پی دتا نے بنائی تھی۔جس میں امراؤ جان ادا کے کردار کو 'ایشوریہ رائے'، نواب سلطان کے کردار کو ابھیشیک بچن، فیض علی کے کردار کو سنیل سیٹھی اور خانم جان کے کردار کو شبانہ اعظمی نے ادا کیے۔فلم کو موسیقی سے انو ملک نے سجایا اور نغمہ کا جادو جاوید اختر نے بکھیرا۔کہانی کو سری دھرن راگھوان نے فروغ دیا اور اسکرین پلے نیرج بورا نے لکھا۔

حسن طارق کی ہدایت میں 'امراؤ جان ادا' کے عنوان سے پاکستان میں 1972 میں فلم بنی تھی۔مرکزی کردار رانی اور شاہد نے ادا کیے۔'امراؤ جان ادا' کے عنوان سے ہی سیریل 2003 میں پاکستانی ٹی وی چینل Geo TV سے نشر ہوا جس کی ہدایت رانا شیخ نے کی اور اسکرین پلے شاعرہ زہرہ نگاہ نے لکھا۔

عصمت چغتائی کا فلمی سفر 1942 میں اس وقت شروع ہوا جب وہ انسپکٹر آف اسکولز کی حیثیت سے ممبئی پہنچیں۔ وہاں شاہد لطیف سے ان کی ملاقات ہوئی۔ شاہد، علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بمبئی آ گئے اور 'بمبئے ٹاکیز' میں کہانی کار، مکالمہ نگار کی حیثیت سے

ملازم ہو گئے تھے۔ اس طرح عصمت چغتائی کا رابطہ فلمی دنیا سے قائم ہوا اور پھر دونوں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ شاہد نے بحیثیت فلم ڈائریکٹر، اسکرین پلے رائیٹر، اور پروڈیوسر متعدد فلمیں بنائیں۔ عصمت نے شاہد کے ساتھ کئی فلموں میں بحیثیت اسکرین پلے رائیٹر، کہانی کار اور پروڈیوسر کام کیا۔ شاہد لطیف کے انتقال (1967) کے بعد وہ بمبئی میں مستقل طور پر مقیم ہو گئیں اور انھوں نے تصنیف وتالیف اور فلم اسکرپٹ نگاری کو ذریعۂ معاش بنالیا۔

بقول عصمت چغتائی:

''میں نے چودہ پندرہ کہانیاں، ڈائیلاگ اور سیناریو لکھے ہیں۔ میں نے کوئی (ادب کی) زیادہ خدمت ودمت نہیں کی بلکہ اپنی خدمت کی... زیادہ تر اپنے گزارے کے لیے میں نے لکھا۔ صرف افسانے لکھ کر تو میں اپنا گذارہ نہیں کر سکتی۔ میگزینوں اور اخباروں میں لکھ کر تو میرا گذارا نہیں ہوسکتا۔ میرے لیے فلم ایک ذریعۂ آمدنی ہے۔'' (عصمت چغتائی، عصمت چغتائی سے گفتگو، (انٹرویو)، عصمت چغتائی نمبر، (دسمبر 1991)، اردو ماہنامہ، مکالمات، دہلی، ص22)

عصمت چغتائی نے فلم 'جنون' (1978) میں پنڈت ستیہ دیو دوبے کے ساتھ مکالمہ لکھا تھا۔ جسے ششی کپور نے پروڈیوس کیا تھا اور شیام بنیگل نے اس کی ہدایت کی تھی۔ یہ فلم 1857 کے باغیوں پر مبنی ہے۔ اس فلم میں عصمت چغتائی نے ایک بڑھیا کا مختصر کردار ادا کیا تھا۔ اپنی اداکاری کے متعلق ان کی رائے، انھیں کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

''اس بڑھیا کا رول پہلے ایک اور آرٹسٹ کو دیا گیا تھا۔ لیکن وہ مرنے سے بہت ڈرتی تھی۔ اس فلم میں اسے ایک منزل پر مرجانا تھا۔ اور اتفاق دیکھو وہ فلم میں ادھورا کام چھوڑ کر مر گئی۔ یعنی مرنے کی اداکاری کرنے سے پہلے ہی۔ شیام بنیگل نے ایک روز اچانک مجھے وہی رول آفر کر دیا۔ میں تو بھئی موت ووت سے بالکل نہیں ڈرتی۔ کل کی آتی۔ آج آجائے۔ میں نے جھٹ اس رول کو قبول کرلیا۔'' بحوالہ جگدیش چندر ودھاون، عصمت چغتائی: شخصیت اور فن، ص195)

فلم 'گرم ہوا' (1973) عصمت چغتائی کی غیر اشاعتی کہانی پر مبنی ہے۔ کیفی اعظمی اور شمع زیدی نے اسکرین پلے لکھا۔ فلم کی ہدایت ایم ایس ستھیو نے کی ہے۔ اس کی کہانی تقسیم ہند کے فسادات پر مبنی ہے۔ فلم میں بلراج ساہنی (سلیم مرزا)، اے کے ہنگل (اجمانی صاحب)، گیتا سدھارتھ (آمنہ مرزا)، فاروق شیخ (سکندر مرزا) اور دینا ناتھ زتشی (حلیم) وغیرہ نے مرکزی کردار ادا کیے۔ اس فلم کو متعدد اعزازات سے نوازا گیا۔ فلم فیئر ایوارڈ (1975) میں اس فلم کو بہترین مکالمہ (کیفی اعظمی)، بہترین اسکرین پلے (کیفی اعظمی اور شمع زیدی) اور بہترین کہانی (عصمت چغتائی) کے لیے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ نیشنل فلم ایوارڈ (1974) میں اس فلم کو قومی اتحاد کے لیے بیسٹ فیچر فلم کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

عصمت چغتائی کے ناول 'ضدی' کا مرکزی کردار پورن، انتہائی خوش مزاج اور باذوق ہے لوگوں کو ہنسنا اور ہنسانا اس کا واحد مقصد ہے لیکن آشا کے چلے جانے کے بعد اسے کافی مایوسی ہوئی اور وہ اکثر غمزدہ رہنے لگا۔ عصمت نے پورن کے غم اور اضطراب کو انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ عصمت نے اس کردار کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کے بندھے ٹکے اصولوں اور تصورات پر گہرا طنز کیا ہے۔ عصمت کا یہی فن ناول کو قابل قدر بناتا ہے۔ 'ضدی' کے متعلق عصمت کی رائے کچھ اس طرح ہے:

''ناول ضدی پہلے فلم کے لیے لکھا گیا تھا جسے ہم نے بمبئی ٹاکیز میں محسن عبداللہ کے پاس بھیج دیا۔ انھوں نے ہمارا اسکرپٹ اٹھا کر پھینک دیا پھر ہم نے اس کہانی کو ناول کے فارم میں لکھ دیا مکھر جی نے اس کی کہانی سنی، انھیں بے حد پسند آئی انھوں نے اس پر فلم بناڈالی یہ فلم زبردست طریقے پر ہٹ ہوئی۔'' (یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، طاہرہ مسعود، ص 51-350)

عصمت چغتائی کے مذکورہ ناول پر مبنی فلم 'ضدی' 1948 میں بنائی گئی تھی۔ اس فلم میں شاہد لطیف نے بحیثیت ڈائریکٹر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ اس فلم کو بمبے ٹاکیز نے پروڈیوس کیا تھا۔ اس کے اسٹار کاسٹ دیوانند اور کامنی کوشل تھے۔ دیوانند نے اس فلم سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا۔ اس کے ذریعے دیوانند، کامنی کوشل اور پران کو فلم انڈسٹری میں مقام بنانے میں مدد ملی۔ اس فلم میں کشور کمار اور لتا منگیشکر نے بھی اپنا پہلا نغمہ 'کیوں آیا رے' رکارڈ کیا۔ عصمت چغتائی نے مذکورہ فلموں کے علاوہ 'فریب' (1953)، جواب آئے گا (1968) اور 'مائی ڈریمس' (1975۔ ڈاکومینٹری) کی ہدایت کی۔ انھوں نے فلم 'سونے کی چڑیا' (1958) کا اسکرین پلے اور فلم 'بزدل' کی کہانی لکھی تھی۔ عصمت چغتائی کو یہ احساس تھا کہ ادب اور فلم کے تقاضے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں کہانی کار، فلم ساز اور ہدایت کار کی رہنمائی کے تابع رہتا ہے۔ بقول عصمت چغتائی:

''فلموں کے لیے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بے باکی کی دھونس چلتی ہے، نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہیے جو چھپّر پھاڑ کے دولت لائے۔

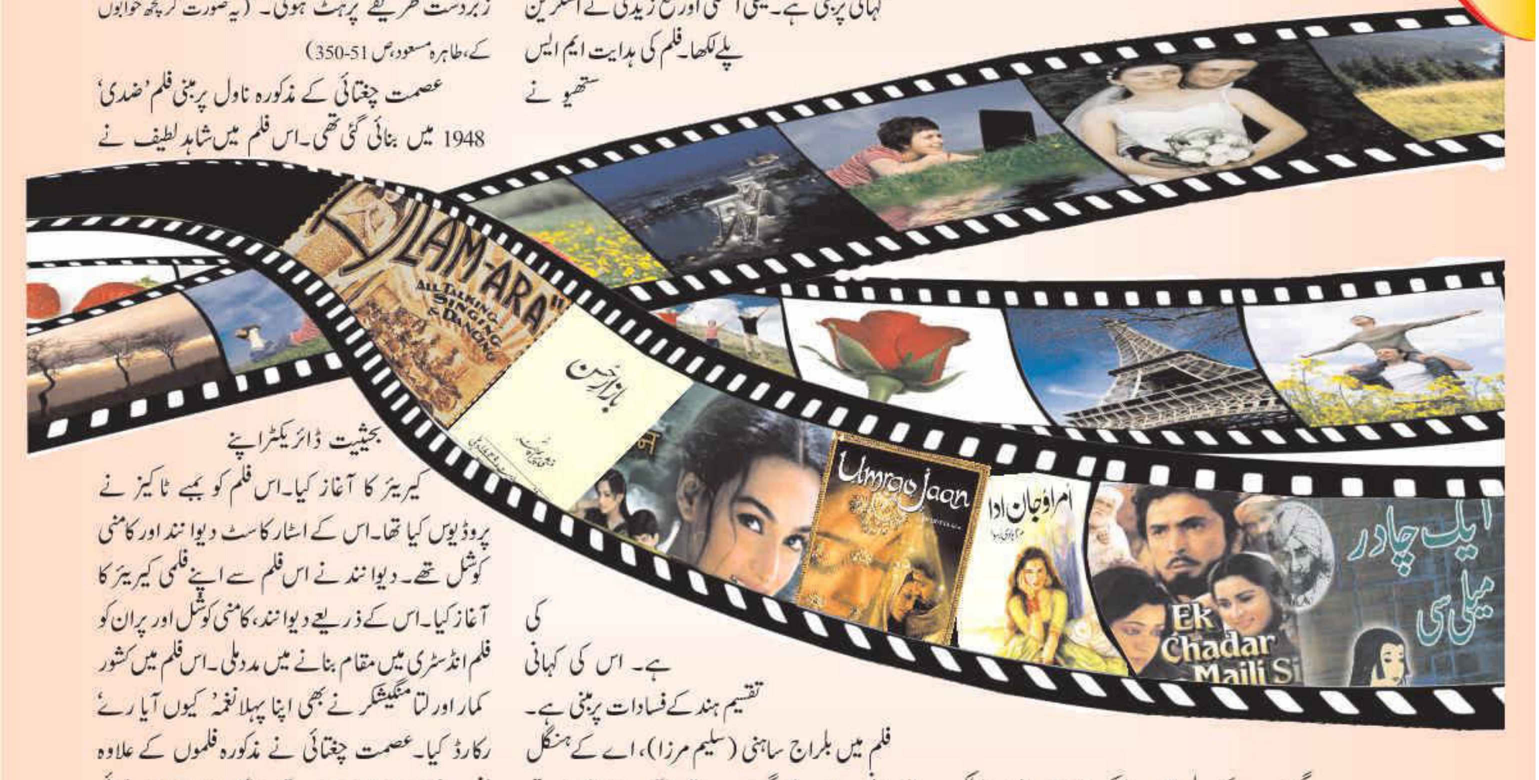

یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا۔ لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔'' (عصمت چغتائی: بچپن اور خاندانی ماحول، عصمت چغتائی نمبر (دسمبر 1991)، اردو ماہنامہ مکالمات، دہلی، ص 48)

یہی وجہ ہے کہ بہت سے ادباء نے فلم انڈسٹری کو یا تو خیر باد کہہ دیا یا پھر اسی رنگ میں رنگ گئے۔ جن ادبی تخلیقات پر فلمیں بنائی گئیں، ان کی روح سے چھیڑ چھاڑ کی گئی اور انھیں فلم کے تقاضے کے پیش نظر ڈھالا گیا۔ اس طرح اردو کی متعدد تخلیقات فلم کے تجارتی جبر کی شکار ہوئیں۔

شوکت تھانوی کے ناول 'الٹی گنگا' پر مبنی فلم 'نیند ہماری خواب تمھارے' (1966) فلم ساز ہنس چودھری نے بنائی تھی۔ جس کی ہدایت شیو ساہنی نے کی تھی۔ فلم میں ششی کپور (انور فاروقی)، نندا (نشاد)، بلراج ساہنی (خان بہادر)، ششی کلا (مس پال)، اوم پرکاش (نواب عظمت اللہ)، راجیند رناتھ (شبّو) اور نروپا رائے نے کردار ادا کیے تھے۔

علیم مسرور کے ناول 'بہت دیر کر دی' پر مبنی فلم 'طوائف' (1985) میں آر سی کمار نے بنائی تھی۔ جس کی ہدایت بی آر چوپڑا نے کی تھی۔ فلم میں اسکرین پلے راہی معصوم رضا نے لکھا تھا۔ لیڈ رول رتی اگنی ہوتری (سلطانہ)، رشی کپور (محمد علی خان)، پونم ڈھلن (کائنات مرزا)، دیپک پراسر (سلیمان)، قادر خان (رحیم شیخ) اور اشوک کمار (مسٹر نگم) نے ادا کیے۔ یہ فلم باکس آفس پر بہت کامیاب ہوئی۔ اس فلم کو بہترین مکالمہ کے لیے راہی معصوم رضا اور بہترین کہانی کے لیے علیم مسرور کو فلم فیئر ایوارڈ (1986) سے نوازا گیا۔

راجندر سنگھ بیدی کے فلمی سفر کا آغاز ڈی ڈی کشیپ کے بینر فیمس پکچرز کے تحت بطور کہانی کار اور مکالمہ نگار فلم 'بڑی بہن' (1959) سے ہوا۔ ان کی دوسری فلم 'داغ' (1952) تھی۔ جس کی ہدایت امیہ چکرورتی نے کی۔ انھوں نے بمل رائے کی فلم 'دیوداس' (1955) اور فلم 'مدھومتی' (1958) کے مکالمے لکھے۔ فلم 'مدھومتی' کے لیے انھیں بہترین مکالمہ نگار کے فلم فیئر ایوارڈ (1959) سے نوازا گیا۔ بیدی نے رشی کیش مکھرجی کے لیے تقریباً ایک درجن سے زائد فلمی کہانیاں لکھیں۔ ان میں انورادھا (1960)، انوپما (1966) اور ستیہ کام (1970) وغیرہ کافی مقبولیت کی حامل ہیں۔ فلم 'ستیہ کام' بہت کامیاب رہی۔ اس کے لیے بیدی کو بہترین مکالمہ نگار کا فلم فیئر ایوارڈ (1971) سے نوازا گیا۔

بیدی نے سہراب مودی کی فلم 'مرزا غالب' (1954) کا مکالمہ لکھا۔ جس کی کہانی سعادت حسن منٹو نے تقسیم ہند اور پاکستان ہجرت سے قبل لکھی تھی۔ لیکن ہندوستان میں رہتے ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ فلم کے ہیرو بھارت بھوشن (مرزا غالب) اور ہیروئن ثریا (موتی بائی)، نگار سلطانہ (غالب کی بیوی)، مراد (مفتی صدرالدین)، مکری (متھرا داس) اور افتخار (بہادر شاہ ظفر) نے اپنی اداکاری کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔ یہ فلم باکس آفس پر بہت کامیاب رہی۔ اسے نیشنل فلم ایوارڈ (1954) برائے بہترین فیچر فلم اور فلم فیئر ایوارڈ برائے بہترین آرٹ ڈائریکشن سے نوازا گیا۔ بیدی نے اپنی ذاتی کاوش سے بھی کئی فلمیں بنائیں۔ ان میں 'گرم کوٹ' (1955)، پھاگن (1958)، رنگولی (1962) دستک (1971) اور آنکھن دیکھی (1978) اہم ہیں۔ فلم 'دستک' باکس آفس پر بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ یہ فلم ان کے مشہور ریڈیائی ڈرامہ 'نقلِ مکانی' پر مبنی تھی۔ اس فلم کے لیے سنجیو کمار اور ریحانہ سلطان کو بہترین اداکاری اور مدن موہن کو بہترین موسیقی کے لیے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بقول خواجہ احمد عباس:

''اس زمانے میں 'فلم فورم' فلم سوسائٹی نے نئے ہدایت کاروں کو انعام دینے کا پھالکے ایوارڈ کا سلسلہ نہیں شروع کیا تھا۔ اگر کر دیا ہوتا تو بیدی کو یقینی طور پر اس سال کا بہترین نیا ہدایت کار مانا جاتا۔'' (بیدی صاحب کی فلمی زندگی، خواجہ احمد عباس، عصری آگہی، راجندر سنگھ بیدی خصوصی شمارہ، دہلی، ص 166)

راجندر سنگھ بیدی کے شاہکار ناول 'ایک چادر میلی سی' پر مبنی فلم بعنوان 'رانو' بنانے کا فیصلہ شمی کپور کی بیوی اور مشہور اداکارہ گیتا بالی نے کیا۔ اس کے لیے انھوں نے پنجاب کی دیہاتی عورتوں کے ساتھ دو سال گزارے۔ لیکن ان کی یہ بدقسمتی رہی کہ وہ جب بمبئی واپس آئیں تو بیمار پڑیں اور موت ہو گئی۔ یہ فلم نہیں بن سکی۔ اس ناول پر مبنی ایک فلم 'مٹھی بھر چاول' (1978) کے نام سے بنی۔ پاکستانی اداکارہ سنگیتا نے اس فلم کی ہدایت کی اور رانو کے کردار کو خود ادا کیا۔ یہ فلم باکس آفس پر بہت کامیاب ہوئی۔

ہندوستان میں بھی اس ناول پر برسوں بعد فلم 'ایک چادر میلی سی' (1986) میں بنائی گئی۔ جس میں رانو کا کردار مشہور اداکارہ ہیما مالنی نے ادا کیا۔ اس فلم کی ہدایت سکھونت ڈھڈّا نے کی تھی۔ اسکرین پلے پھَنی مجومدار اور ماکھن سنگھ نے لکھا۔ مدن جوشی نے مکالمے لکھے۔ انو ملک نے موسیقی سے سجایا۔ لیڈ رول میں ہیما مالنی کے علاوہ رشی کپور (منگل)، پونم ڈھلّن (راجی)، اے کے ہنگل (حضور سنگھ) اور کل بھوشن کھر بندا (ترلوکا) وغیرہ تھے۔ یہ فلم پنجابی متوسط طبقے کے خاندان اور روایتوں کی عکاس ہے۔

مختصر یہ کہ اردو فکشن پر مبنی کثیر تعداد میں فلمیں بنائی گئیں، جو کافی مقبول رہیں۔ فلم انڈسٹری میں ابتدا سے ہی ترقی پسند ادیبوں کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ سنیما میں ان کی ادبی خدمات، اردو کا عظیم سرمایہ ہیں۔ دراصل فلم، سمعی وبصری ذرائع ابلاغ کا ایک طاقتور میڈیم ہے، جس کا سماج پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ سماج پر فلم کے اثرات کا عالم یہ ہے کہ ادب کی رسائی جہاں تک ممکن نہیں ہوتی، وہاں فلمیں اپنے اثر کے ساتھ پہنچ جاتی ہیں۔ فکشن کے مطالعے کے مقابلے اسے تصویری شکل میں دیکھنے میں دلچسپی زیادہ ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ادب کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے مخصوص زبان کے رسم الخط کو جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ فلم کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے رسم الخط کے علم کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا ویژول میڈیم میں زبان کے سمجھنے کا عمل موثر اور تیز رفتار ہوتا ہے۔ فلموں میں اردو شاعری اور مکالمے کی بہتات ہوتی ہے۔ ایسے گیتوں اور مکالموں کو وہ افراد بھی سمجھ پاتے ہیں، جو اردو زبان سے واقف نہیں ہوتے۔ ایسے بہت سے افراد مل جائیں گے، جنھوں نے فلمی نغموں اور مکالموں سے اردو زبان سیکھی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ زبان کبھی مر نہیں سکتی، جسے عوام بولتی اور سمجھتی ہے۔ اردو زبان کے فروغ میں جتنا اردو ادبا و شعرا کا حصہ ہے۔ اسی طرح اردو کو عوامی بول چال کی زبان بنانے میں فلموں کا بھی خصوصی کردار رہا ہے۔

فلم کی حیثیت تہذیبی دستاویز کی ہوتی ہے۔ جس میں تہذیبی آداب و اطوار، رسم و رواج، خورد و نوش اور طرزِ لباس وغیرہ کی موثر ترجمانی ملتی ہے۔ فلمیں سماجی تبدیلیوں کو بہت جلد محسوس کر لیتی ہیں اور معاشرے میں نئے رجحان پیدا کرتی ہیں۔ فلمیں تہذیب اور زبان کو پروان چڑھانے میں نمائندہ کردار ادا کرتی ہیں۔ آج عوامی سطح پر اردو زبان کی مقبولیت میں سنیما کا انتہائی موثر رول ہے۔ اردو کی متعدد داستانیں، ڈرامے، ناول اور کہانیاں فلم انڈسٹری کا عظیم سرمایہ ہیں۔ ایک زمانے تک فلموں کی کہانی، اسکرین پلے اور مکالمے کی تکمیل میں اردو ادیبوں کا اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے جس طمطراق سے فلم انڈسٹری کو گلے لگایا، یقیناً آج اس میں شدت سے کمی کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل اردو فکشن کی فلمی میراث، انتہائی وسیع اور تابناک ہے۔ جس کی شناخت، تحفظ اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگی، اکیسویں صدی کی اہم ضرورت ہے۔

■

Dr. Ahmad Khan
Assit. Prof., Dept. of Urdu, Zakir Husain Delhi College, Delhi - 110006
Ph.9868701491/9540911224
Email: ahmadk71@yahoo.co.in

محمد عرفان

ادبی کوئز

(1) ان میں سے کون سی کتاب شبلی نعمانی کی نہیں ہے؟
(الف) حیات سعدی (ب) الفاروق
(ج) سوانح رومی (د) الغزالی

(2) نیچرل شاعری کا نظریہ کس نقاد نے پیش کیا؟
(الف) آل احمد سرور (ب) شبلی نعمانی
(ج) مولانا حالی (د) کلیم الدین احمد

(3) ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے'' یہ قول کس کا ہے؟
(الف) محمود شیرانی (ب) میر حسن
(ج) محمد حسین آزاد (د) سید سلیمان ندوی

(4) 'سائنٹفک سوسائٹی' کس نے قائم کی؟
(الف) جان گل کرائسٹ (ب) آزاد
(ج) کرنل ہالرائڈ (د) سرسید احمد خان

(5) رسالہ 'اسباب بغاوتِ ہند' کس نے تصنیف کیا؟
(الف) حالی (ب) ڈپٹی نذیر احمد
(ج) محسن الملک (د) سرسید احمد خان

(6) 'حیاتِ جاوید' کس کے حالاتِ زندگی پر مبنی ہے؟
(الف) ضیاءالدین انصاری (ب) جاوید اقبال
(ج) مرزا غالب (د) سرسید احمد خان

(7) اردو غزل کو 'بے وقت کی راگنی' کس نے کہا؟
(الف) کلیم الدین احمد (ب) جوش ملیح آبادی
(ج) مولانا حالی (د) مولانا آزاد

(8) ان میں سے حالی کی تصنیف کون سی ہے؟
(الف) بنات النعش (ب) نصیحت کا کرن پھول
(ج) مجالس النساء (د) توبۃ النصوح

(9) کس کی نظمیں عملی زندگی میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں؟
(الف) نظیر احمد (ب) الطاف حسین حالی
(ج) میراجی (د) نظم طباطبائی

(10) کون سی کتاب محمد حسین آزاد کی نہیں ہے؟
(الف) آبِ حیات (ب) دربارِ دربار
(ج) دربارِ اکبری (د) سخندانِ فارس

(11) ''یہ طرز خاص میری دولت تھی سوایک ظالم 'پانی پت' انصاریوں کے محلے میں رہنے والا لوٹ لے گیا'' غالب نے اپنے خط میں یہ بات کس کے لیے کہی ہے؟
(الف) سرفراز حسین (ب) آزاد
(ج) میر نصیرالدین (د) الطاف حسین حالی

(12) 'سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر' کس کا مضمون ہے؟
(الف) حبیب الرحمٰن خاں (ب) حالی
(ج) شبلی نعمانی (د) وقارالملک

(13) حالی کے نزدیک کون سی صنف سخن سب سے زیادہ مفید اور کارآمد ہے؟
(الف) مثنوی (ب) غزل
(ج) مرثیہ (د) قصیدہ

(14) کس ناول نگار نے سب سے پہلے تعلیم نسواں کو موضوع بنایا؟
(الف) پریم چند (ب) عبدالحلیم شرر
(ج) ڈپٹی نذیر احمد (د) مرزا ہادی رسوا

(15) حالی نے اردو نثر کا مورث اعلیٰ کسے قرار دیا؟
(الف) سرسید احمد خاں (ب) غالب
(ج) نذیر احمد (د) میر مہدی مجروح

(16) پہلے حالی کا تخلص خستہ تھا، کس کے کہنے پر انھوں نے تبدیل کر دیا؟
(الف) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (ب) شبلی نعمانی
(ج) مرزا غالب (د) میر مہدی مجروح

(17) سرسید احمد خاں نے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کب قائم کی؟
(الف) 1862 (ب) 1864
(ج) 1865 (د) 1866

(18) حالی نے شاعری کے لیے کون سی تین شرطیں لازمی قرار دی ہیں؟
(الف) تخیل، محاکات، کائنات کا مطالعہ
(ب) محاکات، رعایت لفظی، مبالغہ
(ج) تخیل، مبالغہ، محاکات
(د) تخیل، مطالعہ کائنات، تفحص الفاظ

(19) ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا
غالب کی وفات پر یہ شعر کس نے کہا؟
(الف) شبلی (ب) شیفتہ
(ب) حالی (د) مومن

(20) شبلی کی تصنیف 'سیرۃ النبی' کی تکمیل کس نے کی؟
(الف) شاہ رفیع الدین (ب) ابوالحسن ندوی
(ج) ڈپٹی نذیر احمد (د) سید سلیمان ندوی

(21) رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کے پہلے مدیر کون ہیں؟
(الف) محسن الملک (ب) وقارالملک
(ج) سرسید احمد خاں (د) شبلی نعمانی

(22) فارسی زبان و ادب پر محمد حسین آزاد کی مشہور تصنیف کون سی ہے؟
(الف) آبِ حیات (ب) سخندانِ فارس
(ج) دربارِ اکبری (د) قند پارسی

(23) 'زمستان' کس کی نظم ہے؟
(الف) محمد حسین آزاد (ب) حالی
(ج) اسمٰعیل میرٹھی (د) سرور جہان آبادی

(24) اردو نثر کے ترسیلی امکانات اور اس کی ابلاغی قوتوں کا احساس کس نے دلایا؟
(الف) الطاف حسین حالی (ب) مولانا ابوالکلام آزاد
(ج) سرسید احمد خاں (د) شبلی نعمانی

(25) مضمون 'ترقی علم انشا' کے مصنف کا کیا نام ہے؟
(الف) نذیر احمد (ب) نیاز فتح پوری
(ج) سرسید احمد خاں (د) وقارالملک

(26) ''سرسید نے آورد اور تصنع سے بچنے کے لیے گرامر کی بھی پرواہ نہ کی۔'' کس کا قول ہے؟
(الف) شبلی نعمانی (ب) حالی
(ج) نذیر احمد (د) چراغ علی

(27) یہ کس نے کہا تھا ''غزل کا خمیر عشق و محبت ہے''
(الف) علامہ شبلی نعمانی (ب) حالی
(ج) محمد حسین آزاد (د) احتشام حسین

(28) 'تاریخ علم الکلام' کا مصنف کون ہے؟
(الف) حالی (ب) شبلی
(ج) شرر (د) سرسید

(29) محمد حسین آزاد کی تمثیل 'انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'' کس انگریز مصنف کی تمثیل سے ماخوذ ہے؟
(الف) جانسن (ب) سررچرڈ اسٹیل
(ج) جوزف ایڈیسن (د) جاناتھن سوفٹ

(30) ذیل میں سے سرسید کے کون سے دو مضامین اسپکیٹیٹر سے ماخوذ ہیں؟
(الف) سفر، دردمندی (ب) ریاکاری، خاشامد
(ج) امداد باہمی، خیر سگالی
(د) نوآبادیات، صدائے درد

(31) سرسید کی معروف تصنیف 'سرکشی ضلع بجنور' کس سنہ میں شائع ہوئی؟
(الف) 1858 (ب) 1905
(ج) 1800 (د) 1825

(32) غیر متوازن روحانی تصورات کے خلاف کس نے آواز بلند کی؟
(الف) شبلی (ب) حالی
(ج) سرسید (د) نذیر احمد

(33) بعض لوگ کس کو 'اخوان الشیاطین' کا نمائندہ کہتے تھے؟
(الف) شبلی (ب) ذکاءاللہ
(ج) سرسید (د) حسن الملک

(34) 1904 میں کسے شمس العلما کا خطاب ملا تھا؟
(الف) محمد حسین آزاد (ب) اکبرالہ آبادی
(ج) حالی (د) اقبال

(35) ''زمانے نے اس کی سحر بیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا'' مثنوی سحرالبیان سے متعلق یہ بیان کس کا ہے؟
(الف) مرزا مظہر جانِ جاناں (ب) محمد حسین آزاد
(ج) میرامن (د) سرسید

(36) کون سی تصنیف شبلی کی نہیں ہے؟
(الف) المامون (ب) علم الکلام
(ج) شمس الضحیٰ (د) الغزالی

(37) 'نظم دل افروز' کس شاعر کا شعری مجموعہ ہے؟
(الف) محمد حسین آزاد (ب) الطاف حسین حالی
(ج) سرور جہان آبادی (د) چکبست

(38) شبلی نعمانی کی تصنیف 'شعرالعجم' کتنی جلدوں پر مشتمل ہے؟
(الف) چار (ب) پانچ
(ج) چھ (د) سات

(39) شبلی نے کس کی موت پر مرثیہ کہا ہے؟
(الف) دوست کا سانحۂ ارتحال
(ب) والدہ کی یاد میں
(ج) سرسید کا انتقال
(د) چھوٹے بھائی کی موت

(40) کس کا تعلق علم لسانیات سے نہیں ہے؟
(الف) نذیر احمد (ب) مسعود حسین خاں
(ج) سرسید احمد خاں (د) شوکت سبزواری

(41) کس نے ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا ہے؟
(الف) محمد حسین آزاد (ب) حالی
(ج) شبلی (د) لالہ سری رام

(42) انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری کا نام؟
(الف) سرسید (ب) حالی
(ج) شبلی (د) مولوی عبدالحق

(43) محمد حسین آزاد کے متعلق کس نے لکھا ہے کہ وہ گپ بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے؟
(الف) سرسید (ب) محسن الملک
(ج) حالی (د) شبلی نعمانی

(44) مسدس مدر جزر اسلام کس کی تخلیق ہے؟
(الف) حالی (ب) شبلی
(ج) آزاد (د) اقبال

(45) 'شعرالعجم' کا موضوع کیا ہے؟
(الف) اردو شاعری (ب) فارسی شاعری
(ج) عربی شاعری (د) ترکی شاعری

(46) 'یادگارِ غالب' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) حالی (ب) شبلی
(ج) آزاد (د) شرر

(47) 'موازنہ انیس و دبیر' کس نے لکھی؟
(الف) مسعود حسن رضوی (ب) علامہ شبلی
(ج) مولوی عبدالحق (د) سرسید

(48) 'آثار الصنادید' کس نے لکھی ہے؟
(الف) سرسید (ب) نذیر احمد
(ج) شبلی (د) ناصح

(49) اردو برج بھاشا سے پیدا ہوئی یہ کس کا نظریہ ہے؟
(الف) محمود شیرانی (ب) شبلی
(ج) محمد حسین آزاد (د) نذیر احمد

(50) بحث و تکرار کس کا مضمون ہے؟
(الف) شبلی (ب) سرسید احمد خاں
(ج) ذاکر حسین (د) قاضی عبدالودود

صحیح جوابات

. الف	2. ج	3. ج	4. د	5. د
6. د	7. ج	8. ج	9. ب	10. ب
11. د	12. ج	13. الف	14. ج	15. الف
16. ج	17. ب	18. د	19. ج	20. د
21. ج	22. ب	23. الف	24. ج	25. ج
26. ب	2. الف	28. ب	29. ج	30. ب
31. الف	32. ج	33. ج	34. ج	35. ب
36. ج	37. الف	38. ب	39. د	40. ج
41. الف	42. ج	43. د	44. الف	45. ب
46. الف	47. ب	48. الف	49. ج	50. ب

Mohd Irfan
Researsh Scholar (Dept of Parsian, Urdu Arabi)
Punjabi University
Patiyala - 147002 (Punjab)

نئی اردو قواعد

مصنف: عصمت جاوید

صفحات: 334، قیمت: 160 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: کوثر مظہری، پروفیسر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

صحیح زبان بولنے اور لکھنے کے لیے قواعد (Grammar) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو میں، اگر ایمانداری سے بات کی جائے تو اس جانب کم توجہ کی گئی۔ زبان کی باریکیوں اور جملوں کی ساخت سے لے کر محاورات اور روزمروں کے صحیح استعمال کے لیے قواعد سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق کے بقول:

''زندہ زبان کے قواعد نویس کو سب سے اول بول چال کا خیال رکھنا چاہیے اور اسی سے قاعدے بنانے چاہئیں۔ (بحوالہ: کتاب ہذا، ص xv)

پہلے اس کتاب کے ابواب ملاحظہ کرلیں:

حصہ اوّل: صوت، باب اول اردو صوتیے

حصہ دوم: صرف، باب دوم: اجزائے کلام، باب سوم: جنس وتعداد۔ زمانہ

حصہ سوم: نحو، باب چہارم: جملہ، باب پنجم: جملے کی ساخت، باب ششم: اردو جملے کی قسمیں

حصہ چہارم: مشتقات ومرکبات، باب ہفتم: تشکیل الفاظ

فہرست اصطلاحات: (1) اردو انگریزی (2) انگریزی اردو

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ قواعد کا آغاز نحو سے ہوتا ہے۔ نحو سے قبل صرف کا بیان کرنے کے ضمن میں عصمت صاحب توجیہ پیش کرتے ہیں:

''ہم نے صرف کے اس حصے کا ذکر جس کا جملے سے گہرا تعلق ہے 'نحو' سے قبل کیا ہے تاکہ اردو نحو کو سمجھنے میں آسانی ہو اور اردو زبان کے لسانی مزاج کا مکمل عرفان حاصل ہو۔'' (کتاب ہذا، ص xxii)

حالانکہ کتاب میں صرف سے بھی پہلے صوت کے ذیل میں اردو صوتیے سے بحث کی گئی ہے۔ صوتیہ جسے انگریزی میں Phoneme کہتے ہیں، اردو میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی حصے میں مصنف نے تفصیل کے ساتھ مصوتوں (Vowels) اور مصمتوں (Consonants) کا بیان کیا ہے۔ قواعد کی قدیم کتابوں میں مصوتے کو حرف علت اور مصمتے کو حرف صحیح سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس جانب بھی عصمت جاوید نے توجہ دلائی ہے اور اس مفروضے کی تردید کی ہے کہ اردو میں حروف علت صرف الف، واؤ اور ی ہیں۔ انھوں نے زیر، زبر اور پیش کو مولوی عبدالحق کے ذریعے حروف علّت کے زمرے میں رکھے جانے کی تائید کی ہے لیکن ساتھ ہی ان کے اس بیان کو کہ الف کی خفیف آواز زبر، زیر کی آواز خفیف 'ای' کی ہوتی ہے اور پیش خفیف 'واؤ' کی آواز دیتا ہے، رد کردیا ہے۔ یائے مجہول (جیسے کھول، بول، ڈھول میں) اور یائے معروف (جیسے تیر، کھیر، جھیل) کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہاں غور طلب ہے کہ رشید حسن خاں اور گوپی چند نارنگ وغیرہ نے تیر اور کھیر وغیرہ میں کھڑی زیر (تیر اور کھیر) کا استعمال کیا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عصمت جاوید نے تو کھیر میں ﹶ اور ي کا استعمال کیا ہے۔ جبکہ نارنگ اور رشید حسن نے ی کے نیچے کھڑی زیر بھی لگائی ہے۔ تو کیا یہاں ﹶ اور دونوں + ي مل کر کھیر بنتی ہے؟ حالانکہ اصول یہ ہے کہ جس حرف پر حرکت ہوگی آواز اُسی میں پیدا ہوگی۔ یہاں آواز کھ میں پیدا ہوتی ہے، ي میں نہیں اس لیے وہاں کھڑی زیر کا موقع نہیں، ہاں اگر اس کا آنا ضروری ہے تو کھ کے نیچے آئے گی۔ عصمت جاوید صاحب نے واؤ معروف کے ذیل میں اوٗن، دُور، حُور (ص: 5) درج کیا ہے۔ کھڑی زیر اور الٹا پیش دونوں کا محل استعمال اب تک کنفیوزن پیدا کرتا رہا ہے۔ یہاں بھی جیسے دُور اور حُور میں 'د' اور 'ح' پر پیش ڈالتے ہیں اوٗن میں الف پر اُلٹا پیش (ٗ) یا پیش (ُ) ڈالنا چاہیے۔ اگر کوئی کہے کہ چونکہ اون میں پہلے الف آتا ہے اس لیے الف پر پیش یا اُلٹا پیش نہیں ڈالا جاتا تو پھر اَیسے اور اَور میں الف کے اوپر زبر کیسے ڈالا جاسکتا ہے؟ عصمت جاوید نے بڑی محنت اور دقت ریزی کے ساتھ مثالوں کی روشنی میں گیارہ مصوتوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح اردو کے سات مختلف مصمتوں کا ذکر کیا ہے۔ یہاں انھوں نے اردو صوتیوں سے الگ کرنے کے لیے کچھ آوازوں کی مماثلت کے سبب انھیں تحریہ سے موسوم کیا ہے۔ جیسے: ث اور ص، ذ، ض اور ظ، ط اور ت، ح اور ہ، ع اور ﹷ (زبر) کی ہوتی ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ جن کی تعلیم مدرسے کی ہوتی ہے وہ کم از کم 'ع' کو تو ادا ضرور کرتے ہیں۔ ساتھ ہی کچھ الفاظ ایسے ہیں جہاں 'ع' کی ہلکی سی آواز ضرور پیدا ہوتی ہے جو الف یا زبر سے مختلف ہوتی ہے۔ جیسے تعارف اور معلوم میں 'ع' کی ادائیگی خفیف طور پر ہی سہی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اردو کی حد تک اس پر بہت زیادہ اصرار نہیں کیا جاسکتا۔ معرفت اور معبود میں ہم ایک دم سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ 'ع' الف یا ﹷ (زبر) کی آواز کے مساوی ہے۔ عصمت جاوید نے خود بھی کچھ الفاظ لکھے ہیں اور کہا ہے کہ انھیں اردو کے صوتی نظام سے مکمل طور پر خارج بھی نہیں کیا جاسکتا ہے جیسے: سماعت، جماعت، تعارف، تعلق، لعاب، مسعود، سعید وغیرہ۔ حالانکہ ان سب الفاظ پر عصمت جاوید کا پہلے والا مفروضہ بھی لاگو ہوسکتا ہے۔

اس کتاب کے دوسرے باب میں اسم، فعل، حرف، صفت، اور ضمیر وغیرہ کے حوالے سے تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں صرفیہ سے لے کر جنس، تعداد اور زمانہ کے احوال سے تجزیاتی انداز میں مثالوں کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ جنس اور تعداد یعنی واحد اور جمع کے حوالے سے جو مباحث ہوتے رہے ہیں وہ اور دوسرے ممکنہ مباحث سامنے آئے ہیں۔ عصمت جاوید نے اس باب میں حد درجہ محنت شاقہ سے کام لیا ہے۔

صرف کے بعد حصہ سوم میں باب چہارم کے ذیل میں جملہ اور پھر باب پنجم میں جملے کی ساخت، اس کی قسمیں اور یہ سلسلہ باب ششم تک کیا گیا ہے۔ دراصل کسی بھی زبان میں جملوں کی ساخت یعنی syntax کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اسی لیے جب کسی کے بارے میں تضحیک کے طور پر کہنا ہوتا ہے تو یہ کہہ دیا جاتا ہے: ایک جملہ تو لکھنا آتا نہیں اور بڑے ادیب بنے پھرتے ہیں۔ گویا سارا کھیل ہی جملوں کا ہے۔ معروف اور

مجہول جملے یعنی Active اور Passive جملوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح مرکب اور پیچیدہ جملے (Compound & Complex Sentences) سے بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مثالوں کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے حصہ چہارم میں باب ہفتم کے ذیل میں مشتقات اور مرکبات کو مثالوں کی مدد سے سمجھایا گیا ہے۔ آج کے تناظر میں بات کی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر مشتقات اور مرکبات میں دل چسپی ہو اور اس عمل پر دسترس ہو تو اصطلاحات بنانے میں آسانیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ لیکن ہم نے اردو زبان کو لقمہ تر تصور کرلیا ہے اور قواعد اور زبان کے رموز سے دوری اختیار کرلی ہے جس کے سبب زبان تنزل کا شکار ہوتی جارہی ہے۔ عصمت جاوید کی کتاب اساتذہ اور طلبا دونوں کے لیے اہم اور مفید ہے۔ آخر میں انگریزی اور اردو میں رائج اصطلاحات کے متبادل بھی دیے گئے جو کہ ہر لحاظ سے مفید ہے۔ کتاب خوب صورت چھپی ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔

محمد حسین آزاد (مونوگراف)

مصنف: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 152، قیمت: 85 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: فردوس بانو فلاحی، A-187/3، دوسری منزل، شاہین باغ، نئی دہلی

قدیم ادبا و شعرا پر مونوگراف کی اشاعت قومی اردو کونسل کے سلسلۂ مطبوعات کی ایک کڑی ہے۔

ڈائرکٹر قومی اردو کونسل، پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب کے پیش لفظ کے بعد قاسمی صاحب کے مجوزہ دس عنوانات کے تحت سات ذیلی عناوین ہیں: (1) نسلی وراثت (2) آزاد کی ولادت کا زمانہ (3) تعلیم و تعلم (4) شیخ ابراہیم ذوق سے شرف تلمذ (5) مولوی محمد باقر کی سزائے موت (6) غریب الوطنی اور بے سروسامانی کے شب و روز (7) تصنیفی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز۔

دوسرا عنوان 'انجمن پنجاب اور جدید نظم کی سرگرمیاں' ہے۔ اس میں انجمن پنجاب اور جدید نظم کے اسباب و محرکات، نظموں کے موضوعات نیز مناظمے و مشاعرے کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ انگریزی حکام سے آزاد کے اختلافات اور اختلافات کے اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا عنوان 'آزاد کا سفر ایران' ہے۔ ایران کے سفر کے ارادے و تیاری میں آزاد کو جن مشکلات و پریشانیوں کا سامنا ہوا اور سفر کی اجازت میں جو دقت پیش آئی، قاسمی صاحب نے اس کی وضاحت کی ہے۔ دورانِ سفر جن جن مقامات پر قیام کیا اور جہاں جہاں کی سیر کی، اس کی تفصیلات ہیں۔ تعمیرات و مزارات اور شخصیات سے ملاقات کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سفر ایران و افغانستان کی پریشانیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

چوتھا عنوان 'محمد حسین آزاد: عالم جنون میں' ہے۔ عالم جنون میں آزاد کے علم و کمال اور مشاہیر سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ پانچواں عنوان 'تصنیفات و تالیفات' ہے۔ شروع کے تین صفحات میں محمد حسین آزاد کی مطبوعہ کتابوں کا تعارف ہے اس کے بعد ان کی چالیس کتابوں کی فہرست ہے اس کے علاوہ علاحدہ پانچ غیر مطبوعہ کتابوں کے مسودات کی فہرست ہے۔

چھٹا موضوع 'زندگی کے آخری ایام اور وفات' ہے۔ اس میں مختصراً حالات درج کیے گئے ہیں۔ وفات اور تدفین پر گفتگو کی گئی ہے۔ سوگوار شہر لاہور اور اس کے مکینوں کی دلی کیفیات اور جنازے کا تذکرہ ہے۔ آخر میں آزاد پر لکھے گئے حالی کا مرثیہ جو 'قطعۂ تاریخ' ہے رقم ہوا ہے۔ نیز اس کی عظمت و اہمیت پر قاسمی صاحب کی دو سطر میں توصیفی تحریر ہے۔ ساتواں موضوع 'محمد حسین آزاد اور روایتی اردو شعریات' ہے۔ قاسمی صاحب کی یہ گفتگو 13 صفحات میں مکمل ہوتی ہے۔ اردو کی روایتی شاعری پر آزاد کے تصورات پر تحریریں ہیں اور ان کی تصانیف سے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔ خاص طور پر آبِ حیات، نگارستانِ فارس اور سخن دان فارس سے اقتباسات لیے گئے ہیں۔ قاسمی صاحب کی تنقیدی نظر نے آزاد کی تصانیف کے اقتباسات کے علاوہ ان کے لکچر 'نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات' سے چند معنی خیز اقتباسات کا انتخاب کیا ہے، جن سے شعر، شاعر اور تخلیقات پر آزاد کے تنقیدی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ آزاد کے لکچر کو زمانی اعتبار سے تقدم حاصل ہے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب آزاد کے مذکورہ لکچر کو نظم جدید کی تحریک کا منشور اور پیش خیمہ بھی قرار دیتے ہیں۔

آٹھواں موضوع 'اردو تنقید، محمد حسین آزاد اور نوآبادیاتی مضمرات' ہے جس میں قاسمی صاحب نے محمد حسین آزاد کی بحیثیت نقاد اور ان کی تنقید نگاری پر بحث کی ہے اور جا بہ جا ان کی تحریروں سے اقتباسات نقل کیے ہیں اور مشرقی و مغربی تصورات شعر کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی شعریات سے آزاد پر اثرات اور اسالیب اظہار پر روشنی ڈالی ہے۔ نواں عنوان 'محمد حسین آزاد کی نمائندہ کتابوں کا تعارف' ہے۔ اس کے بعد آزاد کی چھ نمائندہ کتابوں پر تبصرہ ہے۔ 1: آبِ حیات، 2: نیرنگ خیال، 3: سخن دان فارس، 4: دربارِ اکبری، 5: دیوانِ ذوق، 6: نظم آزاد۔ آخری دسواں موضوع 'آزاد کی نمائندہ کتابوں کے منتخب اقتباسات' ہے۔ اس موضوع کے تحت چار کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

1: آبِ حیات، 2: نیرنگ خیال، 3: سخن دان فارس، 4: دربارِ اکبری۔ مذکورہ چاروں کتابوں سے منتخب اقتباسات تقریباً 12 صفحات میں ہیں۔ مشہور انشائیہ 'انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا' بھی نقل کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں پچھلے کور پیج پر محمد حسین آزاد اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا مختصراً تعارف کرایا گیا ہے۔

فغان دھلی

مرتب: تفضل حسین کوکب

صفحات: 111، قیمت: 70 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو دلّی

مبصر: خلیق الزماں نصرت، فلیٹ نمبر 15، سائی نگر کالونی، بھیونڈی، مہاراشٹر

پرانی کتابیں نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ بڑی مشکل سے کسی لائبریری میں کوئی کاپی مل جاتی ہے۔ بھلا ہو قومی اردو کونسل دلّی کا جس نے ایسی ایسی ہزاروں کتابیں شائع کرکے پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دی ہیں، جنھیں دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں تھیں۔

'فغان دہلی' کے ساتھ بھی وہی ہوا۔ 1857 کی بغاوت کے نتیجے میں دلّی برباد ہوگئی۔ فغانِ دہلی ایک داستان ہے۔ تفضل حسین کوکب نے ایسی دلی کے حالات کو یکجا کرکے 1863 میں شائع کیا تھا۔ تفضّل حسین کوکب غالب کے شاگرد تھے۔ اس کا پیش لفظ قربان علی سالک نے لکھا ہے۔ اس لیے بھی اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ قومی اردو کونسل کے اس ایڈیشن کا مقدمہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے۔ اس سے اس کتاب کی تاریخی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ فغانِ دہلی میں چھوٹے بڑے سبھی شاعروں کا کلام شامل ہے۔ اکثر محققوں نے بہادر شاہ ظفر کے نام سے کئی غزلیں اور اشعار منسوب کردیے ہیں۔ جن میں کچھ دلّی کی تباہی کا اشارہ ہے۔ میرا ان لوگوں کو کہنا یہ ہے کہ اگر ''لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں'' ''نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں...... جیسی خوب صورت غزلیں بہادر شاہ ظفر کی ہوتیں تو تفضّل حسین کوکب اس کا انتخاب کیوں نہیں کرتے؟

اسی طرح کی ایک غزل 'فغان دہلی' میں شامل ہے اس کا مطلع ہے:

گئی یک بہ یک جو ہوا پلٹ نہیں میرے دل کو قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیان میرا غم سے سینہ فگار ہے

اسے بھی لوگ بہادر شاہ ظفر کا کلام سمجھتے ہیں، مگر یہ غزل حسامی کی ہے۔ اس بات کا پتہ ہمیں 'فغانِ دہلی' سے چلا تھا۔ کسی قوال یا غزل سنگر کے گا دینے سے غزل کا خالق بدل نہیں سکتا ہے، روایت کی کسوٹی پر پرکھے بغیر آنکھیں بند کر کے مان لینا کسی محقق کے لیے ممکن نہیں ہے، اربابِ ذوقِ نظر کو بھی اسے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ بند ملاحظہ ہو:

اجاڑا ایسا چمن جس کے غم سے دل ہے خوں — مٹے خزاں کی ہوا خاک میں ملے گردوں
بلا بلا یہ نازل خراب ہے دہلی — تباہ ہوگئی کیسے شتاب ہے دلّی
ستم ہے درد ظلم و عتاب ہے دہلی — ہزار حیف کہ وقفِ عذاب ہے دلّی
ہوا جو دیدۂ خور غم سے سرخ کیا ہے عجب — کہ پار اشک ہے تار شعاع میں اب

اس طرح کئی نظمیں پڑھنے کے لائق ہیں جن سے اجڑی ہوئی دلّی کا سارا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

غدر کے بعد دلی ردیف میں زیادہ تر غزل کے فارم میں نظمیں کہی گئیں، مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف علاقوں میں جو غزلیں یا نظمیں دلی کی بربادی کے تعلق سے کہی گئی تھیں ان کو اکٹھا کیا گیا ہے۔

لیکن سید حسن علی خاں عابد کی نظم کا پہلا شعر حوصلے کے اشعار میں ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ جو ہوگیا اس کو بھول جا۔ دنیا پھر سے آباد ہوگی۔ اور اچھے دن آنے والے ہیں:

ہم نے مانا کہ ملی خاک میں شان دہلی — ڈھونڈیئے اب بھی کوئی شہر بسان دہلی

اور وہی ہوا لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے دلی سے ہجرت کی۔ جو رہ گئے وہ ہندو پاک بٹوارے کے وقت پاکستان چلے گئے پھر دلی آہستہ آہستہ بس گئی۔ اس ضمن میں معزز باقر علی کامل کا یہ شعر توجہ طلب ہے:

مٹ گیا پر نہ مٹا نام و نشانِ دہلی — لب پہ دلّی ہے تو نظروں میں ہے شان دہلی

اسی طرح کی خواہش آغا جان عیش کے اس بند میں بھی کی ہے:

الٰہی کردے پھر آباد باغِ دہلی کو — کر اپنے فضل سے روشن چراغ دہلی کو
مئے نشاط سے بھردے باغ دہلی کو — دلوں سے خلق کے تو دھودے داغ دہلی کو
دعا ہے تجھ سے یہی اے مسبب الاسباب — کر اپنے ابر کرم سے وہ باغ پھر شاداب

کتاب خوب صورت کاغذ پر چھپی ہے۔ ایسی کتابیں حوالے میں کام آتی ہیں پھر کوئی چھاپے یا نہ چھاپے اس لیے اسکالرس حضرات کو اپنے پاس ضرور محفوظ کرلینا چاہیے، دلی کی یونیورسٹیوں کو فغانِ دہلی کو کورس میں شامل کرنا چاہیے تاکہ اس میں چھپے ہوئے تاریخی گوشوں پر کچھ اور تحقیق ہو سکے، اور زیادہ سے زیادہ طلبا اس سے مستفید ہو سکیں۔

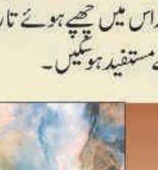

نئی ترقی پسند تنقید

مصنف: ش۔ اختر

صفحات: 280، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: کہاں ہم لوگ پبلی کیشنز، رانچی

مبصر: محمد رحمت اللہ اشرف، F-1355، شاہین باغ، نئی دہلی 25

'نئی ترقی پسند تنقید' معروف ناقد، شاعر اور فکشن نگار ڈاکٹر ش۔ اختر کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ کل بائیس مضامین پر مشتمل اس کتاب میں چند مضامین نظریاتی نوعیت کے ہیں جبکہ دیگر مضامین ادبی شخصیتوں اور ان کے تخلیقی کارناموں پر لکھے گئے ہیں۔ زیر نظر کتاب کا پہلا مضمون 'نئی ترقی پسند تنقید' مقالاتی نوعیت کا ہے۔ اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کو اسی مضمون کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ یہ مضمون دراصل ترقی پسند تنقید کے بدلتے ہوئے منظر نامے کا اعلامیہ ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے نئی ترقی پسند تنقید کے سلسلے میں اپنے موقف کا بھی اظہار کیا ہے۔ اس مضمون میں جہاں بیسویں صدی کے عالمی ادب کا احاطہ کیا گیا ہے وہیں ترقی پسند تنقید میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس مضمون میں ترقی پسند تنقید کے مستقبل اور پوشیدہ امکانات کے سمت کا بھی اشارہ ملتا ہے۔

ش۔ اختر کی تازہ تصنیف میں کئی مضامین ایسے بھی ہیں جو مثبت انسانی اقدار کے تئیں ان کے Commitment کو ظاہر کرتے ہیں۔ نوید فتح ہے قلب عوام کی دھڑکن، گونگے بونے دانشوروں کے نام، ادیبوں کی وفاداری اور فکری غربت کا المیہ جسے مضامین ترقی پسند نظریہ ادب سے موصوف کی وفاداری کے غماز ہیں۔ ش۔ اختر کسی فنکار کے بڑے ہونے کے لیے کسی خاص مذہبی یا سیاسی وسماجی نظریے سے وابستگی کو ضروری قرار نہیں دیتے بلکہ فن کے تئیں وفاداری کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فنکاروں پر کسی بھی طرح کی پابندی کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ فنکار عام ڈگر سے ہٹ کر سوچنے کا عادی ہوتا ہے اور یہی صفت ایک فنکار کو عام انسانوں سے الگ پہچان عطا کرتا ہے۔ موصوف نے اپنے مضمون 'فکری غربت کا المیہ' میں اس تلخ حقیقت کا بھی بے دریغ اظہار کیا ہے کہ موجودہ ہندوستان میں حقیقی دانشوروں کا فقدان ہے اور نااہل لوگوں نے دانشوری کا چوغا پہن کر سچ اور جھوٹ کے فرق کو روند ڈالا ہے۔ لہٰذا وہ اس عہد کی سفاکیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے فنکاروں کے Commitment کو ضروری تصور کرتے ہیں اور اس کام کے لیے ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں پائے جانے والے جوش وجذبے کو مشعل راہ گردانتے ہیں۔ ان کے اس رویے میں ماضی پرستی تو نہیں لیکن ترقی پسند تحریک کے تئیں ایک قسم کی ناسٹلجیائی کیفیت ضرور نظر آتی ہے۔

'نئی ترقی پسند تنقید' میں 'اردو کی نثری نظمیں' کے عنوان سے ایک طویل مضمون شامل ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے ادب میں نئے نئے تجربات کے سلسلے میں مصنف کی ذہنی افتاد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں جہاں نثری نظم کے آغاز وارتقا کا احاطہ کیا گیا ہے وہیں موجودہ تخلیق کاروں کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔ موصوف چونکہ خود بھی اس صنف شاعری سے وابستہ ہیں اور ان کے نثری نظموں کا ایک مجموعہ 'وناش یاترا' کے نام سے منظر عام پر بھی آچکا ہے لہٰذا وہ نہ صرف اس صنف کے حوالے سے نظریاتی گفتگو کرتے ہیں بلکہ اس جدید صنف میں موجود امکانات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔

نثری نظموں کے علاوہ آزاد نظم نگاری میں ش۔ اختر کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ اس تعلق سے 'شاہد احمد شعیب کی آزاد نظمیں' کے عنوان سے ایک نہایت مبسوط مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔ 'لے سانس بھی آہستہ' اور 'نازک ہے بہت کام' جیسے شعری مجموعوں کے خالق شاہد احمد شعیب علم سیاسیات کے پروفیسر ہیں۔ وہ آزاد نظم جیسی جدید صنف سخن اور غزل جیسی کلاسیکی صنف سخن دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ شعیب کی آزاد نظموں کا مرکز ومحور چھوٹا ناگپور کی قبائلی زندگی ہے۔ ان کی ان نظموں میں وہاں کے لوک رقص، لوک موسیقی اور لوک گاتھاؤں سے گہرا ربط نظر آتا ہے۔ یہی نہیں ان کی آزاد نظموں میں موجود شہری زندگی کی ضرورتوں اور محکومیوں کا تجزیہ بھی ش۔ اختر نے نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔

ادبی شخصیتوں پر تحریر کردہ مضامین میں 'جوش کی معنویت'، 'اکبر اینٹی غزل کا پہلا اہم شاعر'، 'سہیل عظیم آبادی - ایک تنقیدی جائزہ' وغیرہ مضامین توجہ طلب ہیں۔ ان کے علاوہ بہار میں لوک گیت، ادب میں تجربوں کی اہمیت، روایت سے بغاوت تک اور کالے جسموں کی ریاضت جیسے مضامین ش۔ اختر کی اس نئی تصنیف کی اہمیت وافادیت میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

تفہیم تصوف

مصنف: حسین الحق

صفحات: 264، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد شمس الدین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

'تصوف' نہایت ہی اہم موضوع ہے جس پر اکثر و بیشتر گفتگو ہوتی رہتی ہے کہ 'تصوف' کیا ہے اور 'تصوف' یا 'صوفی' کسے کہا جائے۔ پروفیسر حسین الحق کی کتاب 'تفہیم تصوف' میں اسی بحث کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے نہ صرف تصوف کو سمجھایا ہے بلکہ اس پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات بھی دینے کی کوشش کی ہے۔ تصوف کے مختلف پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے جہاں اسلام کے فروغ و ارتقا میں صوفیا کے کردار پر روشنی ڈالی ہے وہیں سماجی و معاشرتی مسائل کے حل میں صوفیا کا کیا رول ہے اور ایک اچھے سماج کے لیے تصوف کتنا ضروری ہے، اس پر بھی گفتگو کی ہے۔

'تفہیم تصوف' مصنف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں المجیب (پھلواری شریف)، زندگی نو (دہلی)، تہذیب الاخلاق (علی گڑھ)، خدا بخش جرنل (پٹنہ) اور شاعر (ممبئی) جیسے اہم رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ کتاب میں نصف درجن غیر مطبوعہ مضامین بھی شامل ہیں۔ 'تصوف' کا ثبوت قرآن واحادیث سے ثابت کرنے کے ساتھ ہی اس کی قدامت اور اہمیت پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

مصنف اپنے پہلے مضمون 'تصوف- حقیقت اور ابتدائی ادوار' میں لکھتے ہیں: ''تصوف اسلامی فکر کا ایک ایسا رخ ہے جس نے اپنے آپ کو پہلے عمل میں ظاہر کیا اور جب بہت دنوں تک حاملین تصوف اس فکر پر عمل پیرا ہو چکے تو اس نے باضابطہ علم وفن کی صورت اختیار کی۔'' مصنف نے 'تصوف' کے سلسلے میں حضرت ابونصر سراج کی کتاب 'اللمع' (378 ہجری) کو قرآن واحادیث کے بعد پہلا قدیم ترین ماخذ قرار دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ لفظ 'صوفی' حضرت حسن بصری کے عہد میں بھی رائج تھا۔ اپنے ایک مضمون 'کیا تصوف ایک عجمی رویہ ہے' میں ابن خلدون، عبد الحق محدث دہلوی اور علامہ اقبال جیسے اہم مفکرین اور علما کا حوالہ دیتے ہوئے تصوف کو رحمت اور ناگزیر بتایا ہے اور صوفیا کے اقوال کے ذریعے بھی تصوف کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'عجمیت کا شوشہ' میں غیر عربی خیالات کو رد کرنے کے نظریے پر تنقید کی ہے۔ 'فلسفہ اور تصوف'، 'رہبانیت اور تصوف کا تصورِ ترک دنیا'، 'اشاعت اسلام میں صوفیا کا حصہ'، 'ملی و معاشرتی مسائل کا حل' 'مذہب، تصوف اور تہذیب' اور 'اہل تصوف کے تذکروں کی اہمیت و افادیت' ایسے مضامین ہیں جن کے عنوانات سے ان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

'المجیب اور تصوف' میں خانقاہ، مجیبیہ قادریہ پھلواری شریف، بہار سے نکلنے والا رسالہ 'المجیب' میں مختلف اوقات میں تصوف کے سلسلے میں کتنے مضامین شائع ہوئے، اس کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ 'تصوف کے باب میں تعصب کی ایک مثال' اور 'تصوف پر یلغار کا ایک نمونہ' ایک طرح سے جوابی مضامین ہیں جن کی طرف مصنف نے اپنے 'پیش سخن' میں اشارہ بھی کر دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں شذرات، شرح آیت نور اور مکتوبات اصدقی جیسے عنوانات کے تحت بھی تصوف کے دیگر گوشے اجاگر کیے گئے ہیں۔

مصنف نے جس طرح دلائل و براہین سے اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس سے ان کی تحقیقی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرآن واحادیث، صوفیا کے اقوال اور مؤرخین کے علاوہ مشرقی و مغربی مفکرین کے حوالے بھی دیے ہیں۔ جہاں انھوں نے نقلی دلائل دیے ہیں وہیں عقلی دلائل کو بھی شامل کیا ہے۔ عربی و فارسی عبارات بکثرت استعمال کیے ہیں۔ کتاب کو اسم بامسمیٰ کہا جاسکتا ہے کیونکہ تصوف کے ہمہ جہت پہلو پر گفتگو کی گئی ہے۔ امید ہے کہ تصوف کو سمجھنے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب کافی مددگار ثابت ہوگی۔

کتاب کے مصنف پروفیسر حسین الحق جہاں ایک اہم ادیب و ناقد ہیں وہیں خانقاہ سے بھی ان کا تعلق ہے۔ اب تک ان کے کئی افسانوی مجموعوں کے علاوہ 'اردو فکشن ہندوستان میں'، اور 'نثر کی اہمیت' جیسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 'تفہیم تصوف' کے علاوہ بھی تصوف پر ان کی دیگر کئی کتابیں اور مضامین ملتے ہیں۔

اردو فکشن

مصنفہ: شہناز رحمٰن

صفحات: 207، قیمت 250 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: سفینہ بیگم، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، حامدی کاشمیری، محمود ہاشمی، ابوالکلام قاسمی، قاضی افضال حسین وغیرہ نے فکشن تنقید کے روایتی فارمولے کے علاوہ چند نئے نکات کی توضیح وتشریح بھی کی ہے لیکن اب بھی فکشن تنقید تشنہ لب نظر آتی ہے اور تخلیقی تجربات کے کئی گوشے توجہ کے محتاج معلوم ہوتے ہیں۔ اسی کے باعث متون کی تفہیم وتعبیر میں دقت پیش آتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب 'اردو فکشن تفہیم، تعبیر اور تنقید' شہناز رحمٰن کی تنقیدی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے گہرے شعور سے فکشن تنقید کے نئے نکات کو تشریح وتعبیر کے عمل سے واضح کیا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب شہناز رحمٰن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو ہندو پاک کے مختلف موقر ادبی رسالوں میں گذشتہ تین برسوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں۔ مصنفہ نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ابتدا میں 'اپنی بات' کے عنوان سے کتاب کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد پہلے حصے میں افسانے کی تنقید سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ جس میں ذیلی عناوین 'افسانے کی تنقید کے بنیادی مسائل'، 'افسانے کی ہیئت میں تجربات کی نوعیت'، 'اردو افسانے میں کردار نگاری کے تجربات'، 'اردو افسانے میں اساطیری عناصر' اور 'اردو افسانوں میں مشترکہ تہذیب' ہیں۔ ان مضامین میں مصنفہ نے افسانے کی شعریات سے بحث کی ہے جس میں پلاٹ، کردار اور اسالیب بیان کے حوالے سے نئے نکات کا تجزیہ وتحلیل پیش کیا ہے۔ کرداروں کی تقسیم کے روایتی طریقہ کار کے ساتھ کردار نگاری میں مزید تجربات کی نوعیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ راوی، بیانیہ، روداد اور زمانی ساخت کے حوالے سے قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، منٹو، غلام عباس، ممتاز شیریں، سریندر پرکاش اور انتظار حسین کے افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اساطیری، طرز بیان کا ایک طریقہ کار ہے اور اس ضمن میں مصنفہ کا کہنا ہے کہ اساطیر انسانی زندگی اور اس کی سائیکی کا ایک حصہ ہے لہٰذا ان کا اظہار ادبی تخلیقات میں ہوتا رہا ہے۔ اسی طرز اظہار کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصنفہ نے اردو افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ اردو افسانے کے ضمن میں مشترکہ تہذیب سے متعلق رہن سہن، بود و باش، نشست و برخاست، زبان، عقائد، سماجی اور سیاسی نظریات و تصورات کا بیان ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر، ترنم ریاض اور نجمہ محمود کے حوالے سے کیا ہے۔

دوسرے حصے میں مختلف ادبی شخصیات کی تخلیقات میں موجود متفرق گوشوں کو ایک نئی تنقیدی بصیرت کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ اس ذیل میں جو مضامین شامل ہیں ان کی فہرست اس طرح ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں پر ترکی کے اثرات، کرشن چندر کے ابتدائی افسانوں میں رومانیت کی سطح، راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں ترقی پسندی، عصمت چغتائی کے افسانوں میں بیانیہ کے مسائل، قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی اسطوری جہتیں، مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں روایت کی بازیافت، شموئل احمد کے

افسانوں میں سائنسی اصطلاحات، خواتین افسانہ نگار اور ذکیہ مشہدی اور مابعد جدید افسانہ نگار اور محمد حامد سراج۔ ان تمام مضامین میں مصنفہ نے تنقید کے روایتی طریقہ کار سے گریز کرتے ہوئے مخصوص و منفرد پہلوؤں کے حوالے سے افسانوں کی تشریح و تعبیر کی ہے۔ اور اس بات کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ افسانے کو پرکھنے اور اس کے تعین قدر میں محض تلخیص سے کام نہیں بن سکتا بلکہ ساختیاتی یا اسلوبیاتی طریقہ کار سے افسانے کی تنقید کے مزید امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ اور افسانہ وسعت و ہمہ گیریت کا حامل ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کا تیسرا حصہ شوکت صدیقی کے ناولوں خدا کی بستی، جانگلوس اور کمین گاہ کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔ جس میں مصنفہ نے موضوعاتی بحث کے ساتھ فنی نقطہ نظر کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ مصنفہ کی یہ کتاب متعصّبانہ اور جانبدارانہ رویوں سے پاک ان کی تنقیدی کاوشوں کا اعلیٰ نمونہ ہے جو اردو فکشن کی تنقید میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب کا سرورق دلکش ہے۔ بیک کور پر اس کتاب کے متعلق پاکستان کی مشہور و معروف شخصیت مرزا حامد بیگ کا مختصر تنقیدی تبصرہ بھی شامل ہے۔

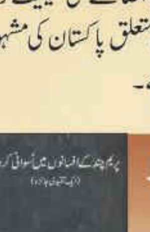

پریم چند کے افسانوں میں نسوانی کردار

مصنف: ڈاکٹر شہزاد احمد خان

صفحات: 350، قیمت: 300 روپے

ناشر: رجحان پبلی کیشنز، الہ آباد

مبصر: ڈاکٹر محمد صہیب، 156-B/9-B/1، شمس نگر کریلا باغ، الہ آباد 211016

موضوع اور مواد کے اعتبار سے پریم چند کے افسانوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ پریم چند کی تحریروں کے تجزیے مختلف زاویوں اور جہتوں سے کیے جاتے رہے ہیں اور ان کے افسانوں پر وقیع نگارشات شائع ہو کر قبول عام حاصل کرتی رہی ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد احمد خان نے بھی اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا اور پریم چند کے افسانوں میں جو نسوانی کردار ہیں ان کا معروضی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا ہے۔ پیش کردہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے:

باب اوّل میں افسانے کا تعارف کراتے ہوئے اس کے وسیع تر معانی و مفاہیم کی تشریح کی گئی ہے اور اس کے خصائص و امتیازات بیان کیے گئے ہیں۔

دوسرے باب کے دو حصے ہیں، فاضل مصنف نے پہلے حصے میں کردار نگاری کے فن سے بحث کی ہے کہ کردار کو کس طرح تراشا جانا چاہیے۔ مثالی کردار کیسے وجود میں آتے ہیں۔ مکالمے کی کیا اہمیت ہے، اور پھر کردار نگاری کے سلسلے میں نفسیات پر پریم چند کی غیر معمولی دسترس کا تذکرہ ہے۔ دوسرے حصے میں اردو افسانوں کے اہم نسوانی کرداروں کا مطالعہ ہے۔ مصنف نے یہ حصہ نذیر احمد کے ناولوں سے شروع کیا ہے اور پریم چند، منٹو، عصمت، قرۃ العین حیدر، بیدی اور رام لعل وغیرہ کے افسانوں کے نسوانی کردار پیش نظر رکھے ہیں۔ اس حصے کی خوبی یہ ہے کہ اس سے اردو بیانیہ میں نسوانی کرداروں کے تقابلی مطالعے میں بڑی حد تک مدد مل سکتی ہے۔

تیسرے باب میں پریم چند کے نسوانی کرداروں کے مسائل ہیں عورتوں کو معاشرتی یا تہذیبی سطح پر یا سیاسی جدوجہد میں جس طرح کے مسائل درپیش ہوتے ہیں وہ تمام مسائل پر پریم چند کے نسوانی کرداروں کے مسائل ہیں۔

چوتھے باب میں پریم چند کے نسوانی کرداروں کا تنقیدی اور فنی تجزیہ ہے۔ اس باب افسانوں کی تلخیص کی گئی ہے اور موضوع کی مناسبت سے تنقید و تبصرہ بھی، یہاں عورت کی زندگی کا ہر پہلو دیکھا جا سکتا ہے، اس کے یہاں رومان بھی ہے، وہ حاکم بھی ہے، مظلوم بھی ہے، مصلح بھی ہے سیاست داں بھی ہے۔ اگر فرسودہ خیالات والی ہے تو جدید فیشن سے بھی آراستہ ہے، وہ ایثار و قربانی کا سراپا بھی ہے۔ غرض کہ عورت کے کردار کا ہر رخ ہے۔ بعض کہانیاں ایسی بھی ہیں جن میں نسوانی کردار نہیں ہیں، فاضل مصنف نے ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔

پانچویں باب میں وہ افسانے منتخب کیے گئے ہیں جن میں ایک نسوانی کردار ہے۔ افسانے کے جتنے بھی رخ ہو سکتے ہیں یا فنی لحاظ سے جتنے بھی نقطہائے نظر ہیں مصنف نے ان سب کا احاطہ کیا ہے۔ اسی لیے بعض افسانے ایک سے زائد جگہ پر نقل کیے گئے ہیں جیسے 'دنیا کا سب سے انمول رتن' کی ملکہ دلفریب یا 'کفن' کی بدھیا، چوتھے باب میں بھی ہیں اور پانچویں باب میں بھی۔ چھٹے باب میں استخراج نتائج ہے۔ اور سب سے آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں کہانی کا نام اس کا اہم کردار اور موضوع درج ہے۔ اس ضمیمے سے مصنف کی عرق ریزی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بہرحال یہ کتاب پریم چند کا تعارف ایک نئے زاویے سے کراتی ہے اور ان کے فکر و فن کے ان گوشوں کو روشن کرتی ہے، جن کی طرف توجہ تو کی گئی لیکن سرسری انداز میں، تفصیلی مباحث منظر عام پر نہیں آئے۔ پریم چند پر یہ ایک اہم اور وقیع کتاب ہے۔ زبان و بیان بھی دلکش ہے، تنقید و تبصرہ بھی بہت متوازن اور معروضی ہے۔ کتاب کا سرورق بھی جاذب نظر ہے۔

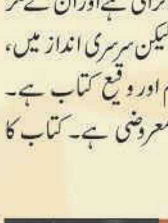

ارتکاز

مصنف: ف س اعجاز

صفحات 264، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت 2016

ناشر: انشا پبلی کیشنز، کلکتہ 700073

مبصر: ظفر عالم، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی

ف س اعجاز نے صنف شاعری سے لے کر اصناف نثر تک کے ہر گوشے پر طبع آزمائی کی ہے۔ تخلیقی صلاحیت کے ساتھ ساتھ مصنف میں تنقیدی بصیرت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ تنقید کے میدان میں قدم رکھنا ہر خاص و عام کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے گہرے مطالعے و مشاہدے کی از حد ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ تنقید کا کام کھرے کھوٹے میں فرق کرنا ہوتا ہے اور بغیر عمیق مطالعے کے کسی فن پارے یا فنی تخلیق پر تنقیدی نگاہ ڈالنا ممکن نہیں۔

زیر نظر کتاب 'ارتکاز' ف۔ س۔ اعجاز کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب 25 مضامین پر مشتمل ہے، مصنف نے کئی ادبی شخصیتوں کی فنی تخلیقات پر گہری تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ جس کی وجہ سے فن پارے کی اصل ادبی حقیقت قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ مصنف نے اپنے تنقیدی مضامین کو صرف طبقہ خاص کے لیے نہیں لکھا بلکہ اپنی تنقید کو عام قاری کی بصارت تک لے جانے کی کوشش کی ہے۔ بقول مصنف ''مصنف کا اپنا نقطۂ نظر جن سے واضح نہ ہو ایسے مضامین میرے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوشش کرتا ہوں کہ مضمون تازہ کار ہو اور ادب میں علم کا اضافہ کرے اور یہ کہ تنقید صرف نقادوں کا سروکار نہ ہو بلکہ عام قارئین تک پہنچنے کی بھی کسی قدر صلاحیت رکھتی ہو۔''

مذکورہ کتاب میں شامل پہلا مضمون ہے 'انتظار حسین کے افسانے'، جس میں انتظار حسین کے مختلف افسانوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ مصنف نے مختلف دلائل سے یہ بات ثابت کی ہے کہ انتظار حسین اپنے افسانوں کو علامتی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً فسانہ 'وہ جو کھو گئے' 'کٹا ہوا ڈبا' کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ انتظار حسین نے علامتوں کے ذریعے ہندوستانی تہذیب کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ 'شہر افسوس' کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے جانے والوں کی مشکلات کا احاطہ علامتی پیرائے میں کیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون 'فراق گورکھپوری کی نظمیہ شاعری' میں مصنف نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ فراق

کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کی بھر پور عکاسی کی گئی ہے۔ کتاب میں شامل تیسرا مضمون 'کلام فیض کے افادی پہلو [چند اشارے]' میں فیض کی شاعری سے عوام الناس کو جو فائدے حاصل ہوئے ہیں اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

'غالب پر نارنگ کی تنقید: شوق کا دفتر کھلا' مضمون میں ف س اعجاز نے، گوپی چند نارنگ کی کتاب 'غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' پر بہترین تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ مصنف نے نارنگ کی غالب فہمی کو نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کو کافی سراہا ہے۔ 'نیاز ایک مولوی کش مولوی' بہت دلچسپ مضمون ہے جس میں مصنف نے 'علامہ نیاز فتح پوری' کے عقائد کی نشاندہی ان کی بیشتر تحریروں کو سامنے رکھ کر کی ہے۔ مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیاز فتح پوری اپنے وقت کے ایک الگ مولوی تھے جنھوں نے علماء دین کے پرانے توہمات کو لے کر خوب طنز کیا ہے ساتھ ہی ساتھ لوگوں کو خود سے اسلامی تعلیمات پر غور فکر کرنے کی ترغیب دی ہے۔

کتاب میں شامل 'کبیر داس' ایک نیا اور بہترین مضمون ہے۔ مصنف نے دلائل کے ساتھ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کبیر داس کے کلام سے ہندوستان کی سیکولرزم کو کافی حد تک فروغ دیا جا سکتا ہے۔ ''قمر رئیس کی لکھائی کے پچاس سال'' میں مصنف نے قمر رئیس کے حالات زندگی سے لے کر ان کی تخلیقیت کا بہترین احاطہ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے قمر رئیس کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ ''مجتبیٰ حسین کا فن خاکہ نگاری'' بہت ہی دلچسپ مضمون ہے جس میں مصنف نے مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری پر بہترین تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ مضمون کے مطالعے سے یہ شناسائی ہوتی ہے کہ مجتبیٰ حسین نے 'فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، ابراہیم جلیس، جوگندر پال، راجندر سنگھ بیدی، فکر تونسوی، خوشونت سنگھ وغیرہ کا بہترین خاکہ لکھا ہے۔ 'خواجہ احمد فاروقی کے خطوط گوپی چند نارنگ کے نام' میں مصنف نے خواجہ احمد فاروقی کے خطوط سے اس بات کا اندازہ لگایا ہے کہ پروفیسر نارنگ کی ذہنی تربیت میں ان کے استاذ فاروقی کا بہت اہم رول تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مصنف نے فاروقی کے خطوط کو نوجوانوں کی تنظیمی صلاحیت کو بہتر کرنے کے لیے بہت کارآمد مانا ہے۔

'سردار غزل' ایک بہترین مضمون ہے جس میں ف۔س۔ اعجاز نے سردار جعفری کی شعر گوئی پر بہترین تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ جعفری کے انداز سخن کو سمجھنے کے لیے یہ مضمون بہت موزوں ہے۔ 'بنگلہ اردو: جتنے دور اتنے پاس' جامع مضمون ہے، جس میں بنگلہ زبان اور اردو کی مماثلت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون کے مطالعے سے قاری کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ سب سے اہم یہ کہ اردو کا رشتہ قدیم زمانے سے کس طرح سے بنگلہ زبان سے استوار ہے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے اور اردو کے فروغ میں بنگلہ زبان اور وہاں کے مصنفوں کی کیا کوششیں تھیں اس طرف بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف کا یہ مضمون اپنے انداز کا ایک بہترین مضمون ہے۔ کتاب میں شامل آخری مضمون 'عصمت چغتائی کے ذہنی رویے' میں مصنف نے عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری پر تفصیل سے تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔ مضمون کے مطالعے سے مصنفہ کے ذہنی رویے کو سمجھنے میں قاری کو آسانی ہوجاتی ہے۔ کتاب میں شامل دیگر مضامین 'نئی نظموں کا گلزار، کچھ امور جمالیات سے متعلق، علم الاساطیر سے متعلق اردو شاعری پر ایک کتاب، نیاز کی افسانہ نگاری، نعیمہ ضیاء الدین کی افسانوی حسیات، غالب دیوان نعت ومنقبت، پھر بہار آئی (جوگندر پال کے ناول 'پار پرے' پر اظہار خیال)، صادقہ کی متاشا، ظہیر انور منظر پس منظر، انداز نو میں عبدالصمد کے افسانے 'بقلم خود'، انگریزی میں اردو تنقید کے تناظر، عامر قدوائی کی غزل اور نظم، اردو کی شناخت ایک غیر مذہبی زبان کی حیثیت سے، بہترین مضامین ہیں جو قاری کے علم وآگہی میں اضافے کا سبب بننے کا کام انجام دیں گے۔ ف س اعجاز نے مضامین کو عرق ریزی کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ امید ہے کی ان کی یہ کتاب ادبی حلقے میں بہت پسند کی جائے گی۔

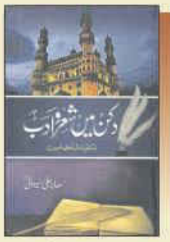

دکن میں شعر و ادب

شاعر: صابر علی سیوانی

صفحات: 224، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: روبی نکہت، 236، شپرا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

دکن میں اردو شاعری کا آغاز بہمنی عہد (1347-1527) میں ہوا۔ اس دور کے جو اولین نمونے ملے ہیں، ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ پھر بھی یہ تخلیقات اس بات کی دلیل ہیں کہ اردو شاعری کا ہیولیٰ یہیں مرتب ہوا۔ اس دور کی اولین اور اہم ترین تصنیف 'کدم راؤ پدم راؤ' ہے۔ یہ مثنوی بہمنی خاندان کے نویں بادشاہ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے دور اقتدار (1421-1434) میں فخر دین نظامی نے تحریر کی۔ یہ اس عہد کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی دستاویز ہے۔ اس میں استعمال ہونے والی زبان چھے سو سال قدیم ہے۔ اسی لیے آج اس کے ذخیرۂ الفاظ کی تفہیم بلاشبہ مشکل مرحلہ ہے۔ اس کے اسلوب پر 'ہندوی اثرات' کے ساتھ فارسی لہجہ بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اردو زبان اور ادب نے تین سو سال تک جتنی ترقی دکن میں کی اس کی نظیر نہیں ملتی۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد پوری سلطنت پانچ حصوں بیدر، احمد نگر، بیجا پور، گول کنڈہ اور برار کی خودمختار ریاستوں میں تقسیم ہوگئی۔ ان میں سے بیجا پور کی عادل شاہی (1490-1686) اور ریاست گول کنڈہ کی قطب شاہی (1518-1687) حکومتیں اردو ادب کی ترویج واشاعت میں پیش پیش رہیں۔ ان سلطنوں کے خاتمے کے بعد دکنی ادب میں ایک دوسرا رجحان ولی دکنی سے شروع ہوتا ہے۔ ولی کے آخری زمانے کا کلام دہلی کے تازہ اور فارسی آمیز محاورے سے قریب تر محسوس ہوتا ہے۔ ولی کی اولیات میں یہ بھی شامل ہے کہ انھوں نے غزل کو نیا رنگ وآہنگ عطا کیا اور اسے خانقاہوں اور ادبی محفلوں تک رسائی کے قابل بنا دیا۔ اس کے بعد محمد باقر آگاہ وغیرہ نے اردو ادب میں اضافہ کیا۔

زیر تبصرہ کتاب 'دکن میں شعر و ادب' صابر علی سیوانی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے جو عنوان قائم کیا ہے، اس سے قاری کا ذہن فوراً 'دکنی ادبیات' کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ دکنی ادب مخصوص جغرافیائی علاقے اور عہد میں پروان چڑھا۔ لسانی اور ثقافتی خصوصیات نے اسے انفرادی شناخت عطا کی۔ اس کے مختلف رویوں میں تفریق کے لیے اسے گجری اور فارسی روایتوں کا نام دیا گیا۔ اس لیے بیسویں صدی کے ادب کو دکنی ادب سے معنون کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے۔ صابر علی سیوانی نے اس میں جو مضامین شامل کیے ہیں ان میں ولی دکنی والے مضمون کو چھوڑ کر کسی کا بھی تعلق دکنی ادب سے نہیں ہے۔ نیز ولی کو بھی ہم دکن اور شمال میں رابطے کی علامت کے طور پر پڑھتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب چار عناوین میں منقسم ہے۔ پہلا عنوان 'تحقیق وتنقید' ہے۔ اس میں حکیم شمس اللہ قادری، محی الدین قادری زور، صغرا ہمایوں، مغنی تبسم، محبوب حسین جگر اور راج بہادر گوڑ کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ شمس اللہ قادری مورخ اور محقق کی حیثیت سے شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے دکنی ادبیات کی تحقیق میں اچھا خاصا وقت صرف کیا تھا۔ ان کی تصنیف 'اردوے قدیم' کو دکنی ادبیات میں حوالہ جاتی کتابوں میں انفرادی مقام حاصل ہے۔ محی الدین قادری زور، ادیب، عالم، شاعر، افسانہ نگار، ادبی ناقد، تاریخ دان اور معاشرتی اصلاح کار تھے۔ وہ اردو میں ماہر لسانیات کے طور پر معروف ہیں۔ انھوں نے لسانی تحقیق اور ادبی تنقید کے علاوہ تخلیقی ادب میں بھی حصہ لیا، کہانیاں لکھیں اور شاعری بھی کی۔ انھوں نے کئی مثنویوں کی تدوین کی۔ ڈاکٹر زور نے کلیات سلطان محمد قلی

قطب شاہ مرتب کر کے شائع کیا۔ بعد میں ان کی شاگردہ سیدہ جعفر نے ان کے مرتبہ نسخے کو ازسرنو مدون کیا۔ مصنف نے ان دونوں دکنی محققین کی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

مہ لقابائی چندا کو ایک عرصے تک اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ کا اعزاز حاصل رہا۔ ان کا دیوان 1213ھ میں مرتب ہوا تھا۔ [اس دیوان کی ترتیب کا مادہ تاریخ 'ھواللطیف الاعظم' ہے جس سے 1213ھ برآمد ہوتے ہیں۔] نصیرالدین ہاشمی کی دریافت نے صرف ایک سال کے تفاوت کے سبب لطف النساء امتیاز کو یہ اعزاز دلا دیا۔ اس لیے کہ یہ دیوان 1212ھ میں مرتب ہو چکا تھا۔ [اس دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ درج ذیل ترقیمے اور تاریخی شعر سے اس کے سال ترتیب 1212ھ کا پتہ چلتا ہے۔ ''تمت، تمام شد در شہر حیدرآباد بہ تاریخ پنجم جمادی الثانی 1212ھ نبوی صلعم، مہر خاں بہادر سید محمد علی خاں، کیا سن ہے ہجری کو جب میں عیاں ہوا ایک ہزار دو سو بارا یہ جان'']

صغرا ہمایوں مرزا ادب میں مختلف حیثیتوں سے شناخت رکھتی ہیں۔ انھوں نے ادب وشاعری کے ساتھ سماجی خدمت گذار کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ صغرا ہمایوں مرزا کی طبیعت نثر نگاری کی طرف زیادہ مائل تھی۔ اس لیے انھوں نے نثر میں ہی زیادہ لکھا۔ وہ شاعرہ بھی تھیں اور صبا تخلص کرتی تھیں۔ انھوں نے خواتین کی ترقی اور اصلاح کے مسائل سے خاص دلچسپی لی۔ متعدد ناول اور افسانے لکھے اور اصلاحی کتابیں تصنیف کرنے کے ساتھ کئی رسالے بھی جاری کیے۔ ان کا طرز تحریر سادہ، رواں اور شگفتہ ہے۔ صابر علی سیوانی نے ان کی ان تمام ادبی وفکری جہات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

دوسرا عنوان 'شاعری' ہے۔ اس کے ذیل میں ولی دکنی، جلیل مانک پوری، مخدوم، شاذ تمکنت، علی احمد جلیلی اور علی ظہیر کے فنی وفکری اکتسابات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ تیسرا عنوان 'افسانہ' ہے۔ اس میں 'ترقی پسند سے عصر حاضر تک اردو افسانے' کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ معاصر تخلیق کاروں میں بیگ احساس اور مظہر الزماں خاں کے فکری وفنی انفراد کو اجاگر کیا گیا ہے۔ چوتھا عنوان 'طنز ومزاح' ہے۔ اس ضمن میں سلیمان خطیب، گلی نلگنڈوی اور مجتبیٰ حسین کی ادبی خدمات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب قارئین کے لیے تحفہ ثابت ہوگی۔

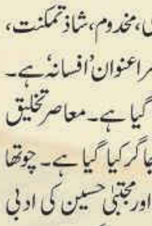

شعر اساس تنقید

مصنف: عطا عابدی

صفحات: 240، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر نسیم اختر، مدرسہ سلیمانیہ لین،

نواب بہادر روڈ، پٹنہ سٹی 800008

شعر اَساس تنقید (تاثرات، تبصرے اور تنقیدی اشارے) عطا عابدی کی گیارہویں کتاب ہے جس کا عنوان خود نفس مضمون کا اشاریہ ہے۔ یہ 58 شعری مجموعہ یا شعرا کے کلام پر عطا عابدی کے مطالعے کا ماحصل ہے جس میں کہیں تاثراتی رنگ ہے تو کہیں تبصرے کا انداز تو کہیں ان کے تنقیدی رویے کی عکاسی ہے۔ آخری مضمون میں فلمی شاعری کے حوالے سے تنقیدی رویوں پر تنقید کی گئی ہے۔

پیش نظر کتاب کی ابتداء میں 'اپنی بات' کے تحت 'یہ کتاب'، 'جادہ شعر وسخن کے مسافروں سے دو باتیں'، 'نئی ادبی نسل اور اس کی سوچ'، '1985 کے بعد اردو غزل' اور 'ایک گفتگو کے جواب میں' کے عنوان سے عطا عابدی کے پانچ مختصر مگر فکر انگیز مضامین بھی شامل ہیں۔

'یہ کتاب' دراصل مذکورہ کتاب کا پیش لفظ کہا جا سکتا ہے جو عام طور پر ہمارے یہاں کتابوں کے جز ولاینفک کا حکم رکھتا ہے۔ یہ کسی کتاب کے نفس موضوع کو متعارف کرانے کے ساتھ شاعر/مصنف/مرتب/مولف کے نقطہ نظر کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔ ایسا ہی کچھ حال 'یہ کتاب' کا ہے۔

ان کی دوسری تحریر دور حاضر کے تناظر میں شعرا کی عمومی صورت حال، ان کے افکار وخیالات اور عقائد ونظریات کے جائزے پر مشتمل ہے جس میں انھیں ان کے مناصب اور ذمہ داریوں کی یاددہانی بھی کرائی گئی ہے۔ تیسرے مضمون میں عطا عابدی نے نئی نسل کے تعلق سے جو بنیادی ادبی سوالات اٹھائے ہیں وہ قابل غور وعمل ہیں۔ مثلاً نئی نسل سے کیا مراد ہے؟ نئی ادبی نسل اپنے پیش رو نسل اور خود اپنے بارے میں کیا سوچتی ہے؟ ان کے لیے کہاں کہاں امکانات کی شمعیں روشن ہیں اور کہاں کہاں مایوسی کے اندھیرے چھائے ہیں؟ کسی ادبی عمل یا رویہ یا رد وقبول میں اس کا مطمح نظر کیا ہے؟ نئی نسل کا تخلیقی رویہ غیر واضح ہے یا حقیقت پسندانہ وغیرہ وغیرہ۔ مضمون کے اختتام پر عطا عابدی نے نئی نسل بالخصوص شعرا وادبا کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ:

''ادبا ان ادران جیسے دیگر سوالات کے تناظر میں ادبی اور سماجی اظہار کے ذریعہ اپنے مسائل اور رجحانات سامنے رکھ سکتے ہیں۔ اس طور پر بھی شعر وافسانہ کی تخلیق اور اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔'' (کتاب ہذا، ص14)

چوتھا مضمون '1985 کے بعد اردو غزل.....' ایک مذاکرہ پر مبنی ہے جس کا لب و لباب یہ ہے:

''غزل آج بھی، 1985 کے بعد بھی، ایک انتہائی مقبول صنف سخن ہے اور 85 کے بعد غزل میں ہرگز جمود نہیں آیا ہے۔'' (ایضاً، ص15)

پانچواں اور آخری مضمون 'ایک گفتگو کے جواب میں' سے دو اہم نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اول اردو شاعری کا دامن بہت وسیع اور بہت کشادہ ہے دوئم اچھے فنکار کو ایک اچھا انسان بھی ہونا چاہئے۔ اس کو صالحیت اور نافعیت کی مثال ہونا چاہئے۔

مذکورہ اقتباس شاعر اور شاعری کے معیار واقدار کے علامیہ کے ساتھ ایک فن کار کی زندگی کا وہ نصب العین ہے جو اس کا لائحہ عمل ہونا چاہیے۔ یہی عناصر اسے فنی طور پر بلند رکھنے کے ساتھ اخلاقی طور پر مثبت انداز فکر کی جانب گامزن رکھتے ہیں۔

عطا عابدی نے اپنے مطالعہ کے لیے دو طریق کار اختیار کیے ہیں۔ پہلا شخصیت کے تناظر میں کلام شاعر کا جائزہ جیسے فیض احمد فیض کی شاعری کا اسلوب تخاطب، حسن نعیم اور ان کی غزلیں، اویس احمد دوراں کی غزلیں، جگن ناتھ آزاد ایک تاثر...... دوسرے انھوں نے تخلیق کو عنوان بنا کر اس کا محاسبہ ومحاکمہ پیش کیا ہے اور بین السطور میں اس کی شخصیت کے حوالے بھی لائے ہیں جیسے 'کاروانِ حرم کی شاعری'، 'نوائے سرور — آرزوئے مسلسل کی صدا'، 'اڑان کا موسم کی غزلیں'، 'ارمغان سخن'، 'فتح اللہ قادری کی رباعیات' وغیرہ۔

اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض تبصروں میں مضمون کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے جیسا کہ فیض احمد فیض جو صفحہ 21 تا 40 پر محیط ہے۔ کچھ یہی کیفیت 'حسن نعیم اور ان کی غزلیں' صفحہ 41 تا 49، اویس احمد دوراں کی غزلیں صفحہ 50 تا 63، محمود ایاز کی غزلیں صفحہ 70 تا 79، عبدالرب جاوید کی غزلیں صفحہ 148 تا 153، کاغذ پہ صحرا صحرا میں نخلستان، صفحہ 160 تا 165 طویل تبصرے کا احساس دلاتی ہیں تاہم ترسیل وابلاغ کی کیفیت سے بھرپور عطا عابدی کی شگفتہ، واضح اور رواں نثر ہمارے لیے اس کتاب کو لائق مطالعہ بنانے کے ساتھ بزرگ، معاصر اور بعض نوآموز شعرا کے کلام کے حوالوں سے ایک جہان معنی آباد کرتی ہے۔

دیوانِ نادر

مصنف/ ناشر: جان رابرٹ پال نادر شاہجہاں پوری
صفحات: 328 ، قیمت: 300 ، سنۂ اشاعت: 2015
مبصر: گلشن، ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی، دہلی

'دیوان نادر' جان رابرٹ پال نادر شاہجہاں پوری کا لکھا ہوا ہے۔ یہ 1890 میں راما پور ضلع شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ نادر صاحب کی ساری عمر مصائب میں گزری۔ انھوں نے زندگی کے تارِ عنکبوت ٹوٹنے سے بچانے کی خاطر مختلف ملازمتیں کیں، حالات کے چر کے سہے، لوگوں کے جور و جبر برداشت کیے، کلیساؤں کے ناخداؤں کے منت کش ہوئے لیکن اپنی خودی، خودداری اور انا کا سودا کبھی نہ کیا۔ ان کی زندگی میں جو واقعات وحادثات پیش آئے ان کا عکس ونقش ان کی غزلوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

نادر میں تنگ دست رہا بعدِ مرگ بھی — تُربت مجھے ملی نہ میسّر کفن ہوا
گردشِ قسمت سے اب تو نادرؔ جی اُکتا گیا — بھاگ جاؤں میں کہاں اس رنج کی دُنیا سے دور

نادر شاہجہاں پوری مرحوم کا واسطہ اس عہد سے ہے جب طرزِ بیاں اور حسنِ زبان ہی اردو غزل کا سرمایہ تھا۔ اسی دور میں زبان وبیان کے اسالیب میں تازہ کاری اور فنکاری کو سرمایۂ سخن سمجھا جاتا تھا، عشق، ہجر، وصال، قفس، قبر، آشیانہ، مے و میخانہ، جور وغیرہ سے الگ دوسرے موضوعاتِ زندگی وزمانہ، چنداں اہمیت کے حامل نہ تھے اگر کہیں زمانے کے جور و جبر کا تذکرہ ہے بھی تو اس کی اشاریت کا کوئی خاص محور مرکز نہیں ہے گویا زبان کی سادگی و سلاست، اس میں نئے نئے گوشوں کی دریافت وایجاد ہی کو غزل کے لیے وجہ افتخار گردانا جاتا تھا، اس تناظر میں نادر شاہجہاں پوری کی شاعری کا بہ نظرِ غائر مطالعہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ مرحوم اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہی نہیں، مفتخر بھی تھے، ان کے یہاں جمود نہیں، قدرے جدّت بھی ہے، ان کے شعروں میں ترسیل کا المیہ نہیں ہے لطافت اور سیّال پن خوب ہے۔ ان خوبیوں کے باوجود، نادر شاہجہاں پوری شہرت گریز مزاج، گوشہ نشینی، عزتِ نفس، خودی وخودداری اور اپنی دنیائے شاعری میں، آپ مگن رہنے کے سبب ایک وسیع حلقے میں متعارف ومقبول نہ ہو سکے۔ اور نہ ہی اپنا دیوان شائع کروا سکے، اس بات کا افسوس انھیں زندگی بھر رہا۔

چنانچہ اپنی ایک غزل میں انھوں نے پیش گوئی کی کہ میرے جیتے جی نہ سہی لیکن ایک وقت ایسا آئے گا جب میرے ہی خاندان کا کوئی فرد میرے دیوان کو منظرِ عام پر لاکر میرے مشن کو آگے بڑھائے گا وہ اشعار یہ ہیں

میرے دیوان سے پاؤ گے نشاں میرے بعد — بند ہوجائے گی جب میری زباں میرے بعد
میری اولاد میں یک ہوگا عیاں میرے بعد — جو سنائے گا مرا طرزِ بیاں میرے بعد

لہٰذا ان کی کی ہوئی پیش گوئی بالکل سچ ثابت ہوئی اور بالآخر انہی کی نسل کی تیسری پیڑھی کے چشم و چراغ جناب جیسپر پال صاحب نے اپنے دادا مرحوم رابرٹ پال نادر صاحب کا دیوان منظرِ عام پر لانے کی جی توڑ محنت کی اور آج یہ دیوان ہمارے سامنے ہے اس دیوان سے قبل نادر صاحب کے دو مجموعے 'غرورِ تشنہ لبی' 'فصیلِ شہرِ تمنا' (اردو) میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آکر ادبی سرمائے میں اضافہ کر چکے ہیں۔ جس کے لیے نادر صاحب کو 'ابوالفن'، ابوالخیال' ابوالفصاحت، سراج الادب اور 'ملٹنِ ہند' جیسے خطابات سے بھی نوازا گیا تھا۔

اس دیوان میں تقریباً 485 غزلیں ہیں، اس کے علاوہ ایک مرثیہ بر قتل مہاتما گاندھی موجود ہے، ایک نظم 'پنچائتی راج'، رباعیات نادر، قطعات نادر، متفرقات نادر، وغیرہ بھی موجود ہیں۔

بہرحال اس شعری مجموعے کو پڑھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ندرتِ الفاظ اور تراکیب کا سلیقہ گر پرانا سہی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں کوئی بڑا تجربہ نہیں کیا اور نہ ہی غزل کی روایت کے کسی مروّجہ دائرے کو توڑنے کی کاوش کی ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ رموز وعلائم کی تہہ داری، تخیل کی پرواز، سلاست وبلاغت اور علم وعروض سے واقفیت، یہ تمام خصوصیات ایسی ہیں جن پر نادر صاحب کی گرفت اتنی پختہ ہے کہ اُن کا شمار ہماری ادبی تاریخ کے اُن شعرا میں کیا جاسکتا ہے جنھوں نے اپنے عہد میں شعروادب کی بلندیوں میں بیش قیمتی اضافے کرنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے اردو شاعری سے محبت رکھنے والوں کو یہ مجموعۂ کلام اپنی جانب ضرور متوجہ کرے گا۔

پرندے تو مسافر ہیں

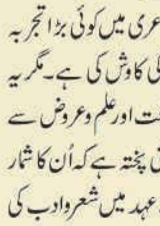

شاعر: عبدالرحیم نشتر، مرتب: محمد دانش غنی
صفحات: 192 قیمت: 110 روپے، سنہ اشاعت: 2015
اسباق پبلی کیشنز، سنجے پارک، لوہگاؤں روڑ پونے
مبصر: ڈاکٹر محمد امتیاز احمد، کنٹریکچول لکچرر، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی

'پرندے تو مسافر ہیں' عبدالرحیم نشتر (1947 تا 2014) کا آٹھواں شعری مجموعہ ہے۔ جو ان کے شاگرد رشید محمد دانش غنی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے جزوی مالی تعاون سے شائع کیا ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ خالص نظموں کا مجموعہ ہے، اس میں پچاسی نظمیں شامل ہے۔ یہ بالکل رسمی انداز کی نظمیں ہیں۔

اس مجموعے کے مطالعے سے پہلا ہی نقش ذہن میں مرتسم ہوتا ہے کہ کوئی احساس زیاں ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے:

نہ جانے پھر یہ کیا ہوا/ پرندے سب بکھر گئے
غبار میں اتر گئے/ نگار شام کھوگئی
دھوئیں میں غرق ہوگئی
ہوا ہے زہر آفریں/ فضا بھی ناگوار ہے
'یہ کیا جگہ ہے دوستو!/ یہ کون سا دیار ہے' — یہ کون سا دیار ہے' 63
'مجھے پھر بے قراری ہے سوال رستگاری ہے' — وہی سوکھا ہوا موسم' 65

اس دنیا میں ہر انسان کی اپنی اپنی خواہش ہے۔ اپنی جائز خواہشوں کو حدود میں رہ کر پورا کرنا کوئی بری بات نہیں؛ مگر معاملات کی نزاکت اس وقت بگڑ جاتی ہے جب ہم اپنی خواہشوں کو دوسروں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ اور ان سے اپنی خواہشوں کو پورا کرنے لگتے ہیں۔ اس کی عمدہ مثالیں 'میری تقدیر'، 'ریٹائرمنٹ'، 'ایک نظم' جبر بھی ضروری ہے'، 'پاداش'، 'موت'، 'مجبوری' ہے:

سنا ہے وہ آئی ہے/ تنہا نہیں
ساتھ میں ایک ننھا سا خوش شکل بچہ بھی لے آئی ہے
اور میں سوچتا ہوں/ خدا نہ کرے وہ اگر اس جگہ آئے/ اور اس کا بچہ
مجھے ماموں کہہ کر پکارے

تواس بے سبب پہلی خواہش کا کیا ہوگا
جو اکثر مری اور اس کی / ملاقات کا ایک وسیلہ رہی ہے ’ادھورا وسیلہ‘ 169
سناؤ...... تمھارے ’وہ‘ کیسے ہیں
کس طرح کٹتی ہیں شامیں سہانی ’دنوں بعد‘ 183

عیدان کے ہاں ایک استعارہ ہے اور کبھی کبھی یہ علامت کا روپ بھی اختیار کرتا ہے۔ جو کہ کبھی خوشی، کبھی غم، کبھی زندگی اور کبھی موت کا روپ دھار لیتا ہے:

اور کچھ نہیں ہوتا روح کسمساتی ہے
مجھ میں کوئی روتا ہے عید جب بھی آتی ہے ’عید جب بھی آتی ہے‘ 59
ہلال عید اندھیرے میں کھونہیں سکتا

عبدالرحیم نشتر تخلیق میں ابلاغ کے قائل ہیں اس لیے ان کی لفظیات ادق نہیں۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بچوں کے لیے بھی لکھتے ہیں۔ اس لیے فطری طور پر بچوں کا معیار ان کے لاشعور میں کارفرما رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی اکثر نظمیں بالکل سہل ہیں۔

سفر سوئے حرم

مصنف : شریف احسن مظہری
صفحات: 119، قیمت: 100 روپے
ناشر: استاد قاسم علی ویلفیئر ٹرسٹ
مبصر : فانوس سطوت شہلا، معلّمہ گورنمنٹ اردو مڈل اسکول، ہند پیڑھی، رانچی، جھارکھنڈ

زیر تبصرہ کتاب ’سفر سوئے حرم‘ شریف احسن مظہری کا تحریر کردہ سفر حرم سے متعلق ایک سفرنامہ ہے۔ کل 22 عناوین پر مشتمل یہ کتاب کافی دلچسپ، عمدہ اور پر کشش ہے، روانگی سفر سے لے کر واپسی وطن تک کے تمام واقعات کو موصوف نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔

اگر چہ سفر حرم کا تعلق روحانیت سے ہوتا ہے اور اکثر حرمین شریفین کے سفرناموں میں روحانیت کا پہلو غالب نظر آتا ہے تاہم دور جدید میں کئی ایسے سفرنامے لکھے گئے ہیں جن میں ادبیت کا پہلو بھی نمایاں ہے، یہ سفرنامہ بھی ادبی اسلوب کی چاشنی سے لبریز ہے، اس میں موصوف نے اپنے مشاہدات و تجربات کو جذبۂ ایمانی کے رنگ میں بے حد دلکش انداز میں پیش کر کے ادب کا مرقع بنا دیا ہے، محبت، عقیدت اور روحانیت کے ساتھ ساتھ ادب کے امتزاج نے کتاب کی دلکشی اور جاذبیت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔

حضرت مولانا سالم صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند وقف نے بجا طور پر اپنی تقریظ میں فرمایا ہے ”یہ کتاب مصنف محترم کے صرف سفر حج کی تفاصیل و تاثرات پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ کتاب کا دلکش اور جاذب اور موثر انداز بیان صرف حج کا ذوق وشوق پیدا کرنے والا نہیں بلکہ داعی حج بھی ہے۔“

مذکورہ بالا تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس شخص کی خواہش جو خانۂ خدا اور روضۂ اطہر کی زیارت کا متمنی ہو ایک خاص قسم کی تڑپ و اضطراب میں تبدیل ہو جاتی ہے اور خواہش دید میں اضافہ ہو جاتا ہے، کتاب کی جاذبیت کا یہ عالم ہے کہ جب قاری اسے مطالعے کے لیے اٹھاتا ہے تو پوری پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ خود کو شریک سفر بنا لیتا ہے۔

سفرنامے میں مصنف نے سیاسی، تہذیبی و معاشرتی حالات پر بھی نظر ڈالی ہے، دین کے معاملے میں عدم توازن دیکھ کر اس پر بھی اپنے مخصوص انداز میں نشان دہی کی ہے، پندرہ سو سال پہلے پرانے تاریخی واقعات کا ذکر بھی نہایت ہی پرسوز انداز میں کیا ہے، بالخصوص مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کا سفر کرتے ہوئے تاریخی مقامات اور اس سے وابستہ تاریخی واقعات کا ذکر اتنے حسین پیرائے میں کیا ہے کہ تاریخ اسلام کا ہر واقعہ ذہن کے پردے پر منعکس ہو جاتا ہے۔

بہر حال اس سفرنامے میں جہاں حج جیسی افضل ترین عبادت کی اہمیت و افادیت کا ذکر ہے وہیں سرزمین مقدس کے سرشار اور مدہوش کر دینے والے حسین مناظر کی عکاسی، ذوق و شوق، والہانہ پن، تکمیل آرزو، جذبات کی فراوانی، وجدانی و روحانی احساسات، نادر و حسین تشبیہات، تسلسل و روانی، زبان و بیان کی فصاحت، فلسفۂ حیات سے روشناسی، گریہ وزاری کے ساتھ دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی کے لیے دعاؤں کا سلسلہ اور روح کو گرما دینے والی بھینی بھینی خوشبو کی بہتات ہے۔

توشۂ محشر

مصنف: ڈاکٹر ساحر شیوی
صفحات: 280، قیمت: 300 روپے
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر ظفر مرادآبادی، 1889، فرسٹ فلور، گلی کوہلیان، سوئیوالان، نئی دہلی 2

مہاراشٹر کوکن کے پروردہ اور موجودہ لیوٹن یو کے کے باشندہ ڈاکٹر ساحر شیوی اردو دنیا کے لیے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اپنے وطن سے دور، دیارِ غیر میں اردو زبان و ادب کے تعلق سے آپ کی ادبی و شعری خدمات کا دائرہ بہت وسیع موضوعات کا احاطہ کرتا ہے جس کا ذکر کسی مختصر تبصرے میں قید کرنا ممکن نہیں ہے۔ آپ کی شعری و نثری تصنیفات کی تعداد چار درجن سے بھی زائد ہے۔ بے شمار ادبی جریدوں کی سرپرستی، مالی و ادبی تعاون کے ساتھ معتبر اہلِ قلم حضرات کی پذیرائی آپ کے مزاج کے محاسن میں شامل ہے، یہی سبب ہے کہ آپ کی ہر تصنیف میں مشاہیر ہند و پاک کے اہل قلم اور اہل علم کی مخلصانہ آرا شامل ہوتی ہیں۔ زیر نظر مجموعہ کلام ’توشۂ محشر‘ حمد و نعتیہ انتخاب میں تقریباً سولہ اہل نظر کے تاثر موجود ہیں۔

حمد و نعت کہنا ہر شاعر کے دائرۂ صلاحیت کا حصہ نہیں ہوتا۔ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اہم مذہبی امور کی واقفیت کے علاوہ اللہ اور رسول سے گہری عقیدت اور محبت بھی ضروری ہے تبھی حمد و نعت میں مکمل جذبے کی سچائی کا اظہار ہو پاتا ہے۔ ’توشۂ محشر‘ سے پیش تر ڈاکٹر ساحر شیوی کے دو حمد و نعت کے مجموعے ’وسیلۂ نجات‘ اور ’خاکِ مدینہ‘ شائع ہو کر آپ کے مذہبی تعلق کی صداقت کا اظہار کر چکے ہیں۔

’توشۂ محشر‘ تین بنیادی حصوں پر محیط ہے جس میں ابتدا میں اہلِ قلم کی آرا جبکہ دوسرا حصہ ’حمدیہ کلام‘ اور تیسرے حصے میں نعتیہ کلام شامل ہے۔ ابتدائی حصے میں انور شمیم انور، پروفیسر خورشید خاور امروہوی، اسرار احمد سہاروی، (مولانا) محمد ملک الظفر سہرامی، سید معراج جامی، ڈاکٹر فراز حامدی، پروفیسر محمد محفوظ الحسن، ڈاکٹر جمیلہ عرشی، ڈاکٹر گوہر مسعود، شارق عدیل، شاغل ادیب، شاہین فصیح ربانی، ڈاکٹر جمیلہ عرشی جے پور، پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم خلیل، ڈاکٹر مظفر حسن عالی کے علمی و دینی تاثرات شامل ہیں۔

دوسرا حصہ ’حمدیہ کلام‘ سے متعلق ہے جس میں روایتی حمد، حمدیہ غزلیات کے علاوہ حمدیہ دوہے، حمدیہ گیت، حمدیہ ہائیکو اور حمدیہ ماہیے ہیں:

داتا کے گن گان کر، دل کی گرہیں کھول
ہے داتا کے نام کا، ہرا کُھر بے مول (دوہا)

مشکور ہوں میں تیرا
بخشا ہے تو نے یارب مجھ کو جو زندگی میں
اتنا ہی حق تھا میرا (حمدیہ ہائیکو)

گل دیکھا، ثمر دیکھا
مری آنکھوں نے
تجھے دیکھا، جدھر دیکھا (حمدیہ ماہیا)

تیسرا حصہ 'نعتیہ کلام' سے وابستہ ہے جس میں روایتی نعت، نعتیہ غزل، نعتیہ گیت اور نعتیہ دوہوں کے علاوہ نعتیہ ہائیکو، نعتیہ ماہیے بھی ہیں۔ منظومات میں ضرورت، ولادتِ ناخدائے اسلام، ہستی محبوب خدا کے ساتھ درود وسلام بھی شامل ہیں۔ منقبتی حصے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانِ غنیؓ، حضرتِ علیؓ، حضرتِ خدیجہ الکبریٰؓ، حضرت عائشہؓ، خاتونِ جنت حضرت فاطمہؓ، امام حسنؓ، حسین ابنِ علیؓ، یادِ حسین، غوث الاعظمؒ، کی منقبتیں موجود ہیں۔ کتاب کے آخر میں رباعیات اور قطعات شامل کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر ساحر شیوی نے اپنے عقیدے کے مطابق اخلاص کے ساتھ اپنے مذہبی جذبات کا اظہار بڑے مؤثر انداز میں کیا ہے جو آپ کی ایمانی اور روحانی کیفیات کا آئینہ دار ہے۔ توشۂ محشر نہ صرف اہلِ دنیا کے صاحبِ ایمان لوگوں میں حرارت پیدا کرے گا بلکہ آپ کی عاقبت کو سنوارنے کا بھی ذریعہ بنے گا۔ انشاء اللہ۔

سیفی سرونجی کی ادبی و صحافتی خدمات

مرتب: محمود محمد خاں (محمود ملک)

صفحات: 212، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: سیفی لائبریری سرونج مدھیہ پردیش

مبصر: سلیم انصاری، ایچ آئی جی 3، نندنگر، اُدھرتال، جبل پور

سیفی سرونجی سے میری رفاقت، انتساب کے ابتدائی دنوں سے ہے۔ اپنی نامساعد مالی حالت کے باوجود سیفی نے انتساب کا اجرا کیا، تب سے اب تک انتساب اور سیفی دونوں مسلسل ارتقا کا سفر کر رہے ہیں، سرونج جیسی ایک چھوٹی سی جگہ سے ادبی رسالہ جاری کرنا واقعی ایک مشکل کام تھا، مگر سیفی نے تمام تر پریشانیوں اور نامساعد مالی حالت کے باوجود اسے اب تک جاری رکھا ہے، جس کے لیے وہ یقینی طور پر مبارک باد کے قابل ہیں۔ سیفی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف بین الاقوامی سطح پر بھی کیا گیا ہے، جس کے سبب انھوں نے کئی بار سرونج سے لندن تک کا سفر کیا اور سرونج کو ایک نئی ادبی شناخت سے روشناس کرایا۔

اکتوبر 2015 میں انتساب اور سیفی سرونجی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اہل سرونج نے ایک سمینار اور مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں نعیم کوثر، پروفیسر آفاق احمد، رشید انجم، پروفیسر مختار شمیم، اقبال مسعود، پروفیسر محمد نعمان خاں، محمود ملک اور آصف سعید وغیرہ کی شرکت سے جشن کی تقریبات کو نیا اعتبار حاصل ہوا۔ سمینار میں سیفی سرونجی اور انتساب کے حوالے سے مقالات پیش کیے گئے، جنھیں محمود ملک نے نہایت خوبصورتی سے 'سیفی سرونجی کی ادبی وصحافتی خدمات' کے زیرعنوان کتابی شکل میں پیش کیا ہے، اس کتاب میں ان قلمکاروں کے مقالات بھی شامل ہیں جو کسی وجہ سے سمینار میں شامل نہ ہو سکے تھے۔ کتاب میں محمود ملک نے پیش لفظ کے طور پر کتاب کی اشاعت کا جواز ''یہ کتاب کیوں؟'' کے عنوان سے پیش کیا ہے، جو فکر انگیز بھی ہے اور اردو برادری کے لیے ایک عبرت نامہ بھی کہ ہم اپنے ان قلمکاروں کی خدمات کا بھی اعتراف نہیں کرتے جو 80-90 کی عمر میں ہیں اور اعزازات کے مستحق ہیں۔ محمود ملک کے اس سنجیدہ سروکار سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں کیونکہ انھوں نے اپنی بات دلائل اور وضاحت کے ساتھ رکھی ہے۔ محمود ملک نے اپنے پیش لفظ میں سیفی سرونجی اور انتساب سے اپنی دیرینہ رفاقت کا ذکر نہایت خلوص سے کیا ہے مگر انتساب کے لیے اپنے تعاون کا کہیں ذکر تک نہیں کیا، سیفی اور انتساب کے جشن کو ایک کامیاب اور یادگار پروگرام بنانے میں محمود ملک کی محنت اور کوشش کا اعتراف نہ کرنا ایک ادبی بددیانتی ہوگی۔

زیرِنظر کتاب میں شامل مقالات میں سیفی سرونجی کی شخصیت، تخلیقات اور تنقیدی مضامین کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ پروفیسر مختار شمیم نے اپنے مقالے میں ان محرکات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے سیفی اور سرونج کو ایوان ادب میں نئی پہچان دی، مگر سیفی نے اپنے کرم فرماؤں کو فراموش نہیں کیا بلکہ بارہا یہ اعتراف کیا ہے کہ ان کی ادبی شخصیت کو پروان چڑھانے میں وقار فاطمی، پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر شاہد میر اور پروفیسر مختار شمیم کا اہم حصہ رہا ہے اس سے سیفی کی ادبی دیانت داری کا اندازہ ہوتا ہے۔

اپنے مقالے میں پروفیسر محمد نعمان خاں نے سیفی کے خلوص اور اردو سے اس کی محبت کا دل سے اعتراف کیا ہے۔

ڈاکٹر مہتاب عالم نے اپنے مقالے 'ادب کا تابندہ ستارہ... سیفی سرونجی' میں یہ انکشاف کیا ہے کہ اس خاندان میں گذشتہ سات پیڑھیوں میں نامی ڈکیت تو پیدا ہوئے لیکن کسی کا سررشتہ حیات قلم سے نہیں جڑ سکا جبکہ ڈاکٹر محمد نوشاد عالم نے سیفی کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ ان کے نانا الحق ڈاکو کا مدھیہ پردیش اور راجستھان کے مشہور ومعروف ڈاکوؤں میں ہوتا ہے۔ میرے لیے یا ادب کے کسی بھی سنجیدہ قاری کے لیے یہ بات اہم نہیں کہ سیفی سرونجی کا خاندانی پس منظر کیا رہا ہے، بلکہ اہم بات یہ ہے کہ ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کیا ہیں کیونکہ ادبی مقام کا تعین تخلیقی کام سے ہوتا ہے، خوشی کی بات یہ ہے کہ سیفی جس برادری سے تعلق رکھتے ہیں اس میں تعلیم کا چلن نہیں تھا، مگر انھوں نے اپنی لگن اور محنت سے نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ اپنے قلم سے سرونج کا نام بین الاقوامی سطح پر روشن کیا ہے جو یقینی طور پر اعزاز کی بات ہے۔

ڈاکٹر آصف سعید اور محمود ملک نے زیرِنظر کتاب میں 'زبان وادب کا سفیر۔ سیفی سرونجی' کے حوالے سے خاصی تفصیلی گفتگو کی ہے، جس سے سیفی کی شخصیت اور شاعری کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے جو دیگر مقالہ نگاروں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔

آج سیفی سرونجی جس مقام پر ہیں وہاں تک پہنچنے میں یقینی طور پر ان کی محنت، لگن اور اردو سے عشق ہی کلیدی حیثیت رکھتے ہیں، سرونج آج عالمی سطح پر اپنی شناخت رکھتا ہے اور اردو کی نئی بستیوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ سیفی سرونجی کی ادبی اور صحافتی خدمات کا اعتراف سرونج میں بڑے پیمانے پر کیا گیا ہے اس کے علاوہ ناقدین شعروادب نے بھی سیفی سرونجی کی تخلیقی صلاحیتوں کو سراہا اور اپنے مضامین میں ان کے حوالے بھی دیے یہ ایک اعزاز کی بات ہے۔ انتساب نے اب تک اپنے کامیاب 33 سال مکمل کر لیے ہیں اور 100 شاندار شماروں کا سفر طے کر لیا ہے، جن میں متعدد ضخیم اور اہم نمبر شامل ہیں۔

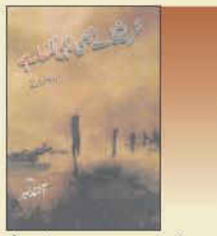

سُریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے

مصنف: آنندلہر

صفحات: 152، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد نوشاد عالم 9713032998

ریاست جموں وکشمیر میں اردو شاعری کے بعد جس صنف کو سب سے زیادہ فروغ ہوا، وہ افسانہ نگاری ہے۔ کشمیر میں اردو افسانے کی جو شمع پریم ناتھ پردیسی نے جلائی تھی اس کی لو میں اضافہ کرنے والوں میں آنندلہر کا نام اہمیت کا حامل ہے، ریاست کے بسیار نویس تخلیق کاروں میں ان کا نام لیا جاتا ہے۔ 1960 کے بعد جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نگاروں کی جو نئی کھیپ نمودار ہوئی، ان میں ایک اہم نام آنندلہر کا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب 'سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے' آنندلہر کا پانچواں افسانوی مجموعہ ہے، جو 2015 میں شائع ہوا۔ یہ افسانوی مجموعہ '37' افسانوں پر مشتمل ہے، جس میں رومانوی، علامتی اور تجریدی افسانے شامل ہیں۔ مجموعے میں شامل افسانوں میں 'سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے، دوسری بے انصافی، بدلتے رنگ، چڑیوں کی بارات، ووٹ بینک، طلاق، لالہ گورنام داس، چناب کا پانی پھر اچھلا، درخت بن رہا آدمی، انصاف، رام سنگھ کی خودکشی، تلاش، اپنا گھر، سڑک انصاف کرے گی، زمین کی کوئی نہیں سنتا، سورج گرہن، انوکھے زخم، اور پتھر روپڑا، تین دن بعد، کئی رنگ، بدلتے لفظ، الگ صوبہ اور 'غلط علاج' وغیرہ اہم افسانے ہیں۔

آنندلہر کی اس سے پہلے بھی کئی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ اگر ہم ان کے افسانوں کا بغور مطالعہ کریں تو اس مجموعے کے افسانے دوسرے افسانوی مجموعوں سے قدرے مختلف ہیں۔ انھوں نے اس مجموعے میں روزمرہ کی زندگی کے مسائل کو پیش کیا۔ اس میں نہ صرف شہری بلکہ دیہاتی زندگی کے رسم ورواج، رہن سہن اور دیگر مسائل کو بھی پیش کیا۔ ان کے افسانوں میں قاری کو محسوسات، تجربات، مشاہدات، نفسیات اور احساسات کے ساتھ ساتھ گہرے معاشرتی شعور کا احساس بھی ہوتا ہے۔ آنندلہر کی نظر گردوپیش کی ہر چیز پر رہتی ہے اور ان سب کی عکاسی وہ اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ ہر طبقے کی جیتی جاگتی تصویریں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

مجموعے سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انھوں نے اس مجموعے کے ذریعے معاشرے کے تقریباً ہر طبقے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ چاہے وہ پولیس اور سرکاری محکمہ (صرف ایک شام سنگھ، انصاف) ہو، عدالت (دوسری بے انصافی) ہو، سیاسی پارٹی (ووٹ بنک، موقع) ہو یا سماج کا کوئی اور طبقہ۔ معاشرے میں ہو رہی ناانصافی، عصمت دری کی شکار عورتیں، سیاسی پارٹیوں کی وعدہ خلافی اور اس سماج میں طلاق جیسے نہ ختم ہونے والے مسائل وغیرہ کو انھوں نے خوبصورتی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں دوملکوں کی سیاسی صورت حال کو بھی دکھانے کی کوشش کی ہے۔

آنندلہر ایک حساس فن کار ہیں، اور انھوں نے سماج ومعاشرے کا بغور مطالعہ کیا اور غور وفکر کے بعد اسے صفحۂ قرطاس پر پیش کر دیا۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی افسانوی شکل دینے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات نئے اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے خود اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے، جنھیں قاری پڑھ کر کبھی بوریت محسوس نہیں کرتا۔ وہ اپنے افسانوں میں سیاسی اور سماجی نظام کی کمزوریوں اور عصری صداقتوں کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

اس مجموعے میں زیادہ تر علامتی اور تجریدی افسانے شامل ہیں۔ علامتی افسانوں میں کہانی، الگ صوبہ، چڑیوں کی بارات، سڑک انصاف کرے گی، زمین کی کوئی نہیں سنتا، سورج گرہن، تلاش اور 'درخت بن رہا آدمی' وغیرہ شامل ہیں، جن میں آنندلہر نے علامت کے طور کہیں جانور تو کہیں چڑیوں کے ذریعے معاشرے کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آنندلہر دور حاضر کے ایک نمائندہ افسانہ نگار ہیں، جن کے افسانے اردو افسانہ نگاری کی روایت میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تقریباً 150 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف آنندلہر کے چاہنے والے بلکہ ادب کے طالب علم کے ساتھ ساتھ عام قارئین بھی اس سے مستفید ہوں گے۔

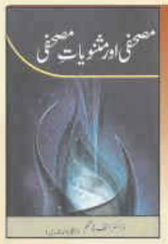

مصحفی اور مثنویات مصحفی

مصنف: ڈاکٹر الف ناظم

صفحات: 304، قیمت: 166 سنہ اشاعت: 2015

ناشر: کتابی دنیا، نئی دہلی

مبصر: زاہد ندیم احسن، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'مصحفی اور مثنویات مصحفی' ڈاکٹر الف ناظم کی کتاب ہے۔ کتاب کے فلیپ کے پچھلے حصے پر ان کا مختصر سا تعارف دیا ہوا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا اصل نام افتخار احمد قادری ہے اور الف ناظم ان کا قلمی نام ہے۔ انھوں نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے 2005 میں ایم۔فل (اردو) اور 2010 میں پی ایچ ڈی (اردو) کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ 'مصحفی اور مثنویات مصحفی' ان کی دوسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے 2010 میں ان کی ایک کتاب 'سرور جہاں آبادی: تحقیقی اور تنقیدی جائزے' منظر عام پر آچکی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'مصحفی اور مثنویات مصحفی' اردو کے معروف شاعر مصحفی کی مثنویات کے حوالے سے ہے۔ مصحفی کا شمار اردو کے اہم کلاسیکی شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا زمانہ میر کے بعد اور غالب سے پہلے کا ہے اور یہ انشاء، جرأت اور رنگین کے ہم عصر شعرا میں آتے ہیں۔ مصحفی کی فارسی تصانیف میں دو دیوان اور ایک تذکرہ 'عقد ثریا' کے نام سے ہے جس میں شعرا کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو تصانیف میں آٹھ دیوان اور دو تذکرے 'تذکرہ ہندی' اور 'ریاض الفصحا' کے علاوہ میر کی مثنوی 'دریائے محبت' کو دوبارہ 'بحر المحبت' کے نام سے نظم کیا۔

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا پہلا باب 'مصحفی امروہہ، آنولہ، دہلی اور لکھنؤ' کے نام سے ہے جس میں انھوں نے مصحفی کی زندگی، ان کے آبا واجداد کے احوال، مصحفی کی تعلیم وتربیت، مطالعہ، رہائش، ملازمت، شادی واولاد، مزاج ومیلان ان کی شاعری کا آغاز، سلسلہ تلمذ، مشاعروں سے ان کا شغف، بزم احباب سے ان کی وابستگی اور ان کی ہجرت نیز ان کی وفات تک کے تمام امور زیر بحث ہیں۔ کتاب کا دوسرا باب 'مصحفی کی زبان' کے نام سے ہے۔ مصنف نے اس باب میں مصحفی کی زبان کی خصوصیت کو بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک جگہ مصحفی کی زبان پر گفتگو کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "مصحفی کی زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے عوامی بول چال اور روزمرہ کے ساتھ ساتھ فارسی کی بہت سی خوش آہنگ ترکیبیں بھی نہایت سلیقے سے استعمال کی ہیں نیز ہندی اور مقامی بولی کے بہت سے لفظوں کا استعمال ان کے یہاں ملتا ہے جن سے نہ میر نے احتراز کیا نہ مصحفی نے بلکہ انھیں بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ حالانکہ ان کے پیش روؤں نے اصلاح زبان کے نام پر فارسی اور عربی کے الفاظ کو اردو میں داخل کرنے اور ہندی کے الفاظ کو خارج کرنے کا کام کیا تھا۔ مگر مصحفی کے زمانے تک اردو کو بمقابلہ فارسی کے ہندی

/ہندوی کہا جاتا تھا۔جس سے دیسی زبان مراد تھی۔اور میر و مصحفی کے یہاں دیسی زبان کے سیکڑوں الفاظ ملتے ہیں جن کے استعمال سے شاعری کی سادگی میں اضافہ ہوا ہے۔تیسرا باب مثنوی کی روایت کے نام سے ہے۔ جو اس کتاب کا عنوان بھی ہے۔اس باب میں مصنف نے مصحفی کی مثنوی اور ان کی فنی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا چوتھا باب ''اس کتاب کی علت غائی'' ہے۔ لہٰذا اسے پوری محنت وجاں کاہی سے تحریر کیا ہے مصنف نے اس میں مصحفی کی مثنوی نگاری کا مکمل تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے جو تقریباً پچاس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔اس تجزیے کی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے مصحفی کی ہر مثنوی پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اثبات دعویٰ کے لیے دلائل پیش کیے ہیں۔آخر میں مصحفی کے فکر و فن کے امتیازی خصائص کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔مصنف کا خیال ہے کہ مصحفی کی مثنویاں گرچہ فنی اعتبار سے بہت بلند پایہ نہیں ہیں باوجود اس کے زبان و بیان کے اعتبار سے یہ مثنویاں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب مصحفی اور ان کے عہد کے ادبی منظر نامے کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگی، علاوہ ازیں اس عہد کے تہذیبی ومعاشرتی مطالعے کے لیے بھی ان کی مثنویوں میں خاطر خواہ مواد موجود ہے۔اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ مصنف نے مصحفی کی ساری مثنویوں کو اکھٹا کر دیا ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔کلاسیکی شاعری کے شیدائیوں اور بالخصوص مصحفی کے چاہنے والوں کے لیے یہ حصہ نعمت غیر مترقبہ کا حکم رکھتا ہے۔الف ناظم کی یہ کتاب رطب و یابس سے پاک ہے اور ان کے تجزیاتی نتائج بھی قابل اعتبار معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ بعض مقامات پر اختلاف رائے کی صورت بھی نظر آتی ہے۔مگر یہ کتاب محتویات کے اعتبار سے بسیط ہے اور مصحفی کی مثنویات کے سلسلے میں اہم معلومات فراہم کرتی ہے۔ہر نئی تخلیق مختلف زاویوں اور مختلف پہلوؤں سے پڑھنے والے پر مختلف اثر ڈالتی ہے تاہم تالیف کے لیے جناب ڈاکٹر الف ناظم کو میں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی ہم تشنگان علم و ادب کی ضیافت طبع کے لیے ایسے ہی اہتمام کرتے رہیں گے۔

بُزدل

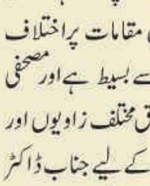

مصنف: نثار راہی

صفحات: 176، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

نثار راہی کا شمار اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آکر داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔

اس مجموعے میں شامل پہلا افسانہ 'اعتقاد' ہے۔لیکن یہ اعتقاد عقیدت مندی اور بھروسے والا اعتقاد ہے نہ کہ مذہبی عقیدے والا اعتقاد۔یہ افسانہ دراصل سماج کے ان پیشہ ور افراد کی نشاندہی کرتا ہے جو اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے علاج اور معالجے کے لیے بڑے سے بڑے ہاسپٹل اور اعلیٰ سے اعلیٰ ڈاکٹرس کی خدمات حاصل کرتے ہیں، خاص طور سے کینسر جیسے موذی مرض کے لئے جو ایک طرح سے لاعلاج مانا جاتا ہے۔جگدیش بنسل جیسے رئیس کو مرکز میں رکھ کر ایلو پیتھک اور آیورویدک ڈاکٹرس اور دواؤں کے سلسلے میں عوام الناس کے اعتماد اور اعتقاد کو پیش کر کے اس کی اصلیت اور افادیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیابی بھی ملی ہے۔یہ افسانہ موجودہ تناظر میں بہت اہم اس لیے ہے کہ یہ ایلو پیتھک ڈاکٹروں کی قلعی کھولتا ہے کہ وہ کس طرح اور کس کس بہانے پیسے وصول کرتے ہیں، اور وید جی بے چارے جو سستے داموں پر جڑی بوٹیوں سے ہر مرض کا علاج کرتے ہیں انھیں کس طرح سلاخوں کے پیچھے پہنچاتے ہیں اس کے پس پردہ کون کون سے افراد اور ان کی تجارتی ذہنیت کام کرتی ہے افسانے کے مطالعے سے یہ سب باتیں واضح ہوتی ہیں۔ دوسرا افسانہ 'کالا آسمان' ہے۔ دراصل یہ افسانہ فسادات کے دوران ہونے والے واقعات و حادثات اور ان واقعات کے پس پردہ سماج اور معاشرے میں وحشت و بربریت کا ننگا ناچ کس طرح کھیلا جاتا ہے اور اس میں پولیس، نیتا اور غنڈے مل کر کس طرح کے کارنامے انجام دیتے ہیں اور فسادات میں مسلم طبقے کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے اور اس میں جس طرح کی ذہنیت کام کرتی ہے ان سب کی قلعی کھولتا ہے۔فسادات کے دوران کرفیو نافذ ہو جانے سے زندگی کا نظام کس طرح درہم برہم ہو جاتا ہے اور انسان نفسیاتی، ذہنی، جسمانی اور معاشی و اقتصادی سطح پر کن کن اذیتوں سے دوچار ہوتا ہے یہ افسانہ ان تمام صورتِ حال کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

تیسرا افسانہ 'بُز دل' ہے جو کتاب کا عنوان بھی ہے۔اس میں فیروز کریم عرف اچھن میاں جو اس زمانے کے جاگیر دار تھے۔جاگیرداری نظام میں جو تہذیبی اور ثقافتی رکھ رکھاؤ ہوتا تھا وہ ساری چیزیں اچھن میاں کے گھر میں بھی تھیں مثلاً دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنا، سیر و تفریح کرنا، ادبا و شعرا کے ساتھ ادبی و شعری محفلیں منعقد کرنا، شام کو رقص و موسیقی سے رنگین بنانا، طرح طرح کے خورد و نوش کا انتظام کرنا یہ سارے تہذیبی نقوش کی جھلکیاں اچھن میاں کے گھر میں موجود تھیں۔لیکن اچھن میاں کے دونوں بیٹے عادل کریم اور ارشد کریم جن کی پرورش و پرداخت اسی باذوق ادبی گھرانے میں ہوئی تھی مگر دونوں کے مزاج میں کافی فرق تھا۔عادل خاموش مزاج اور سادہ لوح تھا جبکہ ارشد بہت شوخ مزاج اور چنچل ہونے کے ساتھ ساتھ جذباتی بھی تھا چنانچہ فرط جذبات سے مغلوب ہو کر ارشد اور قیصر پاک دامنی کے سرحد کو پار کر کے لذتوں کے حدود میں کس طرح داخل ہوئے اور لذتوں سے فیضیاب ہونے کے بعد قیصر کی زندگی میں کس طرح کا طوفان آتا ہے اور ارشد قیصر سے لذت حاصل کرنے کے بعد کس طرح بُزدلی کا مظاہرہ کرتا ہے وہ اس افسانے کے مطالعے سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔اس افسانے میں ارشد، قیصر اور ماجد کے در پردہ اس عہد کے جاگیر دارانہ نظام جس میں شاعروں کے قہقہے اور دوشیزاؤں کے رنگ برنگ آنچل میں کس طرح راتیں گذرتی تھیں اور سماج اور معاشرے سے تہذیب و ثقافت کے ساتھ ادبی و شعری ماحول کس طرح زوال پذیر ہوتا جا رہا تھا، افراد اور اشخاص کے ذوق میں کس طرح کی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور قدیم و جدید تہذیب و ثقافت میں کشمکش اور تصادم کس طرح ہو رہا تھا، وہ اس افسانے کی قرأت سے واضح ہوتا ہے۔ایک افسانہ 'گائے' ہے جس میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ گائے گائے ہوتی ہے وہ دیسی یا بدیسی نہیں ہوتی۔ایک اور افسانہ 'دو بوڑھے' میں پیار و محبت کے جس جذبے کو پیش کیا گیا ہے قابل قدر ہے اور 'حلالہ' میں طلاق جیسے شرعی اور حساس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جس سے حلالہ کی صورت اور اس کے اسباب و علل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔حلالہ کی صورت میں ایک غیرت مند خاتون کن کن اذیتوں سے گذرتی ہے اور آخر میں اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے وہ اس افسانے کے مطالعے سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ علاوہ 'وہ فون پر آیا' کہانی ایک پرستار کی 'بوسہ موت کا' 'منحوس، خراب عورت اور وہ جو ابھی پیدا نہیں ہوا قابل ذکر ہیں جس میں عصر حاضر کے مسائل کا کھل کر اظہار ہوا ہے۔نثار راہی کے بیشتر افسانے موجودہ عہد کے سلگتے ہوئے موضوعات کا حصہ ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں قبولیت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ ■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

فروغ اردو کے لیے بہتر کام کر رہی ہے قومی اردو کونسل: پرکاش جاوڈیکر

نئی دهلی: مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پرکاش جاوڈیکر نے قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کارکردگی، فروغ اردو کے لیے اس کے منصوبے، اقدامات اور لائحۂ عمل کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ وسیع تر پیمانے اور مختلف سطحوں پر قومی اردو کونسل اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے بہتر خدمات انجام دے رہی ہے۔ مرکزی وزیر نے راجیہ سبھا میں وقفۂ سوالات کے دوران اردو زبان کے فروغ اور نشر و اشاعت کے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا کہ قومی اردو کونسل نے 1250 کتابیں شائع کی ہیں اور یہاں سے 2 ماہنامہ رسالے 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سہ ماہی رسالہ 'فکر و تحقیق' بھی شائع ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کونسل کی خریداری اسکیم کے تحت جہاں 553 کتابیں اور 57 مجلّات خریدے گئے وہیں 223 مسودات کو مالی تعاون بھی دیا گیا۔ اس کے علاوہ کونسل کی جانب سے کئی اہم سمینار اور لیکچرز کا اہتمام کیا گیا۔ 5 سے 7 فروری تک ایک عالمی اردو کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں جو سفارشات اور تجاویز پیش کی گئی ہیں اس پر غور و خوض کرکے ہم ایک مربوط اور منظم لائحۂ عمل ترتیب دیں گے۔ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پرکاش جاوڈیکر نے قومی اردو کونسل کی طرف سے منعقدہ 200 سالہ جشن صحافت کا بطور خاص ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ملک کے مختلف حصوں کولکاتا، پٹنہ اور سری نگر وغیرہ میں اردو صحافت کے 200 سال کے موضوع پر سمینار کیا گیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں قومی اردو کونسل کی طرف سے منعقد کیے جانے والے اردو کتاب میلے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس میلے کا انعقاد ہر سال کیا جاتا ہے اور اس سال یہ کتاب میلہ اور بھی بہتر ہوگا۔ اس میں میں خود بھی شرکت کروں گا اور دوسرے ممبران پارلیمنٹ بھی اس میلے کا حصہ بنیں گے۔ محترم پرکاش جاوڈیکر نے 'ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن بزنس اکاؤنٹنگ اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی' (Diploma in Computer Applications Business Accounting and Multilingual DTP) کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل کا یہ پروگرام سیدھے روزگار سے جڑا ہوا ہے۔ تقریباً ایک لاکھ انسٹھ ہزار طالب علموں کو ڈپلوما کورس کی ڈگری دی گئی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ڈیڑھ لاکھ طالب علموں کو اس سے روزگار بھی ملا ہے۔ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی کے وزیر نے کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن کورس کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس سے تقریباً 2800 طلباء جڑے ہوئے ہیں اور اس سے ان لوگوں کو روزگار بھی ملے گا۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کے فاصلاتی تعلیم کے تحت اردو ڈپلوما کورس کے حوالے سے بھی کہا کہ اس میں تقریباً 73000 طالب علموں نے داخلہ لیا ہے۔ یہ سب کورس مکمل کر رہے ہیں۔ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پرکاش جاوڈیکر نے قومی اردو کونسل کی مختلف اسکیموں اور منصوبوں کی بھرپور ستائش کی اور کونسل کے حسن کارکردگی پر اپنی مہر ثبت کردی۔ انھوں نے فروغ اردو کے لیے اپنے عزم کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ نئی صبح ہے۔ ہم کچھ اور نئی شروعات کرنے جا رہے ہیں جس سے اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کا فروغ ہوگا۔

راجیہ سبھا میں قومی اردو کونسل کی کارکردگی کی ستائش پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وزیر محترم کی حوصلہ افزائی نے قومی اردو کونسل کے کارکنان میں ایک نیا جوش ولولہ بھر دیا ہے۔ اب ہم مزید فعالیت اور مستعدی کے ساتھ فروغ اردو کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ پرکاش جاوڈیکر جی کے وژن سے قومی اردو کونسل ترقی کی نئی منزلیں طے کرے گی اور فروغ اردو کے تعلق سے ہمارے ذہنوں میں جو خواب اور منصوبے ہیں وہ سب پایہ تکمیل کو پہنچیں گے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 اگست 2016

اردو، عربی و فارسی زبانوں کا فروغ اتحاد و اتفاق سے ہی ممکن ہے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام اردو، عربی و فارسی زبانوں کے فروغ پر ایک مذاکرے کا انعقاد

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے سمینار ہال میں منعقدہ ایک مذاکرے میں مسلم راشٹریہ منچ کے صدر جناب اندریش کمار نے کہا کہ زبانوں کی ترقی میں ملک کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔ جب تک زبانوں کا فروغ نہیں ہوگا ملک آگے نہیں بڑھے گا۔ انھوں نے زبانوں کی ترقی کے لیے مذاکرات کو ضروری قرار دیا۔

اس موقعے پر قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سبھی مہمانوں کا استقبال کیا اور اس پروگرام کی غرض و غایت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو، عربی و فارسی زبانوں کا فروغ اتحاد و اتفاق سے ممکن ہوسکتا ہے۔ ہم سب کو کندھا سے کندھے ملا کر ان زبانوں کے فروغ کے لیے قدم بڑھانا ہوگا۔ کونسل کے وائس چیئر مین پدم شری مظفر حسین نے اندریش کمار کا استقبال کرتے ہوئے انھیں گنگا جمنی تہذیب کی علامت بتایا۔ انھوں نے اردو زبان کے سلسلے میں کونسل کی کوششوں کی ستائش کی اور موجودہ حکومت کو بھی اردو کا مسیحا اور خیر خواہ قرار دیا۔ اس موقعے پر ممبئی سے تشریف لائے بدھ مذہب کے ممتاز رہنما نے بھی کونسل کے اس قدم کی ستائش کی اور اردو زبان کے فروغ کو وقت کی ضرورت بتایا۔ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے ایک عہدے دار جناب چامو شاستری نے اس موقعے پر بڑی عالمانہ گفتگو کی اور اردو کی ترقی میں کونسل کی سرگرمیوں کو قابل اطمینان قرار دیتے ہوئے کہا کہ زبانیں کبھی بھی حکومت یا سیاست کی پابند نہیں رہی ہیں اور اس ملک میں تمام زبانوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں اور اردو زبان کی مٹھاس کا پورا عالم گواہ ہے۔ سنگھ کے مشہور لیڈر شیام جاجو نے بھی اس موقعے پر اظہارِ خیال کیا۔ کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب اجمل سعید نے کونسل کی کارگزاریوں اور سرگرمیوں کو پاور پوائنٹ پریزنٹیشن کے ذریعے پیش کیا۔ اس پروگرام میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد، سابق وائس چانسلر پروفیسر سید شاہد مہدی، پروفیسر طاہر محمود، پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر عین الحسن، پروفیسر علیم اشرف، جناب فاروق ارگلی، محترمہ شبانہ نذیر، ڈاکٹر حسنین اختر، جناب عظیم اختر، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر جمیل اختر، ڈاکٹر مشتاق قادری، ڈاکٹر ساجد حسین، ڈاکٹر اکبر شاہ، جناب یاسر جیلانی وغیرہ موجود تھے۔

کونسل کے ممبران میں جناب اقبال خان، محترمہ شمع خان، جناب جاوید علی خان اور منوری بیگم کے علاوہ تینوں جامعات کے اساتذہ وطلبا موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 22 جولائی 2016

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام اردو، عربی و فارسی زبانوں کے فروغ پر ایک مذاکرہ

اردو میں قانونی ادبیات پر توجہ دینے کی ضرورت: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں لیگل اسٹڈیز پینل کی میٹنگ

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا مقصد یہ ہے کہ قانون کے حوالے سے جو مسائل اور معلومات اردو اور دیگر زبانوں میں ہیں انھیں منظر عام پر لایا جائے اور اسی مقصد سے کونسل قانون کی اہم کتابیں شائع کرنا دیا۔ اس میٹنگ کی صدارت ماہر قانون پروفیسر طاہر محمود نے کی۔ انھوں نے اس موقع پر پینل سے خطاب کرتے ہوئے کئی اہم نکات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ہندوستان میں اردو کی دستوری اور قانونی حیثیت کے حوالے سے کہا کہ میں قانون اور آئین سے متعلق کتابوں کی اشاعت کرتی ہے تاکہ اردو داں حلقہ قانونی نکات اور باریکیوں سے واقف ہو سکے۔ اس موقع پر پینل نے کئی اہم فیصلے لیے جس میں پروفیسر طاہر محمود کی اہم کتاب 'بک آن مسلم لاء'

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں 'لیگل اسٹڈیز پینل' کی میٹنگ

چاہتی ہے۔ کونسل اس سال کے اخیر میں 'ہندوستان میں اردو کی دستوری اور قانونی حیثیت' کے عنوان سے سہ روزہ قومی سمینار کا انعقاد بھی کرنا چاہتی ہے۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں منعقدہ لیگل پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ موضوع کے اعتبار سے اس سمینار کی معنویت اور افادیت بڑھ جاتی ہے۔ انھوں نے اردو زبان میں قانونی لٹریچر کے اشاریہ کی اشاعت پر بھی زور آج تک کوئی کتاب، مونوگراف یا ایسے مضامین منظر عام پر نہیں آئے جس کی سند پیش کی جا سکے۔ انھوں نے سمینار کے حوالے سے کہا کہ ایسے لوگوں کو مدعو کیا جانا چاہیے جو قانون کی اچھی جانکاری رکھتے ہوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ اردو کس ریاست کی پہلی زبان ہے اور کن صوبوں میں دوسری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان سب باتوں کی جانکاری اس سمینار سے ہمیں مل سکتی ہے۔

واضح رہے کہ اس پینل کے تحت کونسل اردو زبان کے اردو ترجمے کی ذمے داری پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم کو دی گئی اور ڈاکٹر ظفر محفوظ نعمانی کا مسودہ انٹرنیشنل لاء اور خواجہ عبدالمنتقم کا مسودہ 'ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر ایک عظیم شخصیت و معمار آئین' کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس میٹنگ میں پروفیسر طاہر محمود، پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم، ڈاکٹر محمد ظفر محفوظ نعمانی، ڈاکٹر افضل قادری، سید اقبال احمد، جناب یاسر جیلانی، محترمہ شمع کوثر یزدانی اور کونسل کے دیگر افراد موجود تھے۔ پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 جولائی 2016

سی۔ عبدالحکیم کالج میں جلسہ تقسیم اسناد

تمل ناڈو: سی۔ عبدالحکیم کالج میل وشارم تامل ناڈو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا علاقائی مرکز قائم ہے۔ جہاں اردو ڈپلوما کورس، عربی سرٹیفکیٹ کورس اور عربی ڈپلوما کورس کی تعلیم جاری ہے۔ جس میں امسال 100 طلبا و طالبات نے ڈپلوما اردو لینگویج اور 150 طلبا و طالبات نے سرٹیفکیٹ ان فنکشنل عربک اور ڈپلوما کورس ان عربک کی اسناد حاصل کیں۔ اس سلسلے میں ایک شاندار اجلاس 4 اگست 2016 کالج آڈیٹوریم میں منعقد کیا گیا تھا۔ جلسہ کی صدارت جناب الحاج ایس زیڈ ابراراحمد صاحب کرسپانڈنٹ کالج ہذا نے کی۔ جناب ڈاکٹر ایس اے ساجد صاحب پرنسپل کالج ہذا نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر ایس محمد یاسر صاحب صدر، شعبۂ اردو اور کوآرڈی نیٹر، این سی پی یو ایل نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ مہمانِ خصوصی جناب سی۔ قیصر احمد صاحب، جنرل سکریٹری، وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی اور مہمانِ اعزازی محترمہ ڈاکٹر گیو بھرنی صاحبہ، طبی معالج وڈیابٹالجسٹ، مدرس کیر ڈیابیٹس سنٹر، ویلور نے جلسے سے خطاب فرمایا۔ کامیاب طلبا و طالبات کو صدر، نائب صدر اور جنرل سکریٹری میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے مبارک باد پیش کی اور جناب الحاج ایس زیڈ ابراراحمد صاحب کرسپانڈنٹ کالج ہذا نے اسناد تقسیم کیں۔ جلسہ میں عمائدین شہر اخبار و رسائل اور الکٹرانک میڈیا کے صحافی اور نامہ نگار شریک تھے۔ مولوی

حافظ عبدالرؤف صاحب استاد، این سی پی یو ایل نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ قومی ترانہ پر جلسہ کا اختتام ہوا، جناب مفتی فردوس احمد صاحب استاد، این سی پی یو ایل نے جلسہ کی نظامت فرمائی۔ جلسے کے بعد پرتکلف ضیافت کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد یاسر، کوآرڈینیٹر، این سی پی یو ایل مرکز، میل وشارم، تمل ناڈو، 7 اگست 2016

اردو میں بھی OCR کی ضرورت: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں 'لسانیات اور سماجی لسانیات' پینل میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: آج کے بدلتے حالات میں نئی ٹیکنالوجی کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس کے بغیر ترقی کا سفر طے کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اردو میں ایک او سی آر (Optical Character Recognition) کی اہم ضرورت ہے۔ اس وقت ملک کی دوسری زبانوں مثلاً بنگلہ، ہندی اور تمل میں یہ سہولیات فراہم ہیں۔ اس ٹیکنالوجی کی مدد سے مسودے یا کتابوں کی اشاعت کے لیے اس کے صحیح کیریکٹر کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس کے ذریعے ٹائپ کیے ہوئے الفاظ کو تصویروں میں بھی شناخت کرنا ممکن ہوجائے گا۔ یہ باتیں قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے لسانیات اور سماجی لسانیات پینل کی منعقدہ میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے اردو اور لسانیات کے گہرے رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج کے دور میں لسانیات اور خاص طور پر سماجی لسانیات کے دائرے کو مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ اس پینل کی صدارت ماہرِ لسانیات پروفیسر عبدالستار دلوی نے کی۔ اس اجلاس میں کتابوں کی اشاعت کے لیے کئی اہم فیصلے لیے گئے اور اسے مقررہ اہداف میں شائع کرنے پر زور دیا گیا۔ کونسل سے شائع شدہ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا کو کونسل کے ویب سائٹ پر اَپ لوڈ کردینے کی تجویز بھی پیش کی گئی جس پر تمام ممبران نے اتفاق رائے کا اظہار کیا۔ لسانیات پینل کے ممبران نے فرہنگ نویسی کے اصول وضوابط طے کرنے پر زور دیا تاکہ آئندہ لغات کی ترتیب وتشکیل ان رہنما خطوط کی روشنی میں کی جاسکے۔ اس کے لیے سہ رکنی کمیٹی کی تشکیل دی گئی جو اکتوبر کے آخر تک رپورٹ پیش کرے گی۔

اس موقعے پر ممبران نے پنڈت دتاتریہ کیفی کی کتاب 'کیفیہ'، مولوی عبدالحق کی 'فارسی کے اثرات مراٹھی پر' اور 'اصطلاحات پیشہ وران' جیسی نادر و نایاب کتابیں جو اب دستیاب نہیں ہیں ان کی دوبارہ اشاعت پر زور دیا۔

اس میٹنگ میں پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر اُودے نرائن سنگھ، پروفیسر علی رفاد فتیحی، پروفیسر اومکار این کول، پروفیسر غضنفر علی، پروفیسر ایس امتیاز حسنین، پروفیسر پنچانند موہنتی، ڈاکٹر آر کے بھٹ اور جناب ملک العزیز کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اکیڈمک اسسٹنٹ ڈائرکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم، مسرت جہاں کے علاوہ کونسل کے دیگر افراد نے شرکت کی۔

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں لسانیات اور سماجی لسانیات پینل کی میٹنگ

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 10 اگست 2016

یوم آزادی شہیدان وطن کو یاد کرنے کا دن ہے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں جشنِ آزادی کا اہتمام

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند کے صدر دفتر میں 70 ویں یوم آزادی کے موقعے پر پرچم کشائی کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں کونسل کے تمام ذمے داران اور عملے نے شرکت کی۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے پرچم کشائی کی اور کونسل کے عملے نے ہندوستان کا قومی ترانہ 'جن گن من' بلند آواز میں پیش کیا۔ سبھی اسٹاف نے ترنگے کو سلامی بھی دی۔ اس موقعے پر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ یوم آزادی ہمارے شہیدوں کو یاد کرنے کا دن ہے۔ انھوں نے کتنی مشکلوں سے وطن پر اپنی جان قربان کر کے ہمیں آزادی جیسی نعمت عطا کی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم آزادی کی اہمیت کو سمجھیں اور ملک کی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔ انھوں نے آزادی کی جدوجہد میں اردو زبان کے کردار پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ہماری تہذیب کا حصہ ہے اور اس زبان نے ہمیشہ سے ملک میں امن و اتحاد اور قومی یکجہتی کا درس دیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس زبان کے فروغ کے لیے اپنی اپنی سطح پر ہر ممکن کوشش کریں اور اپنے بچوں کو اردو زبان کی تعلیم ضرور دیں۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے مزید کہا کہ اردو نے ملک کی تحریک آزادی میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں اردو صحافت اور شاعری کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اسی لیے ملک کی آزادی میں اردو زبان کے رول کے حوالے سے اسکولی نصابوں میں ایک باب کو شامل کیا جانا چاہیے تاکہ نئی نسل اردو زبان کے حقیقی کردار سے واقف ہوسکے۔

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں جشن آزادی کا اہتمام

اس موقعے پر قومی کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر انتظامیہ جناب کمل سنگھ نے بھی یوم آزادی پر اپنی نیک خواہشات پیش کیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 اگست 2016

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

الطاف حسین حالی کی ادبی اہمیت

پٹنہ: حالی نے اپنی شاعری میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور مسلمانوں کے حالات کی جو عکاسی کی ہے وہ بے مثال ہے۔ یہ بات پروفیسر سعید عالم نے حالی کی شاعری کے

پس منظر میں انجمن ترقی اردو بہارا ور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقدہ سمینار میں کہی۔ انھوں نے کہا کہ حالی، سرسید اور شبلی نعمانی اس قوم کے سرمایہ ہیں جن کی تاریخوں سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے جبکہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے کہا کہ حالی ایک بڑے عہد ساز تھے۔ ان کی فکر کی گہرائی ان کے کلام سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر شہپر رسول نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ حالی نے اپنی شاعری سے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگایا جو ادب کے ساتھ قوم کی بھی بڑی خدمت ہے۔ انھوں نے ان کے کلام کے مختلف گوشوں کی طرف بھی اشارہ کیا اور کہا کہ وہ صرف ایک بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم نقاد بھی تھے۔

ڈاکٹر واحد نظیر نے حالی کی ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے انھیں بڑا نباض بتایا اور کہا کہ ان کی شاعری مسلمانوں کو پستی سے نکال کر بلندی تک پہنچانے والی ہے۔ ڈاکٹر صفدر امام قادری نے سمینار کی نظامت کرتے ہوئے حالی کے کئی اہم گوشوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ حالی، سرسید اور شبلی نعمانی بنیادی طور پر مورخ ہیں جن کے بغیر اردو ادب کا کارواں آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ ان کی ادبی خدمات انمول ہیں جسے تاریخ سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کا جو جتن کیا انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مقالہ نگاروں میں محمد عقیل، اظہار الحق صدیقی کے علاوہ زیادہ تر تعداد یونیورسٹی کے طلبا وطالبات کی تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جولائی 2016

علامہ اقبال کی شخصیت اوران کی خدمات

جموئی: ویلفیئر سوسائٹی آڑھا ضلع جموئی باشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بہ عنوان 'علامہ اقبال کی شخصیت اوران کی خدمات' کے موضوع پر بہ تاریخ 4 اگست بمقام آڑھا میں ایک سمینار منعقد کیا گیا۔ اس سمینار کی صدارت پروفیسر غفار نے کی جبکہ نظامت کے فرائض جناب محمد کلام سائی نے انجام دی۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر غفار نے علامہ اقبال کی ہمہ جہت شخصیت اوران کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت جو دنیا کے حالات ہیں ایسے میں علامہ اقبال کی شاعری کی اہمیت اور افادیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ انھوں نے انسان دوستی کا جو پیغام دیا ہے ہمیں

اپنی زندگی میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ اس پروگرام میں ملک کے معروف ادبا وشعرا نے شرکت کی جن میں پروفیسر اعظم، پروفیسر شیخ جہانگیر کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس موقعے پر دیگر شعرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ پروگرام کا اختتام قاری اکرام کے شکریے پر ہوا جبکہ اس اجلاس میں عمائدین شہر کے علاوہ طلبہ وطالبات کی بڑی تعداد موجود تھیں۔

پریس ریلیز: محمد کلام سائی، سکریٹری نوسائیں ویلفیئر سوسائٹی آڑھا، 9 اگست 2016

سہ ماہی 'فکر وتحقیق' کا خاکہ نمبر

'ناول نمبر' کے بعد قومی اردو کونسل کے علمی، تحقیقی مجلّہ سہ ماہی 'فکر وتحقیق' کا ایک شمارہ 'خاکہ نگاری' پر مبنی ہوگا جس میں خاکہ کے فن، روایت پر تحریروں کے علاوہ مشاہیر خاکہ نگاروں پر مضامین اور ادبی شخصیات کے اہم نادر ونایاب شخصی خاکے بھی شائع کیے جائیں گے۔ اہل قلم حضرات سے تعاون کی درخواست ہے۔ آپ کے غیر مطبوعہ مضامین مع حوالہ جات کم سے کم 8000 الفاظ پر مشتمل ہونے چاہئیں۔ نگارشات درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں:

ft.ncpul@gmail.com

ایک شمارہ رفتگاں کے نام

ماہنامہ 'اردو دنیا' 2016 میں وفات پانے والی علمی وادبی شخصیات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اس سال کے آخر میں 'ایک شمارہ رفتگاں کے نام' شائع کرے گا جس میں مرحومین پر تعزیتی تحریریں شامل کی جائیں گی۔ قلم کاروں سے درخواست ہے کہ اپنی غیر مطبوعہ تحریریں درج ذیل ای میل آئیڈیز پر ارسال کریں:

urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

خواجہ امیر خسرو- حیات و خدمات

نئی دھلی: حضرت خواجہ امیر خسرو علیہ الرحمہ کے

712 ویں عرس مبارک کے موقعے پر خواجہ حال میں حسب معمول خواجہ سید محمد نظامی کی سرپرستی میں ایک سمینار بعنوان 'خواجہ امیر خسرو- حیات و خدمات' منعقد کیا گیا، جس میں پروفیسر اختر الواسع نے خواجہ امیر خسرو علیہ الرحمہ کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب یا مشترکہ ثقافت کے بانی تھے۔

خواجہ امیر خسرو دہلی کے سب سے پہلے قصیدہ خواں تھے۔ انھوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی رہنمائی میں بسنت کا تہوار منایا جو 800 سالوں سے آج تک منایا جاتا ہے۔ انھوں نے اس زبان کی بنیاد ڈالی جسے آج ہم اردو و ہندی کے نام سے جانتے ہیں۔ انھوں نے اپنے پیر و مرشد کی ذات مبارک سے وابستہ رہ کر ملک میں تصوف کو علمی و عملی سطح پر فروغ دیا۔ خواجہ سید محمد نظامی نے کہا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سلاطین کے دربار میں کبھی نہیں گئے لیکن خواجہ امیر خسرو جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیا نے ان سے فرمایا کہ تم سلاطین کے دربار میں جا کر ان کی اصلاح کیا کرو اور ان کو عوام پر ظلم کرنے سے روکو۔

غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ خواجہ امیر خسرو فارسی کے ادیب شاعر تھے، ان کا کلام ایک عمر میں نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔ اردو میں ان کا کلام بہت کم ہے۔ تقریب میں سید اعظم علی نظامی، افضل منگلوری، روشن دستوری، امت گوئل، نتن سینی، سید عبدالرب (دبئی)، آصف علی فہمی، فضل محمود، ہمدرد کے متولی حامد احمد سمیت کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 جولائی 2016

یادِ رفتگاں کے موضوع پر سمینار

بھوپال: 10 جولائی 2016 کو صبح دس بجے دن سمینار کے پہلے اجلاس کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی مسند صدارت پر عالی جناب پروفیسر اختر الواسع سابق صدر قومی اقلیتی لسانی کمیشن حکومت ہند رونق افروز تھے۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر عزیز قریشی سابق گورنر اتراکھنڈ رونق افروز تھے۔ کلیدی خطبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد نعمان خاں استاد NCERT دہلی نے پیش کیا۔ سابق گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی نے یادِ رفتگاں کے عنوان سے منعقد سمینار میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بھوپال تہذیب اور بھائی چارہ کی ایک مثال ہے۔ یہاں کے لوگ امن پسند ہیں اور وقتاً فوقتاً اس کے ثبوت بھی سامنے آئے ہیں۔ بھوپال میں نواب اور بیگمات ضرور مسلمان تھے لیکن ان کے وزیراعظم بااختیار ہندو ہوا کرتے تھے لیکن سب کی جان اور مال کی حفاظت ہوتی تھی۔ پروفیسر اختر الواسع نے اپنی صدارتی تقریر میں مدھیہ پردیش میں زبان و ادب کی قدامت اور اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بھوپال نے کئی میدانوں میں تاریخی کام کیے۔ یہ شہر 'بغداد الہند' کہلایا۔ یہاں ایک کے بعد ایک چار بیگمات نے نہایت کامیاب طریقے سے حکومت کی اور دنیا کی سب سے پہلی مسلمان خاتون چانسلر نواب سلطان جہاں بیگم بھی اسی علاقے کی حکمراں تھیں۔ انھوں نے کہا کہ سعدیہ خان نے 'یادِ رفتگاں' منعقد کر کے اسی سنہری روایات کی تجدید کی ہے۔ سمینار کے آغاز میں پروفیسر محمد نعمان خاں صاحب نے کلیدی خطبہ میں مدھیہ پردیش کے مختلف علاقوں بالخصوص گوالیار، اندور، اجین، کھنڈوہ، جبلپور، ساگر، سرونج اور بھوپال کی شعری خصوصیات پر شعرا کے اشعار کے وسیلے سے روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر یادِ رفتگاں کے عنوان سے ایک سوینیئر (Souvenior) کا اجرا بھی ہوا۔ نگر نگم کے سابق کمشنر دیوی سرن جی نے بھوپال اور مالوہ کی شخصیات پر گفتگو کی۔ پروفیسر ڈاکٹر شافع قدوائی صدر شعبہ ماس کمیونیکیشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے صارف دور میں اپنی تہذیب، ادب اور معاشرت کے تاریخی پہلوؤں کو یاد کرنے کی ضرورت و اہمیت واضح کرتے ہوئے یادرفتگاں کے عنوان سے سمینار کے انعقاد کو نہایت اہم قرار دیا۔ انھوں نے سرسید اور علی گڑھ تحریک میں بھوپال کے کردار پر اظہار خیال کیا۔ ہندی کے سینئر صحافی اور سرکاری قومی ایکتا کمیٹی کے نائب صدر رمیش شرما نے بھوپال کی قدامت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ دنیا کے جو بیس بائیس قدیم علاقے شناخت کیے گئے ہیں اور جہاں سے انسان نے جینا سیکھا۔ اس میں بھوپال شامل ہے۔ سینئر صحافی اور قلم کار دیوی سرن نے بھوپال کی گنگا جمنی تہذیب اور اس کے اثرات کے تعلق سے اپنے تجربات پیش کیے۔ ابتدا میں سوسائٹی کے صدر جناب حیدر یار خاں صاحب اور سوسائٹی کے دوسرے عہدے کے ممبران نے مہمانوں کا پھول اور ہار سے استقبال کیا۔ اس کے بعد سوسائٹی کی سکریٹری سعدیہ خان نے شکریے کے ساتھ استقبالیہ تقریر میں سوسائٹی کا تعارف پیش کیا۔ سمینار کے دوسرے سیشن کی اقبال مسعود نے صدارت کی۔ انھوں نے اس موقعے پر کہا کہ ہم نے سمینار کے تمام مقالات کو ایک کتابی شکل میں بہ عنوان 'رفتگاں' شائع کر دیا ہے، جس کا آج عزت مآب عزیز قریشی صاحب نے افتتاح کیا تا کہ سند رہے۔ سمینار میں پروفیسر آفاق حسین صدیقی، پروفیسر مختار شمیم، کوثر صدیقی، ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں، ضیا فاروقی، پروین کیف، ساجد پریمی اور محمود ملک نے مقالات پیش کیے۔ سمینار کے دونوں سیشنوں کی نظامت بدر واسطی نے انجام دی۔

پریس ریلیز: حیدر یار خاں، سعدی ویمن والینٹری سوشل سروس سوسائٹی، بھوپال، 15 جولائی 2016

'علی جواد زیدی کے فن اور شخصیت' پر منعقدہ سمینار

علی جواد زیدی: فن اور شخصیت

لکھنؤ: ساہتیہ اکادمی کے تحت رائے اوماناتھ بلی آڈیٹوریم میں علی جواد زیدی کے 'فن اور شخصیت' پر سمپوزیم منعقد کیا گیا۔ اس سمپوزیم کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر شارب ردولوی نے کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمیں اپنے بزرگوں کو یاد رکھنا چاہیے تاکہ ہم اپنے ادب کو پرکھ سکیں۔ یہ سمپوزیم اس بات کا ثبوت ہے کہ علی جواد زیدی ہمارے ذہنوں اور دلوں میں زندہ و تابندہ ہیں۔ انھوں نے ساہتیہ اکادمی کا بھی شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر انیس اشفاق نے تفصیلی طور پر علی جواد زیدی کے تمام فنی پہلوؤں پر گفتگو کی اور کہا کہ جواد زیدی ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جو ہمہ جہت تھی ان کے تحقیقی اور تنقیدی کارنامے ایسے ہیں جن پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شافع قدوائی نے کی اس میں وضاحت حسین رضوی، رضا حیدر اور پروین شجاعت نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ صدارتی تقریر میں شافع قدوائی نے کہا کہ تمام مقالہ نگاروں نے اپنا اپنا حق ادا کیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت فیاض رفعت نے کی۔ اس اجلاس میں عنبر بہرائچی، شاہنواز قریشی اور وسیم بیگم نے مقلے پڑھے۔ اس موقعے پر لکھنؤ کی اہم شخصیات موجود تھیں۔ ساہتیہ اکادمی، دہلی کی جانب سے محمد موسیٰ رضا نے شرکت کی اور سمپوزیم کے انعقاد میں اہم رول ادا کیا۔ اجلاس کے اختتام پر ڈاکٹر وسیم بیگم نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ واضح رہے کہ 2016 میں علی جواد زیدی کی پیدائش کو 100 برس پورے ہوگئے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 جولائی 2016

چھ روزہ تربیتی پروگرام کا انعقاد

نئی دهلی: شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور قومی ترجمہ مشن میسور کی جانب سے انڈیا عرب کلچر سینٹر کے سمینار ہال میں چھ روزہ ٹرانسلیشن تربیتی پروگرام کا افتتاح ہوا۔ آغاز یاسر عباس نے تلاوت کلام پاک سے کیا اور نظامت پروفیسر عبدالحلیم صدر شعبۂ فارسی نے کی مہمانوں کا استقبال ڈاکٹر عبدالحلیم قومی ترجمہ مشن میسور نے کیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر علی رفاد فتیحی شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے شرکت کی اور صدارت پروفیسر محمد اسدالدین ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجز نے کی۔ ڈاکٹر عبدالحلیم نے قومی ترجمہ مشن میسور کے اغراض و مقاصد کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس ادارے کا قیام 2008 میں عمل میں آیا اور اس مشن کے دیگر مقاصد میں یہ بھی ہے کہ مترجمین کے لیے تربیتی پروگرام چلایا جائے۔ یہ اسی سلسلے کا پروگرام ہے۔ پروفیسر

فتیحی نے اپنے کلیدی خطبے کے دوران کہا کہ ترجمہ دراصل کسی متن کی لسانی منتقلی کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمہ کو بالعموم اطلاقی لسانیات کی ایک اہم شاخ سمجھا جاتا ہے۔ بعض ماہرین کے خیال میں ترجمے کو تین خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: بین لسانی ترجمہ، درون لسانی ترجمہ اور رمزی ترجمہ۔ بین لسانی ترجمے میں متن کی منتقلی کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں ہوتی ہے جبکہ درون لسانی ترجمہ میں زبان کے کسی ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب میں Inter Semiotic ترجمہ کی اصطلاح کے تحت متن کی منتقلی کسی ایک کوڈ سے دوسرے کوڈ میں ہوتی ہے۔ پروفیسر اسدالدین نے صدارتی خطبے کے دوران کہا کہ مترجمین تو بہت ہیں لیکن ترجمہ کے میدان میں اصل مترجمین کا فقدان ہے۔ ضرورت ہے انھیں ترجمہ کے نکات سے آشنا کیا جائے اور اس طرح کے پروگرام مترجمین کے لیے سودمند ثابت ہوں گے۔ پروگرام کے انعقاد کے لیے شیخ الجامعہ پروفیسر طلعت احمد، رجسٹرار، او ایس ڈی اور کارگزار ڈائرکٹر انڈیا عرب کلچر سینٹر ڈاکٹر جاوید احمد خان کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں خاص طور سے اساتذہ کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے طلبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

6 روزہ ٹرانسلیشن تربیتی پروگرام کے اختتامی اجلاس کی نظامت شعبۂ فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے کی۔ مسند صدارت پر پروفیسر عراق رضا زیدی جلوہ افروز ہوئے اور مہمانوں کا استقبال ڈاکٹر عبدالحلیم قومی ترجمہ مشن میسور نے کیا، کلیدی خطبہ ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے پیش کیا اور کلمات تشکر صدر شعبۂ فارسی پروفیسر عبدالحلیم نے ادا کیے۔ ڈاکٹر فاروقی نے اپنے خطبے میں ترجمے سے متعلق تمام رموز و نکات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ صدر مجلس پروفیسر عراق رضا زیدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ مترجمین کے لیے یہ چھ روزہ تربیتی پروگرام نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس پروگرام میں شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے نمائندوں نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اس پروگرام میں شرکت کرکے اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کا موقع ملا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جولائی و 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 جولائی 2016

جشن آم غالب اور بیسنی روٹی

لکھنؤ: شمالی ہندوستان کی سب سے بڑی فعال، مقبول اور مشہور تعلیمی تنظیم ارم ایجوکیشنل سوسائٹی اندرا نگر لکھنؤ کے زیر اہتمام پندرہویں 'جشن آم غالب اور بیسنی روٹی' کی ادبی و شعری تقریب کا انعقاد ارم گرلس ڈگری کالج کے سبزہ زار پر ملک کے عالمی شہرت یافتہ ناظم مشاعرہ، شاعر، ادیب اور دانشور ڈاکٹر انور جلال پوری کی صدارت اور شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر اور مشہور شاعر اور ادیب ڈاکٹر عباس رضا نیر کی نظامت میں ہوا جس میں شہر نگاراں کے علاوہ اعلیٰ سرکاری افسران اور عائدین شہر کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ جشن آم غالب اور بیسنی روٹی کی

'فارسی زبان کے سرٹیفکیٹ کورس کا آغاز'

'بچوں کے لیے مفت کوچنگ کلاسوں کے اہتمام' کا منظر

محفل کا آغاز تلاوت کلام ربانی سے ہوا۔ ارم ایجوکیشنل سوسائٹی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ سید بزمی یونس نے خطبہ استقبالیہ میں تمام حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے مختصر طور پر ارم ایجوکیشنل سوسائٹی اندرانگر کی تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر کیا۔ اس موقعے پر نامور نقاد و ادیب پروفیسر شارب ردولوی نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر خواجہ یونس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اس سالانہ محفل کو روایت بنا دیا ہے اور اہلیان لکھنؤ کو بہت بے صبری کے ساتھ اس خوبصورت تقریب کا انتظار رہتا ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ دنیا میں بے شمار پھل ہیں اور بے شمار شعرا ہر زبان میں ہیں لیکن اگر مخصوص بڑی زبانوں کو دیکھیں تو آپ محسوس کریں گے۔ دنیا میں کوئی بھی پھل کسی شاعر سے وابستہ نہیں ہے سوائے آم کے جو کہ غالب سے وابستہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب نے آم کو ادبی طور پر اعتبار بخشا، آم ایک تہذیبی حیثیت رکھتا ہے اور یہ تہذیبی وابستگی ہی آم کا طرۂ امتیاز ہے۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے آم کے آم عنوان سے اپنے بے حد خوبصورت اور دلچسپ انشائیہ میں آموں کی اقسام اور ان کی خصوصیات کو شعرا ادبا اور سیاسی شخصیات سے جوڑ کر دلچسپ انداز میں پیش کیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 25 جولائی 2016

دھلی:

فارسی زبان کے سرٹیفکیٹ کورس کا آغاز

نئی دھلی: زبان فارسی ہندوستان اور یہاں کے باشندوں کے لیے کوئی اجنبی زبان نہیں ہے بلکہ اس زبان کا رشتہ تقریباً 800 سال قدیم ہے۔ یہ زبان فارسی کو ہی شرف حاصل ہے کہ جو ہندوستانی ثقافت کے مختلف شعبوں میں آج تک اثر رکھتی ہے اور سنسکرت، اردو، ہندی زبان تک میں اس کے بے شمار لفظ شامل ہیں جو کثرت کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں۔ میں یہ بات یقین کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ایران اور ہندوستان کے تاریخی اور روایتی رشتوں کو نیز ایران اور خود ہندوستان کی تاریخ، یہاں کے فن وثقافت کو ٹھیک ڈھنگ سے سمجھنا ہے تو زبان فارسی کو سیکھنا بہت ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار خانہ فرہنگ اسلامی جمہوری ایران کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی دہگائی نے خانہ فرہنگ کی جانب سے چلائے جا رہے فارسی زبان کے سرٹیفکیٹ کورس کے اختتام اور نئے سیشن کی ابتدائی تقریب کے دوران کیا۔ واضح رہے کہ گذشتہ کئی دہائیوں سے خانہ فرہنگ اسلامی جمہوری ایران نئی دہلی میں فارسی زبان کی تعلیم کے لیے کلاسیز کا اہتمام کرتا آیا ہے۔ اس سیشن میں سطح اول میں تقریباً 55 طلبہ نے حصہ لیا ہے جس میں سہ ماہی تعلیمی نظام کے تحت زبان فارسی کی تعلیم دی جائے گی۔ ساتھ ہی ہفتہ میں تین روز کلاس دی جائے گی۔ اس موقعے پر خانہ فرہنگ کے ڈپٹی کلچرل کونسل حجۃ اللہ عابدی فارسی زبان کے ایرانی استاد، خانم شیریں معصومی اور خانم ابوترابی بھی موجود تھیں۔ اس موقعے پر ترجمہ کے فرائض سید مولانا مہدی باقری نے انجام دیے۔ جبکہ فارسی زبان کی کلاسوں کے کوآرڈینیٹر سید علی زہیر نقوی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ وہیں کثیر تعداد میں قدیم اور جدید طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جولائی 2016

مفت کوچنگ کلاسوں کا اہتمام

نئی دھلی: بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے اور تعلیم کے فروغ کے لیے سرگرم عمل اینگلو عربک اسکول اینڈ دہلی کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے طلبہ و طالبات کے لیے گذشتہ پانچ برسوں سے جاری مفت کوچنگ کلاسوں کے نئے سیشن کا آغاز حکیم اجمل خاں گرلز سینئر سیکنڈری اسکول، بچوں کا گھر دریا گنج میں کیا گیا جس میں بچوں کو مفت کوچنگ کلاسوں کے تعلق سے ضروری ہدایات دی گئیں۔ اس موقعے پر منعقدہ تقریب میں ایسوسی ایشن کے نائب صدر سید ابرار علی، جنرل سکریٹری ذوالفقار قریشی اور ممبران محمد تقی، سید مقبول علی، آئی سی ایس آر، ایچ آر ڈی منسٹری کے سابق ڈائرکٹر اکرم جاوید اور سابق جوائنٹ سکریٹری راجیہ سبھا دوست محمد نبی خان نے شرکت کر کے بچوں کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کی۔ تقریب میں ایسوسی ایشن کے ممبر محمد تقی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ایسوسی ایشن کے ممبر محمد تقی نے بتایا کہ ہر سال طلبہ و طالبات کی مفت کوچنگ کے لیے کلاسیں منعقد کی جاتی ہیں تاکہ بچے تعلیم میں آگے آئیں اور اچھے نمبر حاصل کر سکیں۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ سیشن میں کوچنگ کے لیے 26 مئی کو رجسٹریشن شروع کیا گیا تھا جو مکمل ہوئے ہیں۔ کل سے مفت کوچنگ کلاسیں شروع ہو جائیں گی۔ جن میں نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں کلاس کے طلبہ و طالبات کو مختلف مضامین کے ماہر اساتذہ کے ذریعہ کوچنگ دی جائے گی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 جولائی 2016

ماہانہ ادبی نشست

نئی دھلی: عید کے پرمسرت موقعے پر مرکز ادب غالب اکادمی نظام الدین نئی دہلی میں ادبی شام کا اہتمام بعنوان ماہانہ نشست کیا گیا۔ نشست کی صدارت ماہر لسانیات و دانشور مفکر و ادیب ڈاکٹر جی آر کنول نے فرمائی اور نظامت سکریٹری غالب اکادمی ڈاکٹر عقیل احمد نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سید تقی رضا شریک ہوئے۔ ڈائس پر مترنم شاعرہ ارملا مادھو مہ جبیں بھی موجود تھیں۔ صاحب صدر نے کہا کہ کم تعداد میں شعرا ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ کم وقت میں معیاری اور بڑے بڑے مشاعروں سے کہیں زیادہ بہتر شاعری سننے سنانے کا موقع ملا اور ایک عمدہ نشست کا انعقاد ہوا۔ ڈاکٹر عقیل نے صحافیوں اور شعرا کرام کی اردو زبان و ادب کے حوالے سے کی جانے والی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ دونوں میدانوں میں بلا تفریق مذہب وملت نئی نسل کی آمد اردو زبان و ادب کے درخشندہ مستقبل کی ضامن ہے۔ غیر اردو داں طبقہ اردو سے جڑ رہا ہے یہی اردو کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ اہم شرکا میں فضل بن اخلاق، سعید احمد، وصی عثمانی، محمد اسلم، ڈاکٹر جی آر کنول، سید تقی رضا، ڈاکٹر تابش مہدی، متین

امروہوی، حبیب سیفی، سرفراز احمد فراز، منوج بیتاب، ارملا مہہ جبیں، کیلاش سمیر، اسرار رازی، اسلم خورشید، راجیو ریاض وغیرہ شامل تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 جولائی 2016

اردو، ہندی و پنجابی قلم کاروں کا مباحثہ

نئی دھلی: محفل گنگ و جمن کی جانب سے پنجابی بھون میں 'اردو ہندی و پنجابی قلم کاروں کا مباحثہ' کا انعقاد کیا گیا جس میں عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین ایڈوکیٹ اے رحمٰن نے کہا کہ میں نے یہ ٹرسٹ اردو زبان کے فروغ کے لیے قائم کیا تھا۔ ایڈوکیٹ عبدالرحمٰن نے کہا کہ آج زبانیں ایک دوسرے کے قریب آرہی ہیں اور ہندی و اردو ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ ہندی پبلشر انل ورما نے کہا کہ میں نے ہندی و اردو کی بہت محفلیں دیکھی ہیں مگر اس میں پنجابی کو شامل کیا گیا جو ایک نیک فال ہے۔ اس سے ان تینوں زبانوں میں فاصلہ کم ہوگیا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی زبانیں پڑھ رہے ہیں۔ اردو زبان اتنی اچھی ہے کہ لوگ اسے پڑھنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ترجمے بھی کیے جو لوگوں کو پسند آئے۔ سعید اختر نے کہا کہ یہ ایک سنگم ہے اسے آگے لے کر چلنا چاہیے۔ اس دوران اردو، ہندی اور پنجابی کے مصنّفین کو ایوارڈ سے بھی نوازا گیا جن میں عبدالرحمٰن منصور، حبیب سیفی، اجے عکس، نعیم بدایونی، وشال باغ، جتیندر پریتم، ناکش چندرا، تریندر کور، کومل سنگھ کومل، ستنام کور وغیرہ شامل ہیں۔ نظامت ڈاکٹر ظفر مرادآبادی نے کی، محفل کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ اس موقعے پر مہیش بھاردواج، محفل گنگ و جمن کے ایگزیکٹیو حبیب سیفی، وریندر قمر، افضل حسین، راجیو ریاض، سمیتا راکیش، سیماب سلطان پوری، کمار ساحل، نزاکت امروہوی، چشمہ فاروقی وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جولائی 2016

اتر پردیش:

امروہہ: میری اور فقیری

امروھه: شہر کے فرزند، ممتاز اسکالر اور اردو پروفیسر ڈاکٹر ناشر نقوی نے کراچی پاکستان میں اپنے توسیعی خطبے میں کہا کہ اردو کو بطور زبان امروہہ نے نام دیا۔ غلام ہمدانی مصحفی وہ پہلے ادیب و شاعر تھے جنھوں نے 1780 میں اردو کو زبان کا نام دیا۔ مصحفی کا تعلق امروہہ سے تھا۔ ڈاکٹر ناشر نے اپنے دعوے کے جواز میں ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کی کتابوں کے حوالے بھی دیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب میں جو 2 دبستان دہلی اور لکھنؤ کے ہیں ان دونوں کے ستون امروہہ سے تعلق رکھنے والے اساتذہ کے شاگرد ہیں۔ ڈاکٹر ناشر نے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ دہلی کا ادبی مکتب میر تقی میر پر جو ناز کرتا ہے تو امروہہ کو ناز ہے میر سعادت امروہوی پر میر تقی میر کے استاد تھے۔ دبستانِ لکھنؤ کے میر خلیق اور خواجہ حیدر علی آتش نے مصحفی امروہوی سے نکات علم و شعر سیکھے۔ امروہہ نے کبھی دعوۂ دبستان نہیں کیا یہی امروہہ کی کسرِ نفسی ہے۔ خیال رہے کہ ڈاکٹر ناشر نقوی نے اپنا خطبہ 'امروہہ میری اور فقیری' کے عنوان پر 3 جولائی کو کراچی میں دیا تھا جسے پاکستان کے اہم اخبارات میں جلی طور پر شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر ناشر نے 'امروہہ میری اور فقیری' کے تعلق سے امروہہ میں مدفون صوفی بزرگ حضرت شاہ ولایت، حضرت نصیرالدین، حضرت شاہ ابن، حضرت بھورے خاں کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا کہ یہ سرزمین ہندوستان میں امن و امان کی جائے پناہ ہے جہاں ہر قوم کے افراد شیر و شکر کی طرح رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ناشر نے امروہہ کی مشہور زمانہ شخصیات دربارِ اکبری کے میر عدل، تاریخ اصغر کے اصغر حسین، تاریخِ امروہہ کے محمود احمد عباسی، فلم ساز کمال امروہوی، آرٹسٹ صادقین اور اقبال مہدی، ہندی کے شاعر رسکھان، نقاد پروفیسر علی صدیقی، نثار احمد فاروقی، شاعر اسماعیل امروہوی، عبدالرؤف، شمیم امروہوی، نسیم امروہوی، زبیر رضوی، رئیس امروہوی، یکتا امروہوی اور جون ایلیا کا خصوصی ذکر بھی کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 جولائی 2016

'بڑھتے قدم روشنی کی طرف' کے عنوان سے منعقدہ سمینار کا منظر

بڑھتے قدم روشنی کی طرف

موانه: مقامی ایجوکیشنل تنظیم بلیسنگ دی مین کائنڈ سوسائٹی کی جانب سے اتسو منڈپ میں 'بڑھتے قدم روشنی کی طرف' کے عنوان سے ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت اتر پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کی۔ انھوں نے سمینار کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ماں باپ کا پہلا فرض یہ بھی ہے کہ بچوں کو گھر کی تعلیم کے ذریعے اس کو انسان بنائیں۔ تہذیب و تمدن کی بہترین شروعات کریں۔ سوسائٹی کے کوآرڈی نیٹر شیخ ندیم اختر نے کہا کہ آج کی محنت کل کا صلہ ہے اس کے لیے کاوشیں ضروری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ سوسائٹی بچوں کو آگے بڑھنے اور مختلف امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کونسلنگ دفتر قائم کرے گی جس سے امیدواروں کو روزگار حاصل ہو سکے۔ سمینار میں ایس ڈی ایم اروند کمار سنگھ، سی او موانہ عبدالقادر، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، بی ایس اے میرٹھ محمد اقبال نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 جولائی 2016

سعید نقوی پر ڈاکومنٹری فلم

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں سعید نقوی کی بیش قیمتی خدمات کی ستائش کی۔ وہ سعید نقوی کی زندگی پر بنائی گئی ڈوکومنٹری فلم کی نمائش کے موقعے پر منعقد تقریب سے خطاب کررہے تھے۔ واضح رہے کہ اس فلم میں نقوی کے صحافتی اور دیگر پہلوؤں کو شامل کیا گیا ہے۔ نھوں نے جامعہ میں سینٹر کی فلاح اور اس کے فروغ اور اے جے کے ماس کمیونی کیشن ریسرچ سینٹر، سینٹر فار کلچر، میڈیا اور گورننس اور انڈیا عرب کلچرل سینٹر کو آگے بڑھانے کے لیے نقوی کے قابل ستائش رول کو اجاگر کیا۔ پروفیسر طلعت احمد نے مزید کہا کہ ڈوکومنٹری فلم میں صحافت کی ثقافتی اور ادارتی تاریخ کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے طلبا اور ریسرچ اسکالرس کو بہت زیادہ فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔ طلبا کو اس موقعے کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس موقعے پر سابق مرکزی وزیر برائے پٹرولیم اور نیچرل گیس منی شنکر ایئر نے سعید نقوی کی اس مشہور عالمی رپورٹ کے حوالے سے اپنی یاد تازہ کی جس میں ممتاز سیاست دانوں کے انٹرویو شامل کیے گئے ہیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبا و طالبات سعید نقوی کی اس ڈاکیومنٹری فلم سے بھرپور فائدہ اٹھائیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 جولائی 2016

ماس کلب کے زیر اہتمام ثقافتی پروگرام

ھاپوڑ: عید کی خوشیاں اس وقت دوبالا ہوجاتی ہیں جب کسی خاص پروگرام میں لوگ جمع ہوکر ایک دوسرے کو دل سے عید کی مبارک باد دیتے ہیں۔ ایسے پروگرام جس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ برادرانِ وطن کو بھی شامل کرلیا جائے تو اس خوشی کا کیا کہنا۔ آج برادرانِ وطن اور اہل اسلام کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کی وجہ سے جو خلیج پیدا ہوگئی ہے اسے پاٹنے کے لیے ایسے پروگرام کا انعقاد نہایت ہی اہم ہے بلکہ وقت کی ضرورت بھی ہے۔ اسی مناسبت سے ماس کلب کے چیئرمین اسرار تومر اور سکریٹری سید فضل الرحمٰن نے عید میلہ کا انعقاد گرین ویلی گارڈن میں کیا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ماس کلب کے سابق چیئرمین مسلم قریشی نے بخوبی انجام دیے۔ پروگرام میں جہاں عید میلہ کے لوازمات کو انجام دیا گیا۔ وہیں بچوں اور بچیوں اور خواتین میں کوئز مقابلے کا اہتمام بھی کیا گیا جس میں اول، دوم پوزیشن حاصل کرنے والوں میں انعامات تقسیم کیے گئے۔ شامِ غزل کے عنوان سے ایک ثقافتی پروگرام بھی منعقد کیا گیا جس سے سامعین خوب محظوظ ہوئے۔ ماس کلب کی 7 سالہ خدمات پر مبنی ایک رسالہ بنام 'کوشش' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ پروگرام میں مہمانِ خصوصی کے طور پر ریکس ریمیڈ کے چیئرمین شعیب اکرم نے شرکت کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 11 جولائی 2016

بہار :

فروغ اردو سمینار

پٹنہ: اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام مختلف اضلاع میں فروغِ اردو سمینار کا مقصد اردو زبان کے لیے ماحول

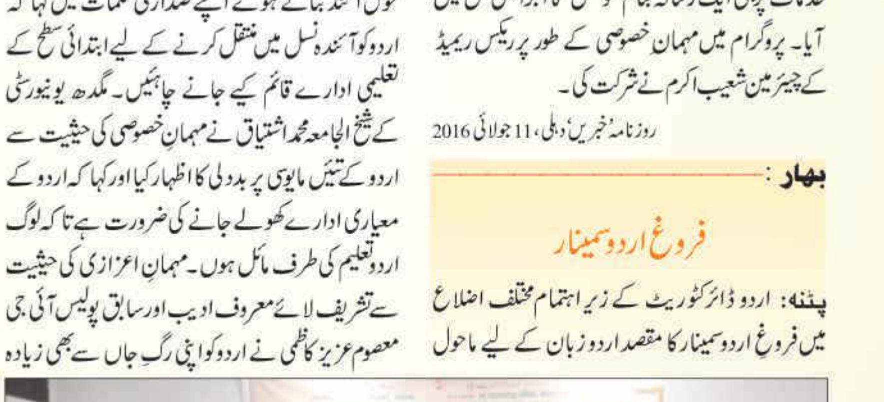

سازی اور عوامی بیداری ہے۔ ہم سمینار اور اردو عمل گاہوں کے ذریعے اردو عوام میں اردو زبان کے تئیں عملی محبت اور رغبت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اردو ملازمین کو ان کی منصبی ذمہ داری یاد دلانے کے ساتھ ساتھ اردو کے تئیں ان میں دلچسپی اور محبت بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں جن سات کاموں کے لیے مامور کیا گیا ہے وہ ان کاموں کو پوری ایمانداری اور سچی لگن کے ساتھ پورا کریں۔ ان خیالات کا اظہار اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے مرزا غالب کالج گیا میں منعقدہ فروغِ اردو سمینار میں دانشورانِ اردو اور اردو ملازمین سے کھچا کھچ بھرے ہال میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو ملازمین کو اپنے عہدے کی معنویت ثابت کرنے کے لیے اردو میں درخواست دینے کے لیے عوامی مہم چھیڑنے کی ضرورت ہے اور ہمیں اردو عوام کا اعتماد جیتنا ہوگا کہ اردو میں درخواست دینے پر بھی کام ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ذریعہ ریاست کے سبھی اضلاع میں اردو سمیناروں اور عمل گاہوں کے انعقاد کا منصوبہ روبہ عمل ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہر ضلع میں اردو داں طلبہ و طالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے اردو مضمون نویسی کا مسابقہ کراکے ان کے درمیان انعامات و اسناد تقسیم کیے جائیں گے۔

اردو مشاورتی کمیٹی کے صدر نشیں شفیع مشہدی نے سمینار میں گیا کی مقتدر اور سرکردہ شخصیتوں کی شرکت کو خوش آئند بتاتے ہوئے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ اردو کو آئندہ نسل میں منتقل کرنے کے لیے ابتدائی سطح کے تعلیمی ادارے قائم کیے جانے چاہئیں۔ مگدھ یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ محمد اشتیاق نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اردو کے تئیں مایوسی پر بددلی کا اظہار کیا اور کہا کہ اردو کے معیاری ادارے کھولے جانے کی ضرورت ہے تاکہ لوگ اردو تعلیم کی طرف مائل ہوں۔ مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے تشریف لائے معروف ادیب اور سابق پولیس آئی جی معصوم عزیز کاظمی نے اردو کو اپنی رگِ جاں سے بھی زیادہ عزیز بتایا اور کہا کہ اردو ہماری مذہبی میراث ہے، یہ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ انھوں نے بتایا کہ انگریزوں نے 1850 میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔

مقالہ نگار کی حیثیت سے پروفیسر حسین الحق نے ماضی میں اردو کی صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے اگلی نسل کو اردو کی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے وسائل پیدا کرنے اور اردو لائبریریوں کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔ سید فضل وارث نے اس بات پر مسرت کا اظہار کہ اب تک ہم لوگ اپنے مسائل کو لے کر سرکار کے پاس جاتے رہے ہیں لیکن آج سرکار (اردو ڈائرکٹوریٹ) خود چل کر ہم تک آئی ہے۔ سید احمد قادری کے مقالہ میں اردو کے مسائل اور اس کے حل کا بخوبی تجزیہ کیا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر غلام اصدق جہان آباد سے، پروفیسر قاسم فریدی نے اورنگ آباد سے اور مسیح الدین نے نوادہ، بحیثیت مندوب شرکت کی اور اردو زبان کے عملی نفاذ سے متعلق اپنے اپنے علاقے کے مسائل بیان کیے۔ معمر صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے اردو ڈائرکٹوریٹ کی کارکردگی کو بے حد امید افزا اور قابلِ تعریف بتاتے ہوئے کئی مفید مشورے بھی پیش کیے۔ فروغِ اردو سمینار میں طلبہ و طالبات کی جانب سے آفرین اسلم، مہر ملک اور محمد آصف نے اپنے اپنے مقالے میں اردو کے مسائل اور اس کے حل سے متعلق خیالات کا اظہار کیا۔ انہیں اس موقع پر اردو ڈائرکٹوریٹ کی جانب سے اسناد سے بھی نوازا گیا۔

پروگرام کی شروعات ڈاکٹر اسلم جاوداں کے افتتاحی کلمات سے ہوئی۔ جبکہ نظامت ڈاکٹر سید احمد قادری نے کی۔ محمد نورعالم کے شکریہ کے ساتھ سمینار کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: امتیاز احمد کریمی ڈائرکٹر (اردو)، ڈائرکٹوریٹ پٹنہ 1 اگست 2016

صحافت اور سماجی بیداری

اررىه: سماجی تنظیم 'سنواد' کے زیر اہتمام ارریہ ٹاؤن ہال میں صحافت اور سماجی بیداری کے عنوان سے پروگرام کا انعقاد ہوا جس میں ملک کے نامور صحافی، دانشوران، سماجی کارکنان اور ہم عصر اخبارات کے مقامی صحافیوں نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز کو آرڈی نیٹر مسٹر عفان احمد کامل کے افتتاحیہ خطاب سے ہوا جس میں انھوں نے پروگرام کی غرض و غایت تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے نیوز ایجنسی پی ٹی آئی کے سینئر جرنلسٹ مسٹر سدن سہائے کو مذکورہ عنوان پہ اظہار خیال کی دعوت دی۔ مسٹر سدن سہائے نے اپنی طویل ترین صحافتی زندگی کا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ صحافت کے ذریعے سماجی بیداری لائی جاسکتی ہے۔ پرویز عالم علیگ نے صحافت اور صحافی کو سماج کا بیش قیمتی اثاثہ بتاتے ہوئے صحافیوں کو کارپوریٹ اور لیڈران سے بہتر تال میل پر مور دیا۔ انھوں نے کہا

کہ ہمیں ایک منصوبہ کے ساتھ پورے سماج کی نمائندگی کرنا چاہیے۔ مسٹر محمد حامد حسین ڈائرکٹر براڈ کاسٹنگ انفارمیشن وسینئر جرنلسٹ مسٹر سرور احمد کالم نگاری ٹیلی گراف نے تفصیل کے ساتھ عصر حاضر کے سماجی مسائل اور میڈیا کا رویہ، نظرانداز دیہی آبادی اور پیڈ نیوز پر سیر حاصل گفتگو کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جولائی 2016

پریم چند یادگاری خطبہ

پٹنہ: بہار سنگیت ناٹک اکادمی کے انتہائی خوب صورت

اور وسیع ترین ہال میں پریم چند یادگاری خطبے کا اہتمام کیا گیا جہاں کثیر تعداد میں ناظرین وشائقین کی موجودگی نے یہ ثابت کردیا کہ اگر باتیں بہت مؤثر اور مدلل ڈھنگ سے کہی جائیں تو نہ صرف یہ کہ سنی جاتی ہے بلکہ انہماک بھی قائم رہتا ہے۔ اردو ہندی میں یکساں طور پر مقبول ادیب وشاعر وایس سی ای آر ٹی بہار کے صدر شعبہ ڈاکٹر قاسم خورشید کو لکچر کے لیے اسٹیج پر بلایا گیا اور انھیں بہار سنگیت ناٹک اکادمی کے ذریعے اعزاز کے بعد استقبال کیا گیا۔ اس موقعے پر قاسم خورشید نے پریم چند ادب سے اپنی اس عملی وابستگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا کہ اس سے قطعی طور پر آج بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پریم چند ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی وراثت کے سب سے بڑے قلم کار ہیں۔ 1903 سے لے کر 1936 تک ان کے ادبی سفر کو اگر ہم ملحوظ رکھیں تو اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بدلتی ہوئی دنیا اور بدلتے ہوئے ہندوستان پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ روس انقلاب ان کے پیش نظر تھا اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے وہ بہت ہی مؤثر قلم کے سپاہی تھے۔ پریم چند نے اردو ہندی فکشن کی رہنمائی کی اور دنیا کا سب سے انمول رتن، کفن، بڑے گھر کی بیٹی، سواسیر گیہوں، منتر، استعفیٰ، پوس کی رات، جیل، پنچایت، بڑے بھائی صاحب، گلی ڈنڈا، بوڑھی کاکی اور ایسے ہی کم از کم سو شاہکار افسانے لکھ ڈالے جو آج بھی ہمارے مشعل راہ ہے۔

اس موقعے پر کثیر تعداد میں بہار کے معزز دانشوران موجود تھے۔ خاص طور سے راج کیشور راجن، گجند رکانت شرما اور تارانند یوگی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سنگیت ناٹک اکیڈمی کے چیئر مین اور مشہور کوی آلوک دھنوا نے مہمان خصوصی قاسم خورشید کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہوئے اس تقریب کو بیحد یادگار بتایا۔

پریس ریلیز: ابومحمد صالح، پٹنہ 3 اگست 2016

پنجاب:

پنجاب اردو اکادمی کا مشاعرہ

مالیرکوٹلہ: 18 جولائی پنجاب اردو اکادمی دہلی گیٹ

مالیرکوٹلہ: پنجاب اردو اکیڈمی کی جانب سے منعقدہ صوبائی مشاعرہ میں کلام پیش کرتے ہوئے شعرا کرام اور ڈاکٹر راجیش موہن و ڈاکٹر محمد اقبال کو سرفراز کرتے ہوئے سکریٹری پروفیسر منظور حسن (تصویر)

مالیرکوٹلہ کے سیمینار ہال میں ایک یادگاری مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے فریدکوٹ سے ڈاکٹر راجیش موہن اور مالیرکوٹلہ سے شرومنی اردو ساہتکار ایوارڈیافتہ ریٹائرڈ پرنسپل ڈاکٹر محمد اقبال تشریف لائے جبکہ صدارت کے فرائض جناب صابر علی ڈھلوں سابق چیئر مین امپروومنٹ ٹرسٹ مالیرکوٹلہ نے انجام دیے۔ اکادمی ہذا کے سمینار ہال میں پنجاب اردو اکادمی کے سکریٹری پروفیسر ڈاکٹر منظور حسن نے سب سے پہلے مہمانانِ خصوصی اور صدر مجلس کے ساتھ ساتھ تشریف لائے شعرا اکرام نیز شرکائے مجلس کا خیر مقدم کرتے ہوئے ڈاکٹر راجیش موہن صدر شعبۂ موسیقی سرکاری برجندرا کالج فریدکوٹ کا سامعین سے تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ آپ ایک خوش فکر، خوش گو اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ موصوف اپنے لطیف احساسات وجذبات کو جب شعری جامہ پہناتے ہیں اور اپنی مترنم آواز میں جادو جگاتے ہیں تو حاضرین مجلس پر ایک وجدانی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ پرفیسر محمد اقبال ریٹائرڈ پرنسپل کے متعلق تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر منظور حسن نے موصوف کی ادبی خدمات کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا اور شرومنی اردوساہتیہ کار ایوارڈ ملنے پر اکادمی اور جملہ اسٹاف کی طرف سے مبارکباد دی۔ صدر جناب صابر علی ڈھلوں کا تعارف کرواتے ہوئے سکریٹری موصوف نے فرمایا کہ جناب صابر علی ڈھلوں کی جہاں انگریزی شعروادب پر گہری نظر ہے وہیں اردو زبان وادب سے بھی گہرا شغف ہے۔ مشاعرے میں تاج الدین تاج، افتخار شیخ، ڈاکٹر صدیق ساحل، ساجد اسحاق، ضمیر علی ضمیر، ڈاکٹر ندیم احمد ندیم، صاحبزادہ اجمل خاں شیروانی، اختر علی اختر، ڈاکٹر محمد ایوب خاں، ڈاکٹر محمد اقبال، ڈاکٹر راجیش موہن نے اپنے کلام سے نوازا۔ شعری مجلس کے بعد پنجاب اردو اکادمی کی جانب سے ڈاکٹر راجیش موہن اور ڈاکٹر محمد اقبال ریٹائرڈ پرنسل کو مومنٹو اور شال سے سرفراز کیا گیا۔

پریس ریلیز: آفس پنجاب اردو اکادمی، مالیرکوٹلہ، 19 جولائی 2016

کرناٹک:

'حاصلِ مطالعہ' کا شاندار پروگرام

میسور: کرناٹک اردو اکادمی کے زیر اہتمام بروز جمعرات بتاریخ 21 جولائی 2016 کو 'حاصل مطالعہ' نامی پروگرام کا کامیاب انعقاد فاروقیہ ڈی ایڈ کالج اودے گری، میسور عمل میں آیا۔ صدارت عزیز اللہ بیگ چیرمین،

کرناٹکا اردو اکادمی نے کی اور نظامت نعمت اللہ خان ممبر کرناٹک اردو اکادمی نے کی جس میں مفتی باقر ارشد قاسمی، فاضل دارالعلوم وقف، دیوبند، نائب صدر ملّی کونسل آف انڈیا، کرناٹک، پروفیسر مسعود سراج، صدر شعبۂ اُردو جامعہ میسور، پروفیسر ریاض احمد، اعزازی صدر رفاہ المسلمین ایجوکیشنل ٹرسٹ میسور، سراج احمد خالد رجسٹرار کرناٹک اردو اکادمی مہمانان خصوصی رہے۔ حاصلِ مطالعہ کے پروگرام میں سب سے پہلے ڈاکٹر مسعود سراج نے حضرت سید حیدر علی نظم طباطبائی کی شرح 'شرح دیوان اردوئے غالب' مرتبہ ظفر احمد صدیقی پر اپنے خیالات کا جامع اظہار کیا۔

مفتی سید باقر ارشد قاسمی نے حضرت محمد علی مہکری آصف خانہ زاد کی تصنیف 'گنج شائگاں' (کلیاتِ قصائد) پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر ریاض احمد نے مشورہ دیا کہ جب تک اردو زبان کا فروغ نئی نسل میں نہ کیا جائے تو اردو زبان کا پنپنا کافی مشکل نظر آتا ہے۔ انھوں نے چیرمین کو مشورہ دیا کہ اردو زبان کو نہ صرف سرکاری اردو اسکولوں میں بلکہ پرائیویٹ اسکولوں میں بھی متعارف کرانے کی کوشش کی جائے۔ جواب میں عزیز اللہ بیگ نے اپنے صدارتی خطاب میں بتایا کہ جنوبی کرناٹک کے برعکس شمالی کرناٹک کے تقریباً سبھی اسکولوں میں خواہ وہ سرکاری اسکول ہو یا کہ پرائیویٹ اسکول ہو اردو زبان ضرور پڑھائی جاتی ہے۔ انھوں نے محترم تنویر سیٹھ وزیر برائے تعلیم و اقلیتی امور کی اس یقین دہانی پر خوشی کا اظہار کیا کہ وہ کسی بھی صورت سرکاری اردو مدارس کو بند نہیں ہونے دیں گے۔ نعمت اللہ خان ممبر اردو اکادمی کے اظہار تشکر پر یہ جلسہ اختتام کو پہنچا۔

پریس ریلیز: نعمت اللہ خان، میسور، 25 جولائی 2016

مہاراشٹر:

سی ای او نے طلبہ کو اردو کے اسباق پڑھائے

مروڈ جنجیرہ: علی باغ تعلقہ کے ریوداندا میں واقع ضلع پریشد اردو اسکول میں ضلع پریشد کے افسر اعلیٰ پانڈھر پٹے نے اچانک اسکول کا دورہ کیا اور طلبہ کو اردو میں دو

سبق پڑھائے۔ افسر اعلیٰ کا اردو میں درس و تدریس کا عمل دیکھ کر طلبہ کے ساتھ اساتذہ نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ افسر اعلیٰ نے نہ صرف تدریس اردو میں کی بلکہ وزٹ بک پر ریمارک اردو میں لکھا اور دستخط بھی اردو میں کیے۔ اس ضمن میں ملنے والی اطلاعات کے مطابق رائے گڑھ ضلع پریشد کے تحت چلائے جا رہے اسکولوں میں طلبہ و اساتذہ کی کارکردگی، اساتذہ کے کام، تعلیمی ریکارڈ اور تعلیمی ماحول کا جائزہ لینے کے لیے تعلیمی افسران اسکولوں کا دورہ کر رہے ہیں۔ افسر اعلیٰ کی یہ وزٹ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ جب افسر اعلیٰ اسکول پہنچے تو انھوں نے وہاں ایک افسر کے بجائے ایک اردو معلم کا رول ادا کیا۔ انھوں نے جماعت چہارم کے طلبہ کی کلاس لی اور انھیں 'شیواجی مہاراج' پہ سبق پڑھایا اور ششم جماعت کے طلبہ کو 'ہڑپا تہذیب' کا درس دیا۔ بتایا گیا ہے کہ رائے گڑھ ضلع پریشد کے چیف آفیسر دلیپ پانڈھر پٹے کو اردو ادب سے لگاؤ ہے اور وہ اردو اچھی طرح سے لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ ضلع پریشد کے چیف آفیسر دلیپ پانڈھر پٹے نے اسکول کے وزٹ بک پر اردو میں لکھا کہ "مجھے اردو سیکھنے کا بڑا شوق تھا اس لیے میں نے اردو سیکھی اور اس کا گہرائی سے مطالعہ بھی کیا ہوں۔ میری خواہش تھی کہ میں ایک دن کسی اردو اسکول کو وزٹ کروں اور وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ ایک دن گزاروں اور انھیں اردو میں پڑھاؤں۔ آج میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ اردو میں بچوں کو پڑھنے میں بڑا لطف آیا۔" انھوں نے کہا کہ دوران تدریس مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ طلبہ کا ریسپانس بہتر رہا اور یہاں کے اساتذہ محنتی اور سرگرم نظر آئے۔"

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 اگست 2016

مغربی بنگال:

اردو اور ہندی کے درمیان مماثلت اور فرق

کولکاتا: اردو اور ہندی کے درمیان فاصلے اور دونوں زبان کے شعرا ادبا کے درمیان دوریوں پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کلکتہ شہر کے بھارتیہ بھاشا پریشد کے زیراہتمام 'اردو اور ہندی کے درمیان مماثلت اور فرق' کے عنوان سے منعقد سمینار میں مقررین نے کہا کہ اردو اور ہندی گرچہ دو مختلف زبانیں ہیں مگر حقیقت میں دونوں زبان کا مآخذ و مصدر ایک ہے اور ان دونوں زبانوں میں جس قدر مماثلت اور یکسانیت ہے اتنی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔ مصنفہ رخشندہ جلیل نے اردو اور ہندی کو ایک زبان اور لکھاوٹ الگ الگ قرار دینے کی کوششوں کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں انھیں ایک قرار دینے کا نظریہ غلط ہے۔ ہاں جس طریقہ سے دو بہنیں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوتی ہیں مگر بہت ساری عادتوں میں دونوں میں یکسانیت ہوتی ہے اور بہت فرق بھی ہوتا ہے مگر دونوں کا ایک وجود ہے اور تشخص ہوتا ہے اسی طرح ہندی اور اردو زبان دو مختلف زبانیں ہیں اور ان کا اپنا ایک وجود اور ایک تشخص ہے۔ دونوں کے وجود اور تشخص کو ناکار کسی ایک کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتے ہیں۔ انھوں نے اردو میں عربی و فارسی کے الفاظ کی کثرت پر کیے جانے والے اعتراضات کو بھی رد کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کی وہی زبان ترقی یافتہ ہوسکتی ہیں جس میں دوسری زبان کے اچھے الفاظ اور اس کے اصطلاحات کو جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس لیے صرف اس بنیاد پر اردو کی مخالفت کرنا کہ اس میں عربی کے الفاظ بہت ہی زیادہ ہیں تو ملیالم اور بنگلہ زبان میں بھی عربی کے الفاظ کی کثرت ہے تو پھر وہاں اس کی مخالفت کیوں نہیں ہوتی ہے۔ اس سمینار میں ہندی کے مصنف پرمونند شاہ، صحافی یوآصف، پروفیسر شہناز نبی، نند لال شاہ، امرناتھ جی وغیرہ نے خطاب کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 جولائی 2017

اعزاز و اکرام:

'اکادمی آپ تک' پروگرام کے زیراہتمام اعزازات

مظفرپور: بہار کے شہر مظفرپور میں بہار اردو اکادمی کا ایک اہم پروگرام منعقد ہوا۔ پروگرام کا عنوان تھا 'اکادمی آپ تک'۔ پروگرام میں اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دینے والے مظفرپور ضلع کے تین معمر افراد کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اکادمی کی تقریب کا اختتام مشاعرے

کے ساتھ ہوا۔ بہار اردو اکادمی نے اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کرنے والے بہار کے گمنام ادبا، شعرا اور دانشوران کو اعزازات سے نوازنے کا انوکھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اکادمی کے عہدے داران خود اردو خدمت گاروں کو اضلاع پہنچ کر ان کے لیے اعزازی تقاریب منعقد کرا رہے ہیں تاکہ اردو ادب کی بے لوث خدمت کرنے والے ان افراد کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی ہوسکے۔ اکادمی نے مظفرپور ضلع کے جن تین افراد کو ایوارڈ سے نوازا، ان میں دو افراد پروفیسر نجم الہدیٰ اور پروفیسر ناز قادری اردو کے جبکہ خورشید سمیع مظفرپور انجینئرنگ کالج میں کیمسٹری کے پروفیسر رہے ہیں۔ اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری کے مطابق ایوارڈ کے لیے اردو خدمت گاروں کے انتخاب میں اکادمی نے سروس سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت جاری رکھنے والوں کو ترجیح دی ہے۔

روزنامہ 'خبریں'، دہلی، 21 جولائی 2016

پروفیسر محمد صلاح الدین عمری

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے سینئر استاد پروفیسر محمد صلاح الدین عمری کو عربی زبان و ادب میں ان کی قابل ذکر تحقیقی خدمات کے لیے رضا لائبریری، رام پور نے نواب فیض اللہ خاں ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے۔ پروفیسر عمری نے اے ایم یو کے شعبۂ عربی سے بی اے اور ایم کرنے کے بعد معروف پروفیسر محمد راشد ندوی کی نگرانی میں 'محمد حسین ہیکل کا عربی زبان و ادب میں حصہ' موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا جس پر انھیں 1987 میں ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی گئی۔ وہ 1986 میں شعبۂ عربی میں لیکچرر، 1997 میں ریڈر کے منصب پر فائز ہوئے اور فی الوقت پروفیسر کی حیثیت سے شعبۂ عربی میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ وہ دو مرتبہ شعبۂ عربی کے سربراہ اور سرسید اکادمی کے ڈائرکٹر کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔ انھیں معروف مجلّہ 'نقوش' لاہور کے قرآنی نمبر میں شائع ہونے والے مقالہ 'اللہ کا تصور قرآن و حدیث کی روشنی میں' کی بنیاد پر معروف 'نقوش ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'خبریں'، دہلی، 18 جولائی 2016

سول سروسز کے امتحان میں کامیاب ہونے والے 18 مسلم نوجوانوں کو اعزاز

نئی دھلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے مسرت کے ساتھ کہا کہ کچھ سالوں میں سول سروسز کے امتحان میں کامیاب ہونے والے بچوں کی فہرست میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے جو کہ خوش آئند بات ہے۔ سراج الدین قریشی بی ایس عبدالرحمٰن آڈیٹوریم میں منعقدہ زکوٰۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے اشتارک سے سوا سروسز کے امتحان میں نمایاں مقام لانے والے 18 طلبہ و طالبات کے لیے استقبالیہ تقریب اور عید ملن تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ مسٹر قریشی نے مزید کہا کہ ہمارے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ مسلم بچے سول سروسز میں جواب رجحان نظر آرہا ہے وہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ تعداد مستقل بڑھتی جائے گی اور مسلمانوں کے جو مسائل ہیں ان کے سدباب کے لیے یہ نوجوان کھڑے ہوں گے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں گے۔ مجھے لگتا ہے کہ آنے والے وقت میں آئی اے ایس، آئی پی ایس اور آئی آر ایس میں مسلمانوں کی نمائندگی میں بے پناہ اضافہ ہوگا جس طرح زکوٰۃ فاؤنڈیشن اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دیگر ادارے کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح مسلم آرگنائزیشن ایسے ادارے قائم کریں تاکہ مسلم نوجوان برسر روزگار ہوسکیں گے۔ اپنے خطاب میں جسٹس راجندر سچر نے خوشی کے ساتھ کہا کہ یہ جو اقلیتی بچے سول سروسز کے امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں، اس میں ریاست جموں کشمیر کے بچوں کی تعداد زیادہ ہے جو کہ خوش آئند بات ہے اور ایک سیکولر ملک کی شناخت ہے۔ اسی کے ساتھ ہی آئی آئی سی میں عید ملن پارٹی سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیر ڈاکٹر ہرش وردھن نے کہا کہ اس ملک کی روایت رہی ہے کہ تمام مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے ہیں اور یہی گنگا جمنی تہذیب کی نشانی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 جولائی 2016

اردو میڈیم طلبا و طالبات کو اعزاز

نئی دھلی: دہلی کے اردو میڈیم اور سرکار سے منظور شدہ

انگلش میڈیم اسکولوں کے بارہویں اور دسویں جماعت کے طلبا/ طالبات نے تمام نامساعد حالات کے باوجود شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ان خیالات کا اظہار روشن ٹرسٹ کی جانب سے منعقد تقریب میں دہلی مائنارٹیز کمیشن کے چیئرمین قمر احمد نے کیا۔ ٹرسٹ کی جانب سے مسلم پرائیویٹ اسکولوں میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلبا/ طالبات کو غالب اکادمی میں مومنٹو اور سرٹیفکیٹ دے کر حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس موقعے پر قمر احمد نے سرکاری اسکیموں کا حوالہ دے کر کہا کہ دہلی کا کوئی بھی بچہ مالی کمی یا دوسری رکاوٹوں کی وجہ سے تعلیم سے محروم نہیں رہے۔ دہلی سرکار نے ایسے سبھی مستحق بچوں کو قرض مہیا کرنے کی اسکیم کو لاگو کیا ہے۔ اقدس مشرف اور اصلاح الدین نے پھولوں کا گلدستہ پیش کرکے مہمانان کا خیر مقدم کا۔ تقریب انعامات کی صدارت قمر احمد نے کی جبکہ مہمانان خصوصی کے طور پر جواد احمد صدیقی چانسلر الفلاح یونیورسٹی نے کی۔ حاجی زین العابدین اور ضیا الدین چیئرمین اینگلوزادہ بطور مہمان ذی وقار رونق افروز تھے۔ امسال بارہویں جماعت میں 90 فیصد یا زائد نمبرات حاصل کرنے والے طلبا/ طالبات کی تعداد 24 تھی جبکہ دسویں جماعت میں 9CGPA یا زائد گریڈ حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد 54 رہی۔ اسی طرح کل 78 بچوں نے انعامات حاصل کیے۔ خاص بات یہ رہی کہ کل تعداد میں 14 طلبا تھے اور 64 طالبات نے انعامات حاصل کیے۔ لڑکیوں نے لڑکوں پر سبقت حاصل کی ہے۔ گذشتہ سالوں کی طرح امسال بھی رابعہ گرلز پبلک اسکول کی طالبات کی تعداد سب سے زیادہ تھی اس موقعے پر ٹرسٹ کے چیئرمین مشرف حسین ٹرسٹ کی ویب سائٹ roshanngo.in کا بھی افتتاح کیا۔ ارشاد قمر نے تمام حاضرین اور مہمانان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ شکیل الرحمٰن صدر پوروانچل ایسوسی ایشن نے نظامت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 12 جولائی 2016

رسم اجرا:

ادب سلسلہ

اله آباد: 'بزم یاراں' کے زیر اہتمام گذشتہ روز سولہ مارکٹ واقع ادب گھر میں ادب سلسلہ، پبلی کیشن کی رسم اجرا اور منعقد مشاعرہ میں خطاب کرتے ہوئے خصوصی مہمان ڈاکٹر اشفاق حسین نے کہا کہ یہ ادب کی تاریخ میں پہلا

رسالہ ہے جس نے اپنی انفرادیت کی وجہ سے اردو ادب میں اتنی جلدی اپنا مقام بنالیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادبی

جہت کے علاوہ سیاسی، سماجی اور مختلف موضوعات پر ملک کے حالات پر کھل کر بات کرتا ہے اور احتجاجی ادب پر بے باکی سے مقابلہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق نے کہا کہ 'ادب سلسلہ' پبلی کیشن اپنی بے باکی کے سبب روز افزوں عالمی شہرت حاصل کر رہا ہے۔ اعزازی مہمان کی حیثیت سے شریک اسرار گاندھی نے کہا کہ 21 ویں صدی میں بے شمار رسالے نکلے لیکن کچھ رسالے مالی بحران کی وجہ بند ہو گئے اور کچھ مسلکی خلفشار اور آپسی انتشار کے سبب بند ہوتے جارہے ہیں۔ لیکن ادب سلسلہ ایک ایسا رسالہ ہے جسے دیکھنے کے لیے بعد لگا کہ یہ واحد رسالہ ہے جو گروپ بندی سے پاک ہے۔ انھوں نے کہا کہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس رسالہ میں قلمی اور مالی تعاون کر کے محمد سلیم نے اس ادب کے کارواں کو آگے بڑھا دیا ہے۔ اس موقعے پر ساگر ہوشیار پوری نے کہا کہ یہ بہت معیاری اور 300 پیج کا ضخیم رسالہ ہے اور اس رسالہ میں ہر قسم کے رنگ برنگے پھول ہیں اور مذہبی منافرت سے پاک ہے۔ رسالہ کے مدیر محمد سلیم علیگ نے کہا کہ ادب سلسلہ رسالہ جب شائع کرنے کی جب بات سامنے آئی تو سب سے پہلا سوال میرے ذہن میں آیا کہ آخر ہندوستان سے نکلنے والے اتنے زیادہ رسالوں کے درمیان ایک اور رسالہ کا اضافہ کیوں؟ لہٰذا میں ایک ایسا رسالہ نکالنا چاہتا تھا جو اردو ادب کے ساتھ اکیسوی صدی کی سیاسی، سماجی و ثقافت کی بھی ترجمانی کر سکے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 13 جولائی 2016

لفظوں کا لہو

پٹنہ: سلمان عبدالصمد کے ناول 'لفظوں کا لہو' کی رسم رونمائی اتوار کو یہاں انجمن ترقی اردو کے سمینار ہال میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر صفدر امام قادری، ڈاکٹر مشتاق احمد، شہاب الدین احمد اور عبدالقیوم انصاری کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر صفدر امام قادری نے اختصار کے ساتھ ناول اور ناول نگار کا تعارف پیش کیا۔ واضح رہے کہ ناول 'لفظوں کا لہو' میں رشتوں کی ٹوٹی بکھرتی ڈور کو جوڑنے کی فنکارانہ کوشش نظر آتی ہے۔ سماج کے بے شمار مسائل اور سوتنوں کے نفسیاتی تناؤ کے ساتھ ساتھ جمہوری نظام کی کمزور ہوتی قدروں کو سامنے رکھتے ہوئے انتہائی وسیع کینوس پر اس ناول کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صحافت اور صحافیوں کے حالات کو مس کرنے والے اس ناول میں فلسفیانہ اساس کی بنیاد پر بہت کچھ کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان و بیان اور فنی نزاکتوں پر توجہ دیتے ہوئے سلمان عبدالصمد نے بڑی عمدگی سے اس ناول کو پیش کیا ہے۔ سلمان عبدالصمد جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ریسرچ کے طالب علم ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جولائی 2015

فراز شناسی

سولاپور: ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی فاؤنڈیشن سولاپور کے زیر اہتمام سہ ماہی 'اسباق' پونہ کے مدیر معروف شاعر و ناقد جناب نذیر فتح پوری کی تحریر کردہ کتاب پروفیسر عبدالقادر

غیاث الدین فاروقی کی فراز شناسی کی رسم رونمائی 14 جولائی کو خادمانِ اردو فورم سولاپور کے صدر جناب وقار احمد شیخ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جناب وقار احمد شیخ کے بنگلے پر منعقدہ اس تقریب کے صدارت معروف شاعر ایڈوکیٹ عبدالرشید ارشد سولاپوری نے کی۔ وقار شیخ نے کہا کہ نذیر فتح پوری معتبر شاعر و قلم کار ہیں۔ ان کا خلوص و عرق ریزی اس کتاب سے صاف نظر آتی ہے۔ صدارتی خطبے میں ارشد سولاپوری نے کہا کہ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی معروف افسانہ نگار و محقق ہیں جو فی الحال نیویارک میں مقیم ہیں۔ نظامت اور اظہار تشکر سلطان اختر نے ادا کیا۔

ڈاک سے: سلطان اختر، ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی فاؤنڈیشن، سولاپور، 14 جولائی 2016

گیت بھی تو غزل بھی تو

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام سینٹ روز پبلک اسکول گڑھی پیر خاں ٹھاکر گنج میں صوفی خانوادے کے چشم و چراغ و دبستان رامپور کے خوش اسلوب شاعر سعید رضا القادر المتخلص رامش رامپوری کے دو شعری مجموعۂ کلام 'گیت بھی تو غزل بھی تو' اور 'سورج کے سائے' کی تقریب اجرا انجام پائی۔ خانقاہ شاہ عبدالرحمٰن کے سجادہ نشیں سید اظہار علی کی سرپرستی میں ہونے والی تقریب کی صدارت لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے کی جبکہ نظامت کے فرائض معروف شاعر شکیل گیاوی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 1 اگست 2016

دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ: ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی وصحافتی خدمات کے حوالے سے

دربھنگہ: معروف ادیب ڈاکٹر سرور کریم (صدر شعبۂ اردو، آر این اے آر کالج، سمستی پور) کی تحقیقی وتنقیدی کتاب 'دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ: ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی وصحافتی

خدمات کے حوالے سے' کی رسمِ رونمائی پی جی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ میں شعبہ کے سربراہ پروفیسر انیس صدری کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ "سرور کریم کی تحریر جامع ہوتی ہے اور انھوں نے موضوع کا حق ادا کیا۔ دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ اور ڈاکٹر امام اعظم کے حوالے سے یہ کتاب اَپ ٹو ڈیٹ ہے۔ ڈاکٹر سرور کریم اور ڈاکٹر امام اعظم دونوں کو مبارک باد۔" پروفیسر رئیس انور نے کہا کہ "سرور کریم نئی نسل کے معتبر ادیب اور ناقد ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم جیسی ادبی شخصیت اور ان کے کارناموں کو بنیاد بنا کر جیسی کتاب سرور کریم نے اردو کو دی اس کی مثال کم کم ملتی ہے۔ 396 صفحات پر مشتمل یہ کتاب دربھنگہ کے ادبی منظر نامے کو بھی پیش کرتی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' پٹنہ، 26 جولائی 2016

کچھ محفل خوباں کی

دربھنگہ: قطر کی قدیم ترین ادبی انجمن 'بزم اردو قطر' کے زیر اہتمام نوجوان ادیب وصحافی سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز کے مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر کے اولین مجموعۂ کلام 'کچھ محفل خوباں کی' کی رسم اجرا 'دکن ہال' دوحہ میں ادا کی گئی۔ تقریب کی صدارت محمد ممتاز راشد لاہوری نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض احمد اشفاق اور محمد اطہر اعظمی نے کی۔ تقریب رسم اجرا میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے سید فہیم الدین اور مہمان اعزازی کی حیثیت سے جمال احمد نے شرکت کی۔ اس موقعے پر شرکائے محفل نے ڈاکٹر منصور خوشتر کی علمی وادبی خدمات کی ستائش کی اور ان کے مجموعہ کلام کے حوالے سے گفتگو کی۔ بزم کے جنرل سکریٹری احمد اشفاق نے ڈاکٹر منصور خوشتر کے کلام پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ منصور خوشتر نہ صرف ایک فعال صحافی ہیں بلکہ وہ ایک بہترین شاعر بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں روایت اور

ڈاکٹر ودیا جین ایمان کے شعری مجموعہ 'روح ایمان' کا اجرا

مولانا مفتی محمد علی قاضی کی تصنیف 'تصوف کی روشنی میں عالمی تشدد کا انسداد ممکن ہے' کا اجرا

جدت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ انجینئر قمر جمال ہاشمی نے کہا کہ منصوری خوشتر کی غزلوں میں سیاسی وسماجی شعور کے ساتھ ساتھ بھرپور تغزل بھی ہے۔ صدر محفل ممتاز راشد نے بھی کتاب کی اشاعت پر ڈاکٹر منصور خوشتر کو مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ وہ اسی طرح پوری فعالیت کے ساتھ زبان وادب کی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ امجد علی سرور کے اظہار تشکر کے ساتھ یہ خوبصورت تقریب اختتام کو پہنچی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 27 جولائی 2016

تکلف برطرف

ممبئی: معروف قلم کار سالک دھامپوری کی کتاب 'تکلف برطرف' کا روزنامہ 'اردو ٹائمز' ممبئی کے دفتر میں شام 5 بجے چیف ایڈیٹر جناب سعید حمید کی صدارت میں اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر جناب سعید حمید نے سالک دھامپوری کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ سالک دھامپوری کا اردو ٹائمز سے پرانا رشتہ ہے۔ انھوں نے ابتدا میں بچوں کی کہانیاں لکھنا شروع کی تھیں جو کہ روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی کے بچوں کے کالم میں پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔ سالک دھامپوری پورے ملک میں اردو اور بعض ہندی اخبارات پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ بڑی بے باکی سے ملکی وملی مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں۔ اس بے باکی اور حق گوئی کی پاداش میں وہ لمبے عرصے تک پس زنداں بھی رہے۔ اس موقعے پر اے پی فلم پروڈکشن کے مالک اور معروف قلم کار آصف پلاسٹک والا نے کہا کہ سالک دھامپوری کی اس کتاب میں سلگتے ہوئے مسائل پر بڑی بے باکی سے بات کی گئی ہے۔ اس سادہ سی مگر پروقار تقریب میں سال دھامپوری کے دوست و احباب، جن میں حاجی شمیم احمد، شفیق احمد، معروف شاعر و مصور محمد حسین کاوش، محمد ناشاد، رفیق احمد منصوری، ظہیر احمد اور آصف پلاسٹک والا کے علاوہ اردو ٹائمز ممبئی کے اسٹاف کی کافی تعداد موجود تھی۔ پروگرام کے اختتام پر اردو ٹائمز کے مالک محمد سہیل صاحب نے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 جولائی 2016

روح ایمان

نئی دھلی: جین فارپیس کی جانب سے ڈاکٹر دویا جین ایمان کے شعری مجموعہ 'روح ایمان' کی رسم رونمائی اور شعری نشست کی تقریب کا انعقاد غالب اکادمی حضرت نظام الدین اولیا میں کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب نے انجام دیے۔ کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر دویا جین ایمان نے کہا کہ یہ میرا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں غزلیں شامل ہیں، میری شاعری میں عورتوں کے جذبات اور موجودہ دور میں پھیل رہی نفرت کی عکاسی ملتی ہے۔ مجھے بچپن سے ہی میر وغالب کی شاعری پڑھنے کا شوق تھا جس کا نتیجہ ہے کہ میں نے شاعری شروع کی اور آج یہ میرا پہلا شعری مجموعہ ہندی اور اردو میں شائع ہوا ہے۔ عرشیہ پبلی کیشنز کے اظہار ندیم نے بھی اپنے خیالات اظہار کیا۔ اس موقعے پر بحیثیت شاعر اور مقرر فرحت احساس، نعمان شوق، شکیل جمالی، راشد جمال فاروقی، شفیع ایوب، خورشید اکرم، عادل حیات، سرورالہدیٰ، ہادی سرمدی وغیرہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 جولائی 2016

خوشبو کا سفر

دبئی: متحدہ عرب امارات کے معروف شہر دبئی میں ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی کی نئی کتاب 'خوشبو کا سفر' کا رسم اجرا، ملک و بیرون ملک کے متعدد علما و دانشوران کے ہاتھوں عمل میں آیا، خوشبو کا سفر شیر میسور ٹیپو سلطان کے آبائی وطن میسور کے سفر پر بنی ہے۔ سال 2015 میں مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی کی قیادت میں اکابر علماء کے ایک گروپ نے وہاں کا سفر کیا تھا جس کی روداد خوشبو کے سفر کے نام سے مرتب کی گئی ہے۔ اس موقعے پر اپنے صدارتی خطاب میں مولانا سعید الرحمٰن اعظمی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلما نے کہا کہ سفرنامہ کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس صنف سے صرف سفر کی داستان معلوم نہیں ہوتی ہے بلکہ ایک تاریخی معلومات فراہم ہوتی ہے۔ مورخین نے کہا کہ شیر میسور کے بغیر ہندوستان کی آزادی کی تاریخ نامکمل ہے۔ مولانا شاہد سہارنپوری نے کہا کہ شیر میسور ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہاں کا سفر یادگار اور بے مثال تھی، مفتی عثمانی نے اس سفر کی روداد کو مرتب کروا کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی نے اپنے خطاب میں کہا کہ شیر میسور ٹیپو سلطان ہندوستان کی تاریخ کے نمایاں باب ہیں، ان کی زندگی سے وابستہ ہر شئے عظیم اور تاریخی ہے۔ وہاں کا سفر بہت ہی خوش گوار تھا اس لیے اس کتاب کا نام خوشبو کا سفر رکھا گیا ہے۔ مفتی صاحب نے اس موقعے پر تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ جبکہ نظامت شمس تبریز قاسمی چیف ایڈیٹر ملت ٹائمز نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 جولائی 2016

تصوف کی روشنی میں عالمی تشدد کا انسداد ممکن ہے

نئی دھلی: حضرت محمدؐ کی محبت اخلاق رواداری اور حسن سلوک سے تصوف بنتا ہے۔ شریعت اور طریقت پر چلنے کا نام تصوف ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر مفتی محمد مکرم احمد نے اسلامی اسکالر مولانا مفتی محمد علی قاضی کی تصنیف کردہ 'تصوف کی روشنی میں عالمی تشدد کا انسداد ممکن ہے' کا اجرا کرتے ہوئے مسجد فتح پوری میں کیا۔ اس موقعے پر آل انڈیا مرکزی کونسل امام مساجد کے قومی صدر حافظ و قاری محمد علی قادری، سابق چیئرمین کرناٹک اقلیتی کمیشن سید سیف اللہ، ڈاکٹر مفتی نسیم اشرفی بھی بطور مہمان خاص موجود تھے۔ مفتی مکرم نے مزید کہا کہ مذہب اسلام میں کہیں بھی تشدد نہیں ہے۔ حضرت محمدؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے اس کے بعد بھی مذہب اسلام کی روشنی میں دیکھیں گے تو مذہب اسلام کے ماننے والوں کا تشدد یا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مخلوق خدا سے محبت ا ور اللہ کی اطاعت کا نام ہی مذہب اسلام ہے۔ ظلم زبردستی، تشدد یہاں تک کہ مذہب اسلام میں کسی کو گھور کر بھی دیکھنا منع ہے تو دہشت گردی کا تعلق کیسے ہوسکتا ہے؟

مفتی محمد علی قاضی نے کہا کہ تصوف کی روشنی میں عالمی تشدد کا انسداد ممکن ہے۔ اس موقعے پر سید خالد احمد، مولانا انس احمد و دیگر لوگ موجود تھے۔ سید سیف اللہ نے کہا کہ آج نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے لیے تشدد ایک چیلنج بنا ہوا ہے اور اس کا حل صرف اور صرف پیار محبت اور حسن سلوک سے تدارک کیا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 جولائی 2016

تین کتابوں کا اجرا

مئو: مئو شہر کے محلّہ شاہی کٹرہ واقع ایم ایم اعظمی دارالعلوم اسکول میں قلمکار ویلفیئر سوسائٹی کی جانب سے ایک تقریب 'رسم اجرا' کا انعقاد کیا گیا جس میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی کتاب 'راجا رام موہن رائے اور ان کے تحریکی و تعلیمی کارنامے' اور فیضان آگہی (شعری مجموعہ) محمد زبیر کی کتاب 'اثر انصاری حیات اور شاعری' کا رسم اجرا کی رونمائی عمل میں آئی۔ اس دوران مختلف تعلیمی وادبی شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی ڈاکٹر منور انجم سابق استاذ وصدر شعبہ اردو ڈی سی ایس کے پی جی کالج، مئو نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے راجا رام موہن رائے اور ان کے تحریکی کارناموں کو ایک کتابی شکل دے کر بہت ہی بڑا کام کیا ہے جس سے لوگ فیضیاب ہوں گے۔

وہیں دوسرے مصنف محمد زبیر کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جو مئو شہر کے معروف شاعر کے تعلق سے 'اثر انصاری حیات اور شاعری' تخلیق کرکے ادبی دنیا سے انھیں متعارف کرنے کا بہترین کام کیا ہے۔ مہمان اعزازی پروفیسر مسعود عالم فلاحی اور اسسٹنٹ پروفیسر اعظم انصاری نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ تقریب کے صدر سابق چیئرمین محمد طیب پالکی نے کہا کہ مئو کے قلمکاروں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ مئو کی مکمل تاریخ کو کتابی شکل دے کر لوگوں تک پہنچائیں تاکہ لوگ مئو کی علمی، ادبی، تہذیبی و ثقافتی خوبیوں سے واقف ہوسکیں۔ تقریب کا آغاز قومی ترانہ سے کیا گیا جب کہ استقبالیہ اسلم ایڈوکیٹ نے پیش کیا۔ نظامت کے فرائض کو منظور الحق ناظر نے بحسن خوبی انجام دیا۔ اس تقریب میں ڈاکٹر ثوبان سعید، ڈاکٹر جے پرکاش (دھوم کیتو) نے بھی اپنے اپنے تاثرات پیش کیے۔

پریس ریلیز: روح اللہ صدیقی، مئو، 14 جولائی 2016

رات کے بعد رات کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر بریگیڈیئر سید احمد علی نے کہا ہے کہ اردو کے زوال کے لیے حکومتوں کو ذمے دار قرار دینے سے زیادہ ضروری ہے کہ

اردو طبقہ اردو کے فروغ کے تعلق سے خود بے دار ہو جو وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک ہم نئی نسلوں کو اردو زبان سے نہیں جوڑیں گے تب تک اردو کا فروغ ممکن نہیں۔ وہ آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے این آر ایس سی کلب میں حرف زار لٹریری سوسائٹی، علی گڑھ کے زیر اہتمام منعقدہ ممتاز شاعر سنجے مصرا شوق کے اولین مجموعۂ کلام 'رات کے بعد رات' کی عظیم الشان تقریب رسم اجرا سے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ سنجے مصرا شوق جیسے دیوانے جب تک موجود ہیں اردو کو زوال نہیں آسکتا۔ حرف زار لٹریری سوسائٹی کے سرپرست اعلیٰ اور ماہنامہ 'تہذیب الاخلاق' کے مدیر پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ سنجے مصرا شوق سچائیوں کے شاعر ہیں اور تصورات کی دنیا میں نہ رہ کر سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سنجے کی شاعری دیرپا ہے اور سماج کے ہر طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر شرکا نے اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 22 جولائی 2016

وفیات:

مبارک بیگم

ممبئی: اپنے زمانے میں اپنی آواز سے لاکھوں کو دیوانہ بنانے والی مبارک بیگم 19 جولائی کو انتقال کرگئیں۔

80 سال کی مبارک بیگم نے 1950 سے 1970 کی دہائی کے درمیان بالی ووڈ کے لیے سیکڑوں نغموں اور غزلوں کو اپنی آواز دی تھی، جس کے لیے انھیں یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے نغمے 'کبھی تنہائیوں میں یوں ہماری یاد آئے گی' جیسے سدابہار نغمات کو اپنی آواز دینے والی مبارک نے ایس ڈی برمن، شنکر جے کشن جیسے نامور موسیقاروں کے ساتھ کام کیا۔ مبارک بیگم نے جو نغمے گائے ان میں سے 10 سپرہٹ ہیں۔ 1963 میں فلم 'ہمراہی' کا نغمہ 'مجھ کو اپنے گلے لگا لو، اے میرے ہمراہی...'، 1961 میں 'ہماری یاد ئے گی' میں 'کبھی تنہائی میں یوں ہماری یاد آئے گی...' وغیرہ نغمے قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 جولائی 2016

سید حیدر رضا

نئی دهلی: ملک کے مشہور مصور سید حیدر رضا کا 24 جولائی 2016 کو انتقال ہوگیا، وہ 94 برس کے تھے۔ رضا پچھلے دو مہینے سے ایک پرائیویٹ اسپتال میں زیر علاج تھے۔ انھوں نے 24 جولائی کی صبح آخری سانس لی۔ ان کی

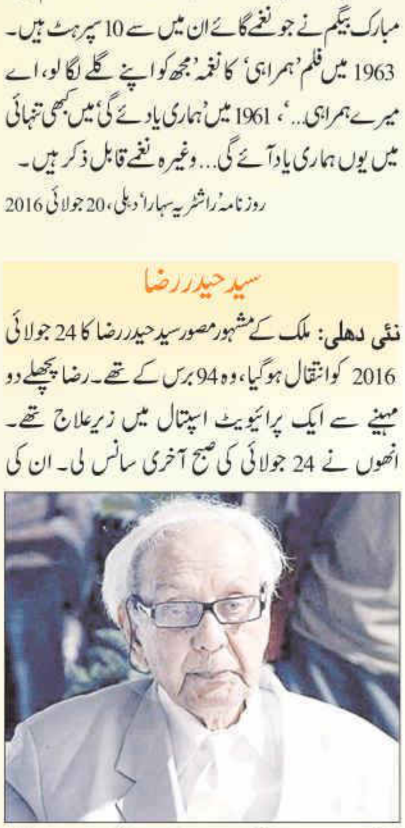

آخری رسومات ان کی وصیت کے مطابق مدھیہ پردیش کے مقام مانڈلا میں ادا کی گئی۔ کانگریس کی صدر سونیا گاندھی نے مسٹر رضا کے انتقال کو ماڈرن آرٹ کے لیے ملک کا سب سے بڑا نقصان بتایا۔ انھوں نے کہا کہ وہ ماڈرن آرٹ کی ایک بڑی شخصیت تھے اور ان کے شاہکاروں کے لیے انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ پدم بھوشن مرحوم رضا مشہور مصور مقبول فدا حسین کے ہم عصر تھے اور 1950 میں فرانس میں جا کر بس گئے تھے لیکن کچھ سال پہلے وہ وطن واپس لوٹ آئے تھے اور یہاں دارالحکومت میں مقیم ہوگئے تھے۔ سید حیدر رضا 22 فروری 1922 کو مدھیہ پردیش کے مانڈلا ضلع کے مقام بابریہ میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ممبئی پروگریسیو آرٹسٹ گروپ کے بانیوں میں سے ایک ہیں اور ان کا شمار بین الاقوامی معیار کے مصوروں میں ہوتا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 جولائی 2016

مہاشویتا دیوی

کولکاتا: گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ مصنفہ مہاشویتا دیوی کا 28 جولائی 2016 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 90 سال

تھی۔ ادب و ثقافت کے ساتھ کے ساتھ وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی سماجی ناہمواریوں و ناانصافی، ذاتی تفریق اور قبائلیوں کے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے والی مہاشویتا دیوی 1926 میں متحدہ ہندوستان ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئیں جو پورا کا پورا ادب و ثقافت و کلچر سے وابستہ تھا۔ مہا شویتا دیوی کے والد مانس کھٹک مشہور شاعر اور ناول نگار تھے۔ مہا شویتا دیوی کے والدہ دھریتری دیوی بھی مصنفہ تھیں اور سماجی کارکن تھیں۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد وہ ہندوستان کے زیرانتظام بنگال آگئیں اور وشو بھارتی یونیورسٹی شانتی نکیتن سے وابستہ ہوگئیں۔ بی اے انگلش اور ایم اے انگلش کلکتہ یونیورسٹی سے مکمل کیا۔ اس کے بعد ان کی شادی مشہور ڈرامہ نگار بیجون بھٹاچاریہ سے ہوئی۔ 1964 میں کلکتہ یونیورسٹی سے منظور شدہ بیجوگرتھ کالج میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ اسی درمیان انھوں نے لکھنا شروع کیا اور ان کا پسندیدہ موضوع قبائلی اور خواتین کی حالت اور دلت تھا۔ ان کی تحریروں میں سماجی ناہمواریاں، ناانصافیاں، ذات پرمبنی نظام کے خلاف سخت تنقید ہوتی تھی۔ وہ قبائلیوں کے حقوق کے لیے بھی بھرپور وکالت کرتی تھیں۔ 2006 میں فرینکفرٹ کتاب میلے کے افتتاحی تقریب میں انھوں نے یادگار خطبہ دیا جس میں انھوں نے ہندوستان کی خوبصورتی، ادبی ورثہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مہاشویتا دیوی نے دو درجن سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن کا مختلف زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں کوئین آف جھانسی، اڑان پر ادھیکار، اگنی گربھا وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی کئی کہانیوں پر فلم بھی بن چکی ہیں۔ انھیں کئی سول اعزاز سے نوازا گیا ہے جس میں ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ، گیان پیٹھ ایوارڈ، پدم بھوشن سمیت درجنوں ایوارڈ شامل ہیں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 29 جولائی 2016

نیلا بھ اشک

نئی دھلی: ہندی کے معروف شاعر اور بی بی سی کے سابق صحافی نیلا بھ اشک کا 22 جولائی کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 72 سال تھی۔ نیلا بھ اشک ہندی کے مشہور ادیب اپندر ناتھ اشک کے بیٹے تھے اور گذشتہ کئی برسوں سے دہلی میں رہ کر فری لانسنگ کررہے تھے۔ وہ ان دنوں نیشنل اسکول آف ڈراما کی میگزین رنگ پرسنگ کی ادارت بھی کررہے تھے۔ 16 اگست 1945 کو ممبئی میں پیدا ہوئے نیلا بھ اشک نے الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور لندن میں چار سال تک بی بی سی میں پروڈیوسر کے طور پر کام کرنے کے بعد ہندوستان لوٹ آئے۔ ان کی نو کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ پسماندگان میں ان کی تیسری بیوی بھومیکا دویدی ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 جولائی 2016

نظر مظفر نگری

کھتولی: بزرگ شاعر نظر مظفرنگری کا 30 جولائی 2016 کو حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ وہ 75 برس کے تھے۔ شعری محفلوں اور مشاعروں کو جلا بخشنے والے محلّہ ملھوپورہ مظفرنگر کے رہنے والے نظر مرحوم نہایت ملنسار، خوش اخلاق اور گوناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کے انتقال سے ادبی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا ناممکن ہے۔ مرحوم کے انتقال کی خبر سے مظفرنگر ضلع کے ادبی حلقوں میں غم و اندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ شہر کے قبرستان میں ہوئی تدفین میں کثیر تعداد میں ادبا، شعرا اور ملی و سماجی شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 جولائی 2016

عزیز نجیب آبادی

نجیب آباد: نجیب آباد کے معروف طنز و مزاح کے استاد شاعر عزیز نجیب آبادی کا 19 جولائی 2016 کو انتقال ہوگیا۔ وہ کافی وقت سے علیل چل رہے تھے۔ وہ 72 برس کے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند نیک سیرت نہایت ہی سادہ مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر شہر کے ادیبوں اور شعرا میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ محلّہ حویلی تلہ ساکن عزیز نجیب آبادی کا شمار استاد شعرا میں ہوتا تھا۔ عزیز نجیب آبادی کے تین مزاحیہ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ہیں۔ عزیز نجیب آبادی نے اپنے مزاحیہ کلام کے ذریعے اپنی ایک شناخت بنائی۔ انھوں نے ہر موضوع کو اپنا عنوان بنایا ہے۔ ان کے پاس روتے کو ہنسانے کا فن موجود تھا۔ انھوں نے 1965 سے اپنی مزاحیہ شاعری کا آغاز کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 جولائی 2016

محمد عرفان صدیقی

نگینه: شاعر، ادیب اور نقاد محمد عرفان صدیقی کے انتقال 7 جولائی 2016 کو دہلی میں ہوگیا۔ وہ گذشتہ کئی ماہ سے بلڈ کینسر کے مرض میں مبتلا تھے اور دہلی میں ہی زیرعلاج تھے۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے بھانجے اور مرکزی وزیر رہے حافظ محمد ابراہیم کے بھتیجے، محمد عرفان صدیقی کی پیدائش محلّہ قاضی سرائے نگینہ میں 28 جون 1938 میں جید عالم محمد اسحاق کے یہاں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم نگینہ کے مدارس اور پھر دہلی سے بی اے آنرس اور ایم اے ادبیات انگریزی میں کرنے کے بعد اسلامیہ کالج بریلی میں انگریزی کے لکچرر کی تقرری ہوئی۔ 1998 میں ریٹائر ہونے کے بعد نگینہ میں اپنا آبائی مکان آباد کیا۔ ہندی، اردو، فارسی اور انگریزی زبان پر یکساں دسترس رکھنے والے محمد عرفان کی طرز غالب، جوش ملیح آبادی کا نفسیاتی ولفظیاتی مطالعہ، نقطۂ نظر، صدائے جبریل، دسترس، احتساب، اشتی یا رسول اللہ اور دو انگریزی میں تصانیف ہیں۔ بہار اور یوپی اردو اکادمی نے ان کی کتابوں پر اعزاز سے نوازا۔ آل انڈیا ریڈیو، دوردرشن اور اودھ پنچ چینل پر اکثر ان کی گفتگو نشر ہوتی رہی ہے۔ اردو کے تمام بڑے ادیبوں نے ان پر قلم چلا کر ان کے ادب اور شاعری کو سند دی ہے۔ محمد عرفان بہترین مقرر بھی تھے اور ہر محفل میں اپنی صلاحیت کے جوہر دکھتے تھے۔ دہلی میں حضرت نظام الدین کے پنج پیران قبرستان میں ان کی تدفین کی گئی۔

پریس ریلیز: شیخ نگینوی، نگینہ 13 جولائی 2016

احمد جویل

قاهره: نوبل انعام یافتہ مصری-امریکی ماہر کیمیات احمد جویل کا امریکہ میں انتقال ہوگیا۔ ان کے ترجمان شیرف

فوڈ نے یہ اطلاع دی۔ ان کے انتقال کی وجہ ابھی تک واضح نہیں ہوپائی ہے۔ وہ 70 سال کے تھے۔ امریکی صدر

براک اوباما کے سائنس اور ٹکنالوجی مشیر مسٹر احمد جویل مغربی ایشیا میں پہلے مریکی سائنسی سفیر تھے۔ اس کے علاوہ مسٹر جویل کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کے بھی رکن رہے۔ مسٹر جویل کی پیدائش قاہرہ سے 160 کلومیٹر شمال مغرب میں واقع قصبہ دمنہور میں ہوا تھا۔ انھوں نے اسکندریہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی جس کے بعد آگے کی تعلیم کے لیے وہ امریکہ چلے گئے جہاں فلاڈلفیا میں پنسلوانیا یونیورسٹی سے انھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1976 میں وہ کیلیفورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کے فیکلٹی میں شامل ہوئے جہاں وہ کیمسٹری اور فزکس کے پروفیسر بنے۔ 1982 میں انھوں نے امریکہ کی شہریت قبول کرلی۔ 1999 میں مسٹر جویل کو کیمسٹری کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ مسٹر جویل نے اپنی زندگی میں تقریباً 600 سے زائد سائنسی مضامین اور 16 کتابیں لکھیں۔ اپریل 2009 میں صدر اوباما نے مسٹر جویل کی کو سائنس اور ٹکنالوجی کونسل کی مشاورتی کمیٹی میں رکن مقرر کیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 اگست 2016

خراج عقیدت:

پریم چند کو خراجِ عقیدت پیش کرتا گوگل ڈوڈل

نئی دھلی: اردو- ہندی کے مشہور ادیب منشی پریم چند کو

ان کی 136 ویں سالگرہ پر گوگل نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ گوگل نے پریم چند کا ڈوڈل بنا کر انھیں یاد کیا ہے۔ اس ڈوڈل میں دھوتی کرتا پہنے پریم چند کو ایک قلم لے کر کچھ لکھتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس تصویر میں ان کے گاؤں میں بنے گھر کو بھی دکھایا گیا ہے جس کے ساتھ بیلوں کی ایک جوڑی کو بھی دکھایا گیا ہے، جس سے ان کی مشہور کہانی 'دو بیلوں کی کہانی' کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ اتر پردیش کے وارانسی سے چار کلومیٹر دور لمہی گاؤں میں 31 جولائی 1880 کو پیدا ہونے والے منشی پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا اور 8 اکتوبر 1936 کو 56 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ انھوں نے تین سو سے زائد کہانیاں نیز اردو اور ہندی میں بہت سے ناول لکھے تھے۔ اس موقعے پر مشہور نغمہ نگار گلزار نے پریم چند کے ناول 'گئودان' اور 'نرملا' کو اسکرپٹ کی شکل میں پیش کرنے کے بعد کہا کہ پریم چند کی کہانیاں آج بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہیں جتنی اس دور میں تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 اگست 2016

سابق صدر عبدالکلام کی پہلی برسی پر خراجِ عقیدت

رامیشورم / پڈوچیری: ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی پہلی برسی کے موقعے پر رامیشور میں ان کے قبرستان پیئی کارنبو میں 'ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نیشنل میموریل' کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ وزیر دفاع منوہر پاریکر اور مرکزی

شہری ترقی کے وزیر ونکیا نائیڈو نے یادگار کی بنیاد رکھی۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر پی رادھا کرشنن اور سبھاش رام راؤ بھامرے، وزیر مملکت محترمہ نیلوفر اور ایم منی کندن ڈاکٹر کلام کے 100 سالہ بڑے بھائی اے پی جے محمد ایم میرن مرئی کائر اور ان کے لواحقین، دفاعی تحقیق اور ترقی کی تنظیم (ڈی آر ڈی او) اور ہندوستانی خلائی تحقیق تنظیم (اسرو) کے سینئر سائنسدانوں کے علاوہ کئی سینئر افسر اور سیکڑوں لوگ موجود تھے۔ قبل ازیں مسٹر پاریکر اور مسٹر نائیڈو نے ڈاکٹر کلام کے قبرستان کے دروازے پر کانسہ سے بنائی گئی سات فٹ اونچی مورتی کی نقاب کشائی کی۔ انھوں نے یادگار کے تھری ڈی ماڈل کی بھی نقاب کشائی کی۔ یادگار کی تعمیر ڈی آر ڈی او کی طرف سے کی جارہی ہے۔ واضح رہے کہ گذشتہ سال ملک کے 11 ویں صدر ڈاکٹر کلام کا آئی آئی ایم۔ شیلانگ میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا تھا۔ دوسری جانب سابق صدر اے پی جے عبدالکلام کی پہلی برسی پر انھیں پڈوچیری میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ پڈوچیری کے عوامی بہبود کے وزیر ایم کنڈاسوامی، ڈپٹی اسمبلی اسپیکر شوکونجوتو اور دیگر رہنماؤں نے ڈاکٹر کلام کی تصویر پر گلہائے عقیدت پیش کیے۔ یہاں کے گاندھی اسکوائر میں کلام مومنٹ کے نام سے ایک پروگرام کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر مسٹر کنڈاسوامی نے اسکولی بچوں کو پودے تقسیم کیے۔ قبل ازیں تقریباً 200 طلبہ نے اپنے ہاتھ میں پودے اور موم بتی لے کر سکریٹری سے گاندھی اسکوائر تک جلوس نکال کر ڈاکٹر کلام کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 جولائی 2016

ریسرچ اسکالر محمد مشفق کی وفات پر تعزیتی نشست

نئی دھلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ کے

ریسرچ اسکالر محمد مشفق کی ناگہانی موت پر رنج وغم کے اظہار کے لیے تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں شعبہ کے اساتذہ نے ہونہار طالب علم کی رحلت کو شعبہ کے لیے ایک بڑا خسارہ قرار دیا۔ محمد مشفق ایک سنجیدہ اور باصلاحیت طالب علم تھے۔ انھوں نے حال ہی میں پی ایچ ڈی مکمل کی تھی۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا نے ان کی وفات کو شعبے کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 جولائی 2016

ساجد رشید کو خراجِ عقیدت

11 جولائی 2016 کو ساجد رشید (مرحوم) کی پانچویں برسی کے موقع پر 'خبرِ مشن' ممبئی نے بطورِ خراجِ عقیدت بزرگ شاعر محترم ضمیر کاظمی کے زیر صدارت شعری اور افسانے کی نشست منعقد کی۔ جناب کمال جائسی اور جناب شمیم

عباس مہمانانِ خصوصی تھے اور نظامت کے فرائض اشتیاق سعید نے انجام دیے۔ اس موقعے پر ساجد رشید کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اشعر نجمی نے کہا کہ ساجد رشید میرا آئینہ تھا جس کو دیکھ کر میں بنتا سنورتا تھا۔ افسوس کہ وہ آئینہ ٹوٹ گیا۔ اس موقعے پر انور مرزا، عبدالباری ایم کے نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ اشتیاق سعید نے کہا کہ میں آج ادب میں ساجد رشید ہی کی بدولت ہوں۔ وہ واحد شخص تھے جو گاہے گاہے میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یہی سبب ہے جو آج اُن کی وفات کے بعد بھی میں اُنھیں یاد کرتا ہوں۔

پریس ریلیز: اشتیاق سعید، ممبئی، 13 جولائی 2016

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکن میں اردو

مصنف: نصیر الدین ہاشمی
صفحات: 945
قیمت: -/325 روپے

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

مصنف: سید احتشام حسین
صفحات: 341
قیمت: -/100 روپے

اکبر سے اورنگ زیب تک

مصنف: ڈبلیو ایچ مولینڈ
مترجم: جمال محمد صدیقی
صفحات: 420
قیمت: -/185 روپے

قدیم علم الامراض

مصنف: ملک وامق امین
صفحات: 131
قیمت: -/40 روپے

رہبر اخبار نویسی

مصنف: سید اقبال قادری
صفحات: 751
قیمت: -/260 روپے

حالی

مصنف: صالحہ عابد حسین
صفحات: 68
قیمت: 20

اصول تعلیم اور عمل تعلیم

مصنف: ڈی ایس گورڈن
مترجم: خلیل الرحمٰن سیفی پریمی
صفحات: 330
قیمت: 155 روپے

میر غلام حسن دہلوی (مونوگراف)

مصنف: قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی
صفحات: 128
قیمت: -/77 روپے

محمد حسین آزاد (مونوگراف)

مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 152
قیمت: -/85 روپے

جگت موہن لال رواں (مونوگراف)

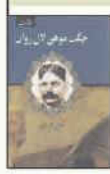

مصنف: صغیر افراہیم
صفحات: 146
قیمت: -/86 روپے

غلام رسول نازکی (مونوگراف)

مصنف: قدوس جاوید
صفحات: 87
قیمت: -/65 روپے

رام لعل: حیات و فن (مونوگراف)

مصنف: مظہر محمود
صفحات: 201
قیمت: 105 روپے

شاد عارفی (مونوگراف)

مصنف: مظفر حنفی
صفحات: 142
قیمت: 85 روپے

شیخ محمد ابراہیم ذوق (مونوگراف)

مصنف: کوثر مظہری
صفحات: 109
قیمت: -/72 روپے

ملا رموزی (مونوگراف)

مصنف: محمد نعمان خاں
صفحات: 128
قیمت: -/80 روپے

آغا حشر کاشمیری (مونوگراف)

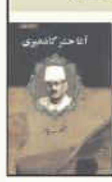

مصنف: یعقوب یاور
صفحات: 132
قیمت: -/81 روپے

تاریخ ادب اُردو (1838 تا 1857) (جلد سیزدہم)

انتخاب: محمد انصار اللہ
صفحات: 618
قیمت: -/259 روپے

تاریخ ادب اُردو (1838 تا 1857) (جلد چہاردہم)

انتخاب: محمد انصار اللہ
صفحات: 505
قیمت: -/215 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, September-2016, Vol.18, Issue:09
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/08/2016**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

قومی اردو کونسل میں جشن آزادی کی جھلکیاں

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025